

چونکا دینے والی خورتاک کہانیاں

ماہنامہ

ڈاکٹر ڈائجسٹ

کراچی

اپریل 2013



شعیب شیرازی

16

ڈاڑی

شاہکار کہانوں کے حاشی لوگوں کے لئے ایک بہت ہی دلربا اور دل موہ لینے والی کہانی

ساجدہ راجا

47

جنتی دنیا

دو ادراکی مخلوق کا راز دینے والی خوفناک اور ڈراؤنی ناقابل یقین..... خونی روداد

راشد نذیر طاہر

81

خوبصورت

ایک ماہر قتل کی گمشدہ اور دلربا ویدہ دہریہ جو کہ پڑھنے والوں کو خوبسٹیں ڈل دیتی

ایس حبیب خان

103

خونی عمل

کیا یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ہر لمحہ کو ہلا دینے اس حقیقت سے پردہ اٹھائی ایک انہونی کہانی

شانسیہ سحر

41

خاموش موت

خودکشی اور مفاد پرستی کی زد پگھلنے لگنے سے کرتی بہت ہی مہربان اور تیراگیز کہانی

اسے وحید

56

رولو کا

دو ادراکی برسرِ راز قتل کا مکمل تہا کی حیرت انگیز اور جادوئی کشمکش ساری آپ کو کھل کر دینا

مدثر بخاری

89

انوکھا کیس

حقیقت و محبت میں سرشار ایک ماہر قتل کی عجیب و غریب اور دلکش روداد ایک شاہکار کہانی

ثاقب بشیر

113

خونی اسپتال

خونناک و دہشت ناک اور دل کو دہلا دینے والی رات کے اندھیرے میں ختم ہونے والی کہانی

ایم اے راحت

122

سنہری تابوت

شاہکار کہانوں کے حاشی لوگوں کے لئے انجمن میں ڈھائی حیرت انگیز اور تیراگیز کہانی

ایس امتیاز احمد

153

راج دلاری

صدیوں پر محیط عجیب و غریب سوچ کا حامل ناقابل فراموش..... دل کو سسکتی کہانی

عبیرہ فاطمہ

177

مہمان

کیا برسرِ پہلے مرے ہوئے لوگوں کی رو میں اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے سرگرداں ہوتی ہیں

ادارہ

209

قوس قزح

قارئین کے پیچھے گئے اشعار جنہیں قارئین بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں.....

علی صبا

146

مسکن

حدود سے تجاوز انسان کے لئے کبھی بھار جان لینا ثابت ہوتا ہے کہانی پڑھ کر خود کیسے

سیماء امیر

153

ناگ منی

خوف کے لہجے میں لپٹی خونی راز کی طرف غور و نظر ذہن پر سسکتی طاری کرتی اور کھلی کہانی

ایم الیاس

184

بلیک ٹائیگر

جنس اور سسٹم سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو درجہ حیرت میں ڈال دیں گے

عمران قریشی

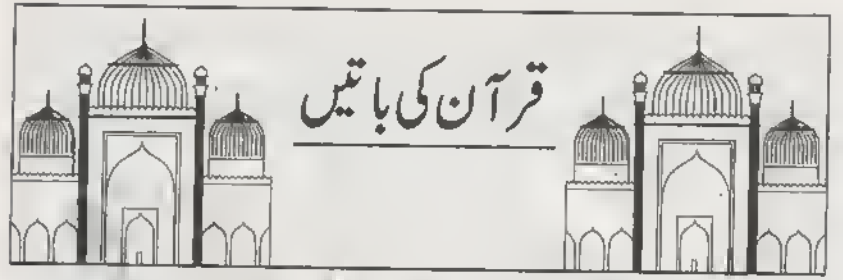
214

ما فوق الفطرت

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی اور جادو، اثر و نفوذ قوت انسان پر بہت لے سکتا ہے

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے نئی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈراما جسٹ نورانی آرکیڈ نیو وارڈ بازار کراچی: 32744391



قرآن کی باتیں

- ☆ بہت سے اہل کتاب اپنے دلی کی جلن سے یہ چاہتے ہیں کہ ایمان لا چکے کے بعد تم کو پھر کافر بنادیں، حالانکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے تو تم معاف کر دو اور درگزر کرو۔ یہاں تک کہ اللہ اپنا دوسرا حکم بھیجے۔ بے شک اللہ ہر بات پر قادر ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 109)
- ☆ کہہ دو کہ اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے دونوں کے درمیان یکساں تسلیم کی گئی ہے، اس کی طرف آؤ وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں۔ اور ہم میں کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے۔ اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو ان سے کہہ دو کہ تم گواہ ہو کہ ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔ اے اہل کتاب تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ تورات اور انجیل ان کے بعد اتری ہیں اور وہ پہلے ہو چکے تو کیا تم عقل نہیں رکھتے میں کچھ لوگ حکم اللہ پر قائم بھی ہیں جو رات کے وقت اللہ کی آیتیں پڑھتے اور اس کے آگے سجدے کرتے ہیں۔ اور اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے اور اپنے کام کرنے کو کہتے اور بری باتوں سے منع کرتے اور نیکیوں پر لپکتے ہیں اور یہی لوگ نیکوکار ہیں۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 113 سے 114)
- ☆ اے کتاب والوں قبل اس کے کہ ہم لوگوں کے منہوں کو بکاؤ ذکران کی پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا ان پر اس طرح لعنت کریں جس طرح پہلے والوں پر کی تھی۔ ہماری نازل فرمائی ہوئی کتاب پر جو تمہاری کتاب کی بھی تصدیق کرتی ہے ایمان لے آؤ۔ اور اللہ نے جو حکم فرمایا سو سمجھ لو کہ وہ چکا۔ (سورۃ نساء 4 آیت 47)
- ☆ کہہ دو کہ اے اہل کتاب جب تک تم تورات اور انجیل کو اور جو اور کتابیں تمہارے رب کی طرف سے تم لوگوں پر نازل ہوئیں، ان کو قائم نہ رکھو گے کچھ بھی راہ پر نہیں ہو سکتے اور یہ قرآن جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے اس سے ان میں سے اکثر سرکشی اور کفر اور بڑھے گا تو تم قوم کفار پر افسوس نہ کرو۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 68)
- ☆ اور تم اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کئے رہو تم تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو اور جب اٹھا کرو تو اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح کیا کرو اور رات کے بعض واقعات میں بھی اور ستاروں کے غروب

- ☆ ہونے کے بعد بھی اس کی حمد کیا کرو۔ (سورۃ طور 52 آیت 48 سے 49)
- ☆ اور زمین پر اتر کر (اور تن کر) مت چل کہ تو زمین کو پھاڑ تو نہیں ڈالے گا اور نہ لمبا ہو کر پہاڑوں (کی چوٹی) تک پہنچ جائے گا۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 37)
- ☆ اور ازراہ غرور لوگوں سے گال نہ بھلاتا اور زمین میں اتر کر نہ چلنا۔ کہ اللہ کسی اترانے والے کو پسند کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں اعتدال کئے رہنا اور بولنے وقت آواز نیچی رکھنا۔ کیونکہ اونچی آواز گدھوں کی سی ہے اور کچھ شک نہیں کہ سب سے بری آواز گدھوں کی ہے۔ (سورۃ انبیاء 21 آیت 18 سے 19)
- ☆ اور بری بات کے جواب میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو۔ (سورۃ مؤمنون 23 آیت 96)
- ☆ مومنوں تمہارے ملازم، کنیزیں اور جو بچے تم میں سے بلوغ کو نہیں پہنچے، تین دفعہ یعنی تین اوقات میں تم سے اجازت لیا کریں ایک تو نماز صبح سے پہلے اور دوسرے گرمی کی دو پہر کو جب تم کپڑے اتار دیتے ہو اور تیسرے عشاء کی نماز کے بعد تین وقت تمہارے پردے کے ہیں ان کے آگے پیچھے (یعنی دوسرے وقتوں میں) نہ تم پر کچھ گناہ ہے اور نہ ان پر کہ کام کاج کے لئے ایک دوسرے کے پاس آتے رہتے ہو۔ اس طرح اللہ اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے اور اللہ بڑا علم والا اور بڑا حکمت والا ہے۔ (سورۃ نور 24 آیت 58)
- ☆ اور اللہ کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے جاہلانہ گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں۔ (سورۃ فرقان 25 آیت 63)
- ☆ اور جب بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو ہمارے اعمال اور تم کو تمہارے اعمال۔ تم کو سلام۔ ہم جاہلوں کے خواستگار نہیں ہیں۔ (سورۃ قصص 28 آیت 55)
- ☆ اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتا۔ تو (سخت کلائی کا) ایسے طریقے سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے۔ (سورۃ تم جہ 41 آیت 34)
- ☆ اور اگر معاف کر دو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ بھی بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ تہا 24 آیت 64)
- ☆ اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 85)
- ☆ دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 19)
- ☆ (کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن سوتی“ بشکریہ شیخ بک ابجدی کراچی)

☆ غلام نبی صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تحریف کے لئے شکر ہے، بلکہ بہت بہت شکر ہے، آپ کے خلوص نامہ کا اگلے ماہ بھی شدت سے انتظار رہے گا۔

☆ شرف الدین جیلانی: نڈوالہ دیار سے، ٹھنڈی اور گرم ہواؤں میں رسالے کے لطف اندوز ہو رہے ہیں، ہر کہانی کو گہری نظر سے پرکھ رہے ہیں۔ شائد سحر۔۔۔ ساجدہ راجا بہت مختصر کہانی لکھ رہی ہیں۔ جبکہ ہم پڑھنے والوں کی خواہش ہوتی ہے کہ کم از کم دس بارہ صفحات کی کہانی ہونی چاہئے۔ راجہ دیشانی کی قسط دار کہانی کا انتظار ہے آج کل ڈر سے غائب ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنی امان میں رکھے۔ کچھ جیروں سے ہم اتفاق کرتے ہیں، راسخ صاحبان فکروں سے ملتی جلتی کہانیاں نہ لکھیں۔

☆ شرف الدین صاحب: آپ اپنے تمام شریک ہی لفظانے میں ارسال کر دیا کریں۔ ہم آپ کی چاہت و خلوص کی قدر کرتے رہیں گے، اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے تمام قلمی رشتوں پر اپنا فضل و کرم رکھے۔ (آمین)۔

☆ اسلم جاوید: فیمل آباد سے، السلام علیکم! آپ خبریت سے ہوں گے اور میں خداوند کرم سے نیک چاہتا ہوں بکمال پر ماہ مارچ کا فورڈ انجسٹ وکچر کمیرا اور خلی سے بار بار باغ ہو گیا۔ پرچے پہلے سے کافی ترقی کی ہے اور سرور بھی اب معیاری اور خوب صورت ہے۔ تمام تحریریں پہلے سے زیادہ بہتر ہیں یہ ایک دلکش اور معیاری جریہ ہے یا دوری کا بہت بہت شکر ہے اغزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں، آپ کا خلوص اور محبت ہی ہمارے لئے کافی ہے ہر ماہ کی مقررہ تاریخ پر پرچے کا بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے۔ موسم بھی آہستہ آہستہ بدل رہا ہے اور کاروباری حالات بھی آہستہ آہستہ تبدیل ہو رہے ہیں۔ مصروفیات میں سے وقت نکال کر یہ خط تحریر کر رہا ہوں تمام عنوان مثلاً قرآن کی باتیں، خطوط، توس قوس قزح غزلیں اور دیگر کہانیاں انگوٹھی میں جینے کی طرح فٹ ہیں۔ آجیب، موت کا گھر، بدو اچھی کہانیاں تھیں ان قلم کاروں کو میری طرف سے مبارکباد، چند غزل ارسال خدمت ہے۔ قریبی شمارے میں جلد دے دیں۔ ہر لمحہ میں آپ کی دعاؤں کی ضرورت رہتی ہے خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں، زندگی کے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔

☆ جاوید صاحب: خلوص نامہ ارسال کرنے کے لئے شکر ہے، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کے تمام اہل خانہ پر اپنا کرم کرے، کاروبار میں ترقی اور خوشیوں سے نوازے، آئندہ ماہ پھر ملے گی، قلمی لگاؤ کے ساتھ۔ اللہ حافظ۔

☆ قدیر رانا: راولپنڈی سے، آداب عرض: آپ کی خبریت کا طالب ہوں، دو غزلیں ارسال خدمت ہیں، کسی بھی آنے والی اشاعت میں جگہ دیکر مشکور فرمائیں۔ ادارے کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆ قدیر صاحب: غزل شامل اشاعت ہے۔ آپ کی خوشی کیلئے دعا گو ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو مزید خوشیوں سے نوازے غزل بھیجے گا شکر ہے۔ بشیر احمد بیٹھی: فوجی ہسپتال بہاولپور سے، السلام علیکم جناب! مارچ 2013ء کے شمارے کی تمام کہانیاں خوب ہیں، پہلی کہانی پاگل جی جی خزانے انداز میں لکھی گئی، ویسی ادب کی ایک شاہکار کہانی ہے، فرار، موکل کا کرشمہ، گمشدہ جزیہ، خون جگر، موت کا گھر، سنہری بھوت، آسب، نیلی کوٹھی، بدو حوں کا مسکن، قوم بجات، بدو عاء، بے چین روح یہ تمام کہانیاں آپے عنوان کی طرح حسین استرجاع کا پیکر رہیں۔ ڈی۔ بی۔ ہاؤس اس عنوان سے پہلے بھی ایک ایک کہانی نظروں سے گزر چکی ہے۔ ڈر کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆ بشیر صاحب: آپ کی یادداشت قابل دیدار قابل تحسین ہے۔ قلمی لگاؤ سے تجربہ کار آئندہ ماہ بھی شدت سے انتظار رہے گا شکر ہے۔ عثمان غنی: پشاور سے، السلام علیکم! میری طرف سے تمام اسٹاف کو دل کی گہرائیوں سے سلام قبول ہو، ماہنامہ ڈرڈا انجسٹ، ماہ مارچ 2013ء کا تیسرا شمارہ جلد نمبر 14- شمارہ نمبر 26، 6 تاریخ کو مل گیا، سب سے پہلے کہانیوں کی فائل کو سرسری سا دیکھا۔ اپنی کوئی کہانی شامل اشاعت نہ دیکھ کر میری کمر ہری کر سکتے ہیں۔ بیرونوہ باغی، عبدالقدور کو سوٹ ویکٹم ان ڈر، اس ماہ میرا خط شامل نہیں تھا۔ اپنی چاہ سے بھجوا تھا۔ بس! افسوس ہی کر سکتے ہیں۔ بقیں خان کا خط تھا زبردست، کہانیوں میں الجھاؤ زیادہ نظر آیا۔ بے چین روح میں ماہرواڑ بہت زیادہ تھا، اور کہانی کے کئی سین تھے، باگل جی، پاگل خانہ کا پارت ٹو معلوم ہوئی، ویڈیو زبردست، روٹو کا میں روٹاک کی موت پر خوشی ہوئی، موت کا گھر، سب سے اٹھنی کہانی رہی۔ سنہری تابوت، میں بے شمار الجھنیں ہیں جو کہ الجھانی ہے۔ نیلی کوٹھی زبردست تحریر رہی۔ بدو حوں کا مسکن مفرد شاہن نے اچھا لکھا۔ بلیک ٹائیگر اپنی ڈگر سے ہٹ کر گئی۔ عطیہ آگے کیا کرتی ہے۔ ڈی۔ بی۔ ہاؤس بھی بس ٹھیک ٹھیک ہے۔ غزلیں بھی ٹھیک ہیں۔ پلیز ضرور میری کوئی اسٹوری لگا دیں۔

☆ عثمان صاحب: آپ کا بہت بہت شکر ہے کہ آپ ہر ماہ اپنی کاوش ارسال کرتے ہیں، پچھلے ماہ آپ کا خط پروف ریڈنگ کی غلطی کی وجہ سے روک گیا، سوسمذرت، کہانی اگلے ماہ متوقع ہے، امید ہے آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیجا جھوٹے نہیں۔ Thanks۔

☆ احسان سحر: زادے خیلانوالہ میاں نوالی سے، السلام علیکم! امید کرتا ہوں ڈر کے پڑھنے والے اور ڈر کو تخلیق کرنے والے نے خیریت سے ہوں گے اور بات آگے بڑھانے سے پہلے ایک خاص بات آپ سب سے شیئر کرنا ہوں اور کچھ عرصہ پہلے مجھے کالج میں ایک دوست نے مشورہ دیا تھا کہ احسان میں چاہتا ہوں کہ آپ کچھ نیا لکھیں۔ اس طرز پر کہ جو آج تک بہت کم لکھا گیا ہو سو فیصد حقیقت پر مبنی بھی ہو اور آج کل کے دور کی عکاسی بھی کرتا ہو۔ یہ جنوں بھوتوں والے قصے لکھنا کوئی بڑی بات نہیں ہے، اس دن سے میں نے سبچنا شروع کیا کہ ایسا کیا ہو جس میں نیا نیا ملے۔ جو پڑھنے والوں کو نہ صرف چونکا دینے بلکہ ان کی آنکھیں بھی کھول دے اور اس حقیقت کو وہ مان بھی لیں۔ ایسا پلاٹ تخلیق کروں جو سن آموذ اور حقیقت پر مبنی ہو تو ایک ایسا ہی خیال اور پلاٹ میرے ذہن میں آ ہی گیا جس پر میں نے کافی سخت محنت کی ہے، پڑھنے والوں کے لئے جو ایک ہی موضوع پر پڑھ پڑھ کر بور ہو رہے ہیں۔ پچھلے ماہ جو میں نے آپ کو کجبت کے موضوع میں اسٹوری بھیجی تھی وہ تو آپ نے تلف کر دی تھی مجھے صدمہ ہے کہ کیا محبت کا کوئی موضوع نہیں۔ خبر یہ تو بعد میں بات ہوگی، اس وفد جو اسٹوری بھیج رہا ہوں اسے جلد از جلد قریبی شمارے میں جگہ عنایت فرمائیں۔ آپ کی نوازش ہوگی۔ اللہ پاک ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

☆ احسان صاحب: کوئی کہانی تلف نہیں ہوتی، موقع مناسب کو مد نظر رکھتے ہوئے کہانی شائع ضرور ہوتی ہے۔ امید ہے قلمی لگاؤ کے ساتھ آپ آئندہ بھی قلمی سوچ کو قارئین کی خدمت کے لئے ارسال کرتے رہیں گے۔ Thanks۔

☆ عامر ملٹ: راولپنڈی سے، آداب! اسن سکھ اور سلاحتی کی دعائیں۔ آپ سب اور قارئین کے نام مارچ کا "ڈرڈا انجسٹ" شائع اور رونق اور عمدہ تحریروں سے مزین ہے۔ اتنا اچھا شمارہ دیکھنے پر مبارکباد قبول کریں میری تحریر کی اشاعت کا شکر ہے۔ ایک تحریر ارسال کر رہا ہوں۔ اگلے ماہ دو تحریریں ارسال کروں گا کیونکہ گزشتہ پچھتے میری نانی صاحبہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں ادھر مصروف رہا ہوں۔ تمام اسٹاف کو آداب و سلام۔

☆ عامر صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی نانی کی مغفرت فرما کر اپنی رحمت کے طفیل جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے اور خوشیوں سے ہمکنار کرے۔ کہانی بہت لیت موصول ہوئی، لہذا اشاعت سے روک گئی۔ معذرت جزئی کہ کہانی کا شدت سے انتظار رہے گا۔ Thanks۔

☆ محمد کامران: حیدرآباد سے، السلام علیکم! ماہنامہ ڈرڈا انجسٹ مارچ کا شمار میرے سامنے ہے، میں نے کچھ کہانیاں پڑھ لی ہیں جو کہ میری خواہش کے عین مطابق ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو کافی عرصہ سے پاکستان میں بھی مختلف چینلوں پر بار بار دہرائے پند پند کی نگاہ سے دیکھے جا رہے ہیں۔ ورنہ پہلے صرف چند عارضی چینلوں پر ہی بار بار دہرائے دکھائے جاتے تھے۔ شروع میں ایک دو ڈا انجسٹ میں بار بار کہانیاں بھیجی تھیں مگر اب تو ہر ڈا انجسٹ اپنے شمارے میں ایک بار کہانی ضرور شائع کرتا ہے، بار بار کہانیوں کی ڈیما عذرا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے جہاں تک میرا پتا خیال ہے کہ ڈرڈا انجسٹ پاکستان کا وہ واحد ڈا انجسٹ ہے جو پچھلے نصف صرف بار بار کہانیاں چھاپ رہا ہے اور اس سے بار بار کہانیاں پڑھنے والوں کی دل کی تسکین ہو رہی ہے۔ میں کوئی دو سال سے ڈرڈا انجسٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں مگر فرسٹ ٹائم خط ارسال کر رہا ہوں، وہ ہے کہ اب ڈرڈا انجسٹ کی مشہور و معروف کہانی "روٹو کا" جس نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا، یہ ایسی کہانی ہے جو کہ اپنے پڑھنے والوں کو جگمگاتے رکھے اس کی ہر قسط میں ایک نیا نیا، اچھوتے طریقے سے نظر آتا ہے، کوئی بھی قسط اپنے سابقہ قسط سے ملتی جلتی نہیں بلکہ ہر ماہ نیا واقعہ قاری کو پڑھنے کے لئے ملتا ہے، اس کے علاوہ سنہری تابوت ہر قسط میں الجھن کا شکار نظر آتی ہے اور پھر بلیک ٹائیگر جس کے لئے صرف اتنا کہوں گا کہ بس چل رہی ہے۔ ویسے مجموعی طور پر ڈر سے منسلک تمام راسخ خوب سے خوب تر لکھ رہے ہیں۔ ان لوگوں کی جتنی تحریف کی جائے کم ہے۔ میری دعا ہے کہ ڈرڈا انجسٹ ماہ عروج حاصل کرے اور دن و گئی رات چوگئی، اگر میرے خط کی حوصلہ افزائی ہوئی تو آئندہ ماہ بھی اپنی رائے بھیجے گی بہت کم کروں گا ورنہ۔

☆ کامران صاحب: ڈرڈا انجسٹ میں میسٹ ویکم، چلے حوصلہ افزائی ہوگئی اور اب امید ہے کہ آپ آئندہ ماہ بھی اپنی رائے بھیج کر شکر یہ کا موقع دیں گے۔ Thanks۔

ایک روح کا عجیب و غریب طریقہ اپنے قاتل سے بدلہ لینے کا، ایسا انوکھا طریقہ کہ کوئی اس کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ فائنل واردات پر واردات کرنا رہنا تھا اور پھر جب وہ روح سامنے آئی تو.....

شاہکار کہانیوں کے ستارشی لوگوں کے لئے ایک بہت ہی دلغریب اور دل موہ لینے والی کہانی

ڈائری لکھنے کا شوق مجھے ہمیشہ سے رہا ہے، میرا روزانہ کا معمول ہے کہ اپنی زندگی کے شب و روز اپنی پریسل ڈائری میں لکھا کرتا ہوں تب جا کے کہیں مجھے نیند آتی ہے درجہ تو ایسا لگتا ہے کہ نیند کی دیوی مجھ سے روٹھ گئی ہے گویا کڑی ڈائری لکھنا میرے لئے نیند کی گولی سے مترادف ہے۔ اپنے حالات کا احاطہ کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ پرسرت واقعات، دل بہار زندگی کے حسین شب و روز، دوست انخاب کی کرم نوازاں، محبتوں کے صلے، وفاؤں کی داستان، اپنے خیالات کا محو، جو روزمرہ زندگی کے ساتھ بچ ہیں، انہیں قلم کی دہان دے کر صبر قریطاس پر بکھیرتا ہوں یہ سب میرا شوق ہے۔

آج بھی میں سارا دن بازاروں میں پھرتا رہا مگر میری مطلوبہ چیز مجھے نہیں مل رہی تھی ڈائری۔ سنے سال کی آمد آئی تھی۔ جس طرح کی ڈائری مجھے چاہئے تھی اس کی تلاش میں میں سارا دن سرگرداں رہا۔ میں ناکام واپس لوٹ آیا یہی کچھ سوچ کر ہاشل چلا آیا، ہاشل پہنچا تو ایسا لگا کہ میرا بدن تھکن سے چور ہے، بوچھل قدموں کے ساتھ ہسٹر پر دراز ہو گیا۔ شام بھی ہونے کو تھی۔ خاص بھوک کی شکایت بھی نہیں تھی اس

لئے سونے میں بھی عافیت جانی اب کھانے کا تکلف کون اٹھائے گا۔ انہی خیالوں میں مستغرق نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

مجھے ایسا لگا کہ میں سو با نہیں بلکہ جاگ رہا ہوں۔ سامنے کھلے ہوئے دروازے پر نظر پڑی تو میں دنگ رہ گیا ایک خوبصورت سی دوشیزہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی ٹپ ٹپ مسلسل اس کے چہرے پر رقصاں تھیں۔ کتنی ہی دیر وہ دروازے سے لگی مجھے دیکھتی رہی اور میں بھی آنکھیں جھپک جھپک کر اسے گھورتا رہا۔ میں اس دوشیزہ کا سواکت کرنا چاہتا تھا۔ جو ایک ناکام عاشق کے دروازے پر آن وارد ہوئی تھی اور پھر نہ جاتے ہوئے بھی میں اٹھ بیٹھا۔ حالانکہ میرا تھکا ہوا پورا جسم اجازت نہیں دیتا تھا کہ میں اٹھ کر کسی اجنبی کا غیر مقدم کروں پھر بھی مجھے جانچ پڑتال کرنی تھی کہ وہ حید کون ہے؟

ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ وہ ہرنی کی سی حال چلتی ہوئی میرے قریب آنے لگی۔ میں اپنی زندگی میں ایسی دلکش دلغریب اور خوبصورت دوشیزہ شاید ہی کسی دیکھی ہو۔ کتنی اور کالی زلفیں شانوں پر پریسل رہی تھیں۔ نیلے رنگ میں ڈوبی گہری آنکھیں

اور آنکھوں میں چھایا ہوا شمار و گنت گناہ دے رہا تھا۔
ریسلے ہونٹ من میں دس گھول رہے تھے، مسکراتے
ہوئے وہ میرے قریب بڑھتی چلی آ رہی تھی اس کی
مسکراہٹ پر فدا ہونے کو دل کرتا تھا۔ اس کی بغل میں
کچھ تھا جسے میں صبح طور دیکھ نہیں پارہا تھا اور ایسے بھی
اس کا حسن اجازت نہیں دیتا تھا کہ اس کے علاوہ کچھ
اور بھی دیکھا جائے۔

ایک بات میرے لئے حیران کن تھی کہ وہ سر
سے پیر تک سفید لباس میں ملبوس تھی اور اس پر روح کا
گماں ہوتا تھا مگر میں ان باتوں کو نہیں مانتا کہ ایک روح
دنیا میں واپس بھی آ سکتی ہے اس لئے اپنے خیال
کو جھٹک دیا اور پھر اس کے جسم سراپا کا بخور معائنہ
کرنے لگا۔ وہ بالکل میرے قریب آ گئی تھی اور میرے
پاس آ کر ایسے بیٹھ گئی کہ ہماری برسوں سے شناسائی ہو،
مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھی بھی تیر رہی تھی۔ ایسا
لگتا تھا کہ وہ پرانی یادیں لے کر ہمارے ماضی
کو کریدنے لگے گی۔ وہ جس جاؤ سے میرے قریب آئی
تھی اس سے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھے برسوں سے جانتی
ہے۔ ہماری دیر پا شناسائی ہے۔ ہم نے بہت سا وقت
ساتھ میں گزارا ہے، میں منسلک منہ کھولے حیران
سنا اسے دیکھ رہا تھا جسے مجھے اس کے وجود پر شبہ ہو۔

”اوئے!“ اس نے میرے کھلے ہوئے منہ
کو بند کر دیا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھی۔ ”پہلے لڑکی
نہیں دیکھی کیا۔“

میں دل میں سوچنے لگا۔ ”دیکھنی تو ہے مگر اتنے
قریب سے نہیں دیکھی۔“

”کیا سوچ رہا ہے؟“ ایک بار پھر اس کی آواز
سنائی دی۔

”وہ!“ میں پھلایا۔ ”یہی کہ آپ کون
ہیں اور میرے کمرے میں.....؟“ میں نے بات
کو اچھورا چھوڑ دیا۔

”اوئے یہ چھوڑ کہ میں کون ہوں؟ تو نے آج
مجھے دیکھ لیا، اب ہر روز دیکھتا رہے گا۔“ وہ ایسے بات

کرتی تھی کہ اسے ذرا بھی خوف نہ ہو کہ میں کدھر اور کس
کے پاس ہوں۔

”کیا مطلب میں سمجھا نہیں؟“ اور سوالیہ نظروں
سے اسے دیکھنے لگا۔

”پہل چھوڑ! یہ لے تجھے یہ چاہئے تھی
ناں۔“ اس نے اپنی بغل سے ایک خوبصورت ڈائری
میری طرف بڑھادی۔

میں نے جھٹ سے اس کے سر میں ہاتھوں
سے ڈائری اچک لی۔

”اوئے آرام سے پکڑ! اب یہ تیرے پاس ہی
رہے گی جب تک میں چاہوں گی۔“

واقعی ڈائری پکڑنے میں، میں نے بے مبری کا
مظاہرہ کیا تھا۔ بے مبری کی مظاہرہ کیوں تاکرتا جس
کے لئے میں سارا دن غل ہوتا رہا، وہ مجھے تحفے میں مل
رہی تھی، میرے لئے تو وہ ایک خزانہ تھی۔ میں جلدی
ہے اسے کھول کر اندرونی صفحات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔
جیسے ہی میں نے ڈائری کو کھولا ایک مسکون خوشبو
سارے کمرے میں بکھر گئی، خوشبو کی موجودگی میں اس
حینہ کے قرب کی لذت اور بڑھ گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ
خوشبو ڈائری سے نہیں بلکہ اس کے بدن سے آ رہی ہے
خورا ڈائری کے اور اراق الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ بالکل
دیکھی ہی تھی جیسی مجھے چاہئے تھی۔ میں نے ڈائری کو بند
کر کے سینے سے لگا لیا اور اس حینہ کو شکر بھری نظروں
سے دیکھنے لگا۔ ”شکر یہ جی آپ کا، مگر آپ نے اپنے
بارے میں کچھ بتایا نہیں؟“ اس کے بارے میں جان
لینے کا تجسس ابھی بھی میرے اندر بیدار تھا۔

”اوئے حیران کام ہو گیا ناں۔ اب میرا بھی تجھے
کام کرنا ہے۔“

”کام کیا کام؟“ میں حیران تھا۔ ”تم کہانی
لکھتے ہوتاں۔ مگر یہ میری کہانی بھی لکھنی ہے۔ اب
میں چلتی ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مگر تم نے اپنی کہانی تو سنائی نہیں۔“ میں نے
اسے روکنا چاہا۔

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ ”پتہ چل جائے
گی۔“ وہ اتنا کہہ کر جانے ہی والی تھی۔

”آپ راتیں کہاں ہیں؟“ میں نے دوسرا سوال
کر ڈالا اس دفعہ اس نے ناک بخونہ چڑھائی اور جل بہن
کر کہا۔ ”قبرستان میں چلو گے میرے ساتھ۔“ میں
ابھی کچھ کہہ پاتا کہ وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔

میں اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا اس کا عکس
اندھیرے میں دھندلا ہوتا جا رہا تھا پھر میں آنکھیں مل
کر اسے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا مگر فاصلے کی دوری
سے اندھیرا ہمارے درمیان حائل ہو گیا۔ اور مجھے ایسا لگا
کہ وہ بھی اندھیرا کا ایک حصہ بن گئی ہو۔ آنکھوں کو ملنے
ملنے میری آنکھ کھل گئی میں اپنے بستر پر دراز ابھی بھی
اپنی آنکھیں مل رہا تھا۔ جیسے کہ اسے دروازے کے
بارد دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں، میں نے اپنے ہاتھ،
آنکھوں پر سے ہٹائے اور آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں
کھول دیں میں بستر پر لیٹا رہا، تھوڑی دیر کیلئے میں
بھول چکا تھا کہ میں نے کیا سپنا دیکھا ہے مگر اچانک ہی
میں اٹھ بیٹھا کیونکہ رات کا دھندلا کھٹنے لگا تھا اور صبح کی
سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ میں بستر پر بیٹھا اپنے
گرد و نواح کا جائزہ لینے لگا کہ اچانک میری نظر ٹیبل
پر رکھی ڈائری پر پڑی تو میرے اوسان خطا ہو گئے، میں
حیرت ہی دیر ٹیبل پر رکھی ڈائری کو نکلتا رہا، میں ہمت نہیں
کر پارہا تھا کہ خواب کی مانند ڈائری کو اچک لوں۔ مجھے
سب کچھ یاد آنے لگا کہ کس طرح میں نے وہ حینہ مجھے
یہ ڈائری تھما گئی تھی۔

میں نے اپنے اندر ہمت جمع کی اور اپنا ہاتھ
ڈائری کی طرف بڑھا دیا۔ ڈائری میرے ہاتھوں میں
تھی اور اس کے پیر وہی مجھے کواٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔
ڈائری کو کھولتے ہی وہی مسکون خوشبو میری ناک سے
نکلانی۔ مجھے اپنا سپنا حقیقت لگنے لگا۔ کتنی ہی دیر
میں ڈائری کی ورق گردانی میں لگا رہا۔ بالکل دیکھی ہی
تھی جیسی مجھے چاہئے تھی ایک بار پھر میں خود سے کہنے
لگا۔ میں نے ڈائری کو واپس ٹیبل پر رکھا اور بستر سے نکل

کر کھڑکی کے پاس آ کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ سورج
نئے دن کی نوید لے کر نکل پڑا تھا اور اپنی کرنیں زمین
پر بکھیر رہا تھا ابھی تو میں سو یا تھا پھر یہ اچنی جلدی رات
کیسے بیت گئی۔ صرف ایک سپنا دیکھا تھا وہ بھی پل بھر کا
شاید، خوابوں کی دنیا آہستہ چلتی ہے انسان رات بھر
میں ایک ہی سپنا دیکھ پاتا ہے۔ اور رات گزر جاتی ہے
انہی باتوں کو سوچتا ہوا میں دُش آدم چلا گیا روزمرہ کے
معمولات سے فارغ ہو کر ناشتہ کیا اور کالج کے لئے
ردانہ ہو گیا۔

ڈائری کا اسرار ابھی بھی میرے سر پر سوار تھا کہ
کس طرح وہ میرے کمرے میں آن وارد ہوئی تھی۔
انہی باتوں میں الجھا میں کالج کے لئے رواں دواں تھا۔
کالج پہنچا تو میرا دوست کاشف پہلے ہی سے میرا
منتظر تھا۔ مجھے دیکھ کر کے میری طرف لپکا۔ ”بلو کیسے
ہو؟“ اس نے میری طرف آتے ہوئے کہا۔

”فائن! تم سناؤ تم کیسے ہو؟“ وہ آتے ہی مجھ
سے بٹنگیر ہو گیا۔ ”آج تو بڑی اچھی پرفیومن لگا کر آئے
ہو۔“ اس نے مجھ سے جدا ہوتے ہوئے کہا۔

شاید یہ وہی خوشبو تھی جو میرے پاس موجود
ڈائری سے چھوٹ رہی تھی۔ ڈائری پر نظر پڑتے ہی
خیمت سے اس نے ڈائری پکڑ لی واہ! ”یہ ڈائری تو بڑی
خوبصورت ہے کہاں سے لی ہے۔“ کاشف ڈائری
کو نظر انداز کر کے میری طرف دیکھنے لگا۔

”کہاں سے لی تھی بازار سے اور کہاں سے۔“
”اوہ! میں سمجھا کسی لڑکی وغیرہ نے دی ہوگی۔“

اس نے اپنی عاشقانہ طبیعت کا ثبوت پیش کیا اور ڈائری
مجھے پکڑادی۔

”یار کینٹین چل کر چائے والے پیتے
ہیں۔“ اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کینٹین کی طرف لے
جانے لگا۔ کینٹین میں آ کر ہم ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے
اتفاق سے دوسرے ٹیبل پر بیٹھا اور ٹیبل پر بیٹھی چائے پی
رہی تھیں۔ ٹیبل پر بیٹھ کر کاشف آہیں بھرنے لگا۔
اور زور زور سے دیکھ کو آواز دینے لگا۔ ”اوئے چائے

آئے۔

وہ شاید ٹوبہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا مگر وہ دونوں نظریں جھکائے چائے پینے میں مصروف رہیں۔

”یازنیر یہ ٹوبہ بھی ناکیا بتاؤں دیکھتی بھی نہیں، کسی دن اپنا دل چیر کے دکھانا پڑے گا۔ تب جا کے یہ محبت کا یقین کرے گی۔“ یہ بات وہ بڑے سرس ہو کر کہہ گیا تھا اتنے میں چائے آگئی اور ہم چائے کی چٹکی لینے لگے، کافی دیر تک ہم دونوں خاموشی سے چائے پی رہے۔

کاشف تھوڑا اداس لگنے لگا تھا۔ اور سر جھکائے میز کو گھور رہا تھا میں نے اسے دلاسا دینا چاہا۔ ”میر کرکھی تو تیری زندگی میں بھی بہا آئے گی مجھے دیکھ کوئی لڑکی پیدا نہیں کرتی پھر بھی خوش ہوں۔ شاید ہماری زندگی میں یہی سب کچھ لکھا ہے۔“

”نہیں میر! اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا، انگرام ہوتے ہی میں کالج چھوڑ کر چلا جاؤں گا اب اور مجھ سے سنگدلوں کی نظروں میں نہیں رہا جاتا۔“ وہ یہ بات بڑے ایسٹل طریقے سے کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی چمکنے لگی تھیں اس سے پہلے کہ اسے میں دلاسا دیتا میں نے خود کو روک لیا شاید وہ اپنے دل کا درد نکال باہر کرنا چاہتا تھا۔ اور میں بھی غم میں ڈوبی اس کی باتیں سننے لگا۔ ”میر!“ وہ اچانک سے گویا ہوا۔

میں ہر تن گوش اسے دیکھنے لگا۔ وہ کہنے لگا ”میر! یہ دنیا ہے یہاں سب کچھ چلتا ہے یہاں پر انسان کچھ خواب لے کر آتا ہے۔ کچھ خواہشیں ہوتی ہیں ہر انسان کی۔ میر! میں جاگتے میں بھی خواب دیکھنے کا عادی ہوں۔ اور خیالوں کی دنیا میں بہت آگے نکل جاتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر اس نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور اپنی سائڈ پر دیکھنے لگا۔ جیسے وہ مزید کچھ کہنا چاہتا ہو اور الفاظ کا چننا کر رہا ہو۔ دوبارہ مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

”میر! کبھی کبھی میں چاہتا ہوں ایک پیارا سا

دلیس ہو، جہاں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہو۔ پیارا سا موسم اور خوشنما پھول آنکھوں کا مرکز بن رہے ہوں۔ ان پھولوں کے بیچ میں اور ٹوبہ ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے نکل رہے ہیں اچانک سے مجھے شرارت سوچتی ہے اور میں ایک پھول تو ڈر کر ٹوبہ کو مار دیتا ہوں۔ ٹوبہ بھی جواب میں مجھے ایک پھول تو ڈر کر مار دیتی ہے۔ یہ سلسلہ چل نکلتا ہے، پھولوں کے تبادلے ہم ایک دوسرے کو پھول مار رہے ہیں اسی اثناء میں ٹوبہ پھول توڑنے کے لئے ٹھہری کو حرکت دیتی ہے تو گلاب بھی ساتھ آ جاتا ہے۔ پھول کے ساتھ وہ مجھے گلاب بھی مار دیتی ہے۔ تو میں خیالات کی دنیا سے باہر نکل جاتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور میں کھلے والی بات پر ہنسنے لگا۔ کاشف چائے کے دوران مجھے دیکھ رہا تھا جیسے اسے میرا اپنا پسند نہ ہو۔

”یہ تم ہی کیوں رہے ہو تمہیں پتہ ہے میرے پر کیا بیت رہی ہے؟“

”یاد تم نے بات ہی ایسی سنائی ہے، اپنے آپ میری ہنسی نکل رہی ہے۔ آؤ کلاس روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ میں نے قدرے ہنسی روکتے ہوئے کہا، پھر ہم دونوں اٹھ کر کلاس روم کی طرف بڑھ گئے۔ تب تک شاملہ اور ٹوبہ بھی جا چکی تھیں۔ کلاس روم میں آ کر کاشف تو کتاب کھولے اس کی ورق گردانی کرنے لگا قدرے غمگین بھی تھا۔

جبکہ میں ابھی تک کاشف کے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ ”محبت بھی عجیب شے ہے۔ ہنسنے مسکراتے چہروں کو رلا دیتی ہے، محبت میں انسان یہ بھی بھول جاتا ہے کہ وہ خود کیا ہے، اپنے مشن سے نا آشنا ہو جاتا ہے اب کاشف کو بھی دیکھ لو۔ اچھا بھلا بنائے رکھا تھا۔ آج خود بخود بنا بیٹھا ہے۔“

کاشف میرا سب سے اچھا دوست ہے میں نہیں چاہتا کہ وہ اداس ہو۔ لیکن اس وقت میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ میں نے یہ عہد کر لیا کہ اسے اس کی محبت دلوں گا۔ واپسی پر بھی کاشف

کا غمگین چہرہ میری نظروں کے سامنے گھومتا رہا کسی پل مجھے آرام نہیں تھا۔ میں کچھ کر گزرتا چاہتا تھا کاشف کے لئے۔

میرا روز کا معمول تھا کہ کسی پارک یا کوئی خوبصورت جگہ میں چل قدمی کر کے دن بھر کی تھکن دور کر لیتا تھا مگر آج میں ہر چیز سے دلبرداشتہ ہو کر ہاسٹل آ پہنچا ہاسٹل آ کر میں اس ڈائری کو دیکھنے لگا جسے میں فراموش ہی کر چکا تھا کہ کس نیمراڈ طریقے سے وہ میرے پاس موجود تھی۔ ڈائری کھولتے ہی وہی محور کن خوشبو میری ناک سے نکلتی۔ میں بھی سانس لے لے کر اس خوشبو کو اپنے اندر سونے لگا میں ڈائری کی ورق گردانی کرنے لگا، دیدہ زیب کاغذ اور عمدہ جلد سازی کا نمونہ تھی۔

ایک چیز میرے لئے حیران کن تھی۔ ڈائری کے ہر بیچ پر کوئی نہ کوئی انسانی کھوپڑی اور اس پر کر اس کا نشان تھا۔ جو شاید خطرے کی علامت تھی مگر یہ تصویر چند ایک صفحہ پر ہی تھی آگے کے صفحات اگلے تو بڑی حیران کن تصویر میرے سامنے تھی۔ ایک لڑکی لڑکے کو گلاب کا پھول پکڑا رہی تھی ایک دو صفحات پر یہی تصویر تھی مگر آگے چل کر منظر بدل گیا۔ دل دہلا دینے والی تصویر میری نظر تھی میں نے دیکھا ایک لڑکی جو سفید لباس میں لباس ہے۔ ایک انسان کے سینے پر چڑھ کر بیٹھی ہے اس کے ہاتھ میں خنجر چمک رہا ہے اس کا خنجر دالا ہاتھ فضا میں بلند ہے۔ شاید وہ اس انسان کو مار دینا چاہتی تھی۔ کافی صفحات پر یہ تصویر نمایاں تھی تصویر بھی نہیں کہا جاسکتا بس ایک شبہ تھی، آگے کے صفحات پر بھی بہت سی تصویریں تھیں۔ مگر وہ میرے لئے اتنی اہم نہیں تھیں۔

میں واپس صفحات پلٹنے لگا اور اس تصویر پر آ کر ٹھہر گیا جہاں وہ لڑکی لڑکے کو پھول پکڑ رہی تھی ایک بار پھر مجھے کاشف کی باتیں یاد آئے لگیں۔ یہ دنیا ہے یہاں پر سب کچھ ہوتا ہے۔ ہر انسان ڈھیر دن خواب لے کر کے اس دنیا میں آتا ہے اور ضروری نہیں کہ اس کے خواب پورے ہوں۔ حسرتیں باقی رہ جایا کرتی ہیں۔ پھولوں کی دادی ہو۔ جہاں پر میں اور ٹوبہ

ہوں۔“ یہ کاشف کی وہ باتیں تھیں جن سے میرا دل بھرا آیا تھا۔

میں اپنے دوست کے خیال کو حقیقت کا رنگ دینا چاہتا تھا اسے یادگار کے طور پر لکھ لیتا چاہتا تھا ممکن ہے یہی سب کچھ حقیقت کا روپ دھار لے۔ اور وہ سارے منظر میری ڈائری کی زینت بن جائیں۔ میں نے قلم اٹھایا اور ایک ایسی کہانی لکھنے لگا جس میں کاشف کو اس کی محبت مل جاتی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو میری کہانی ہٹ کھلائے گی۔ لڑکی والا بیچ میرے سامنے تھا اور اس کی محبت کو کامیابی کا رنگ دے کر کچھ اس طرح لکھا۔

ہماری کلاس کا گروپ پکنک پر جاتا ہے اور پکنک کیلئے ہمیشہ ایسی جگہوں کا انتخاب کیا جاتا ہے، جو خوبصورت ہوں۔ جہاں پر سکون ہی سکون ہو، ہر طرف خاموشی کا راج، جہاں پر انسانوں اور گاڑیوں کا شور نا ہو، سرسبز علاقہ اور چنی چنی پہاڑیاں، ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے باریک سے راستے جن پر چلتے سے انسان کا من خوش ہوتا ہے ہماری بس بھی ہمیں لے کر کے ایسی ہی جگہ پہنچتی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں دل و دماغ کو فرحت بخش رہی تھیں۔ پرندوں کی ملی جلی آواز میں مجھے ایک ایک آواز سنائی دیتی ہے۔

کاشف ٹوبہ سے مخاطب تھا۔ ”ٹوبہ آئی لو یو۔“ ٹوبہ نے پلٹ کر کاشف کو دیکھا۔ چلتے ہوئے اس کے قریب آئی اور ایک زوردار چپڑ کاشف کے منہ پر مار دیا۔ یو باسٹر ڈمپھاری یہ حال! شکل دیکھی ہے اپنی، چلا ہے آئی لو یو بولنے، بات تیرے دماغ میں نہیں اترتی کیا۔ تجھے کتنی بار بولا ہے کہ اپنی منہوں شکل میرے سامنے لے کر نہ آیا کر۔ اگر آئندہ یہ حرکت کی تو دانت توڑ دوں گی تیرے۔ ٹوبہ آئی لو یو بخوں بنتا ہے سالو!“ ٹوبہ یہ سب کچھ سن کر ایک طرف کوچل دی۔

کاشف اس کی جلی کئی باتیں سن کر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ

لے شاید روٹا چاہتا تھا مگر نہیں۔ اس نے اپنا منہ زمین کی طرف کر کے زور سے کہا۔ ”ٹوپیہ آئی لو پیو!“ ہاں اب وہ روٹنے لگا تھا۔ اس کے بلکنے کی آواز مجھے سنائی دینے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہر روز کی طرح اسے آج بھی دلاس دینے لگا مگر کاشف تھا کہ ردے جا رہا تھا۔

مجھے ٹوپیہ پر سخت غصہ آنے لگا۔ ”پاگل کی بچی محبت کا مطلب نہیں سمجھتی۔“

کافی دیر کاشف اسی طرح روٹتا رہا شاید رد کر اپنا غم ہلکا کرنا چاہ رہا تھا یہی کچھ سوچ کر میں نے اسے رد کرنے دیا اور ٹوپیہ کو برا بھلا کہنے لگا۔ اس کی سسکیاں بند ہو گئیں تو میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ لائق بچے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اسے لے کر اس طرف چل دیا۔ جہاں پر ہمارا گروپ شرارتوں میں مگن دنیا جہاں سے بے خبر تھا کہ کسی کے دل پر کیا بیتی ہے مگر ان لوگوں میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو دروسوں کے لئے ورد دل رکھتا تھا شامک۔

میں کاشف کو لے کر آگے بڑھ رہا تھا مگر کاشف نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ اور وہیں پر ایک بڑے سے پتھر پر جا بیٹھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسی سچویشن میں آدمی تہائی پسند بن جاتا ہے اس لئے اسے اکیلا چھوڑ کر اپنے گروپ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ شامک اور ٹوپیہ ایک طرف کو سب سے الگ تھلگ کھڑی کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ میں منٹا چاہتا تھا کہ کیا باتیں چل رہی ہیں جب میں نے غور کیا تو مجھے کاشف کا نام سنائی دیا، میں سمجھ گیا اور پھر آہستہ سے ان کے قریب ہوتا ہوا ایک پتھر سے ٹیک لگا کر ان کی باتیں سننے لگا۔

”شامک کچھ کہہ رہی تھی۔“ ٹوپیہ یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔“

”کیا اچھا نہیں کیا۔“

”یہی کہ کاشف کو پھر مار کر اچھا نہیں کیا اور کتنا رسوا کر دی ہے۔“

”نہیں شامک میں نے اسے رسوا نہیں کیا بلکہ وہ

مجھے رسوا کرنا چاہتا تھا۔ بھلا اس طرح بھی کوئی آئی لو پیو بولتا ہے اگر کوئی اور سن لیتا تو۔“

”دیکھو ٹوپیہ اس کی محبت میں سچائی ہے اس لئے وہ کسی سے بھی نہیں ڈرا اس نے سرعام کہہ ڈالا وہ بے چارہ اکب سے تمہاری راہ تک رہا ہے تمہارے منہ سے اپنے لئے دو بول سننے کے لئے بے تاب ہے۔ مگر تم ہو کہ پتہ نہیں کیا سمجھتی ہو اپنے آپ کو، کتنی بھی بار تم نے اسے ٹھکرایا ہے۔ مگر وہ آس لے کر پھر چلا آتا ہے۔ ٹوپیہ یہ دنیا مکافات عمل ہے یہاں پر جیسا کردگی دینا ہی پاؤ گی۔“

”اگر یہ سب تمہارے ساتھ ہوتا، تب میں تم سے پوچھوں گی۔“

”اور اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تاں تو کب سے محبت کا جواب محبت سے دے چکی ہوتی۔ دکھ ہوتا ہے تم پر، اچھے بھلے انسان کو ٹھوکر ماردیتی ہو۔ ایسا محبت کرنے والا تمہیں پھر نہیں لے گا۔ کبھی کبھی مجھے افسوس سا ہونے لگتا ہے کہ میں تمہاری دوست کیوں ہوں اور تمہارے ساتھ برابر کی شریک ہوں۔“ یہ سب سن کر شامک ایک طرف کو چل دی مگر ٹوپیہ کو گہری سوچوں میں ڈال گئی تھی۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ ٹوپیہ کے مردہ ضمیر میں جان پڑ گئی ہے وہ تمہا کھڑی اپنے ماضی کی غلطیوں کو دہرا رہی ہے اپنے کئے پر شرمندہ تھی وہ انہی سوچوں میں ڈوبی اس طرف کو چل دی جہاں پر کاشف تباہ بیٹھا تھا۔ شاید وہ اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنا چاہتی تھی پھر میں نے دیکھا کہ وہ کاشف کے پاس جا پہنچی ہے۔ میں ان کی باتیں تو نہیں سن سکتا تھا۔ مگر پھر بھی مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے کئے پر کاشف سے معافی مانگ رہی ہے۔

اور ایسا ہی لگا کہ اس نے کاشف کی محبت کے آگے ہتھ پیر ڈال دیے ہیں۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا کیونکہ مجھے کاشف کی آواز سنائی دی تھی جو پکار پکار کر یا ہو کا نعرہ لگا رہا تھا اور پھر میری آنکھوں نے حیران کن منظر دیکھا ٹوپیہ کاشف کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے شاید اسے سب سے الگ لے جانا

چاہتی ہے تاکہ کچھ راز و نیاز کی باتیں ہو سکیں۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ ٹوپیہ نے اپنا سر کاشف کے کاندھے پر ٹکایا ہوا ہے اور وہ دونوں ایک طرف کو جا رہے تھے میں کتنی ہی دیر انہیں اس طرح دیکھتا رہا جیسے محبت اسی کا نام ہے دو لوگ ایک دوسرے میں اس طرح سماں جاتے ہیں جیسے وہ ایک ہوں، میرا سن خوشی سے جھونے لگا کیونکہ میرے دوست کاشف کو اس کی محبت مل گئی تھی۔ کاش ایسا ہی ہو یہ سب کچھ، لکھ کر ایک سرسری نظر کہانی پر ڈالی اور ڈائری ایک طرف کو ٹھیل پر رکھ دی خود آنکھیں بند کر کے بستر پر دراز ہو گیا اور جلد ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اچانک سے مجھے ایسا لگا کہ ٹھک ٹھک کی آواز کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی ہے میں نے چہرے سے کبل ہٹایا شاید دروازے پر کوئی تھا۔ اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھولنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ایک دم سے دروازہ کھل گیا یاہر وہی دشنہ سفید لباس میں لمبوس کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی میں کنبوں کے بل تھوڑا اوپر کو اٹھا اسے دیکھ رہا تھا وہ بغیر اجازت بائے کرتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ اور میرے قریب آ کر بیٹھ گئی میں اٹھ کر بیٹھنا چاہتا تھا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے لیٹے رہنے دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی اس کی نظر ٹھیل پر رکھی ڈائری پر پڑ گئی۔ آگے بڑھ کر اس نے ڈائری کو اٹھا لیا۔ اور وہ سب کچھ دیکھی آواز میں پڑھنے لگی جو میں لکھ کر سویا تھا۔“

اوہ!“ اس نے اپنا مخصوص انداز اپنایا۔ اس کے بولنے کا اسٹائل بڑا عجیب تھا۔ کسی لڑکے کی انداوے کہہ کر مخاطب ہوتی تھی۔

”تیری یہ کہانی بہت ہو جائے گی۔ بلکہ حقیقت کا روپ دھارے گی تو فکر نہ کر میں تو بس تجھے دیکھنے آئی تھی میں نے کہا تھا ناں کہ اب ہم روز ملتے رہیں گے چل اب سو جا۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ پاتا اس نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دیا اور پھر اچانک سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں حقیقی

معنوں میں نیند کے مزے لینے لگا۔

صبح کو میں یہ بھول چکا تھا کہ رات کو میرے ساتھ کیا بیتی ہے۔ کان بجھنا اور اپنے دوست کاشف کو تلاش کرنے لگا، تلاش بسیار کے بعد بھی کاشف مجھے نظر نہ آیا۔ کچھ سوچ کر کے میں کنبوں کی طرف بڑھ گیا۔ اور میرا اندازہ درست نکلا کاشف کنبوں میں بیٹھا جائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ ”میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا تھا اور تم یہاں بیٹھے ہو۔“ میں نے کاشف کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”میرا ڈاڈا چائے پیو!“ اس سے پہلے کہ میں بیٹھا وہ چائے کا آؤر ڈر دے چکا تھا۔ ”آج تم نے میرا گیسٹ پر بھی انتظار نہیں کیا۔“ میں نے بیٹھے ہوئے شکایت کی۔

”نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں۔ بس آج کچھ طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لئے کنبوں میں چائے پینے چلا آیا۔ اور ویسے بھی میں جانتا تھا کہ تم مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آ جاؤ گے۔“ اس نے عذر پیش کیا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دے پاتا چائے آ گئی۔ اور پھر ہم دونوں چائے پینے لگے۔

”میر تمہیں کچھ پتہ چلا۔“

”کس بارے میں؟“ میں نے ٹھیل پر کنبیاں رکھتے ہوئے کہا۔

”یہی کہ ہماری کلاس کا گروپ بچک پر جا رہا ہے۔“

”کیا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”ہاں آج صبح ٹیچر نے یہ خوشخبری سنائی ہے ویسے تم چلو گے ناں؟“ اس نے چائے کی چسکی لیٹے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں اگر میرا یار کاشف جائے گا تو ضرور چلوں گا۔“ میں نے اسے خوش کرنا چاہا اور پھر ہم دونوں چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔

میں کان کے دست لان میں پتھر سے بنے بیچ پر بیٹھا خیالوں میں گم تھا کہ میری نظر شامک پر پڑ گئی جو اپنی دوست کے ساتھ خوش گپوں میں مصروف تھی۔

شاملہ ایک سادہ سی لڑکی ہے اس کا معیار اور اسٹینڈرڈ دوسری لڑکیوں سے مختلف ہے۔ سائنسی لڑکی ہے مگر دکاشی اس کے چہرے سے عیاں ہے۔ خاص کر کسی سے کپ شپ بھی نہیں رکھتی مگر بلوہائے ہر ایک کے ساتھ ہی ہے وہ ایک غریب لڑکی ہے زیادہ اونچے لوگوں میں نہیں پہنچتی بلوہائے مجھ سے بھی ہے مگر میرے ساتھ اس کا انداز بڑا ہی سنجیدہ ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہمارا احترام کا رشتہ ہے۔ ایک دوسرے سے مذاق کرنا ہم ضروری نہیں سمجھتے۔ کسی بھی موضوع پر سنجیدہ گفتگو ہو جاتی ہے بالآخر اتفاق اگر کسی بھی بات میں مذاق کا عنصر نظر آجائے تو ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں اتنا ضرور ہے کہ کسی بھی دوسرے کی بات پر ہنس لیا جائے۔ جیسا کہ کاشف کی کوشش نہیں ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو ہنسائے رکھے۔

میں شاملہ کے بارے میں یہ سب کچھ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ بقول کاشف کے ہر آدمی اس دنیا میں ڈھیروں خواب لے کر آتا ہے جن کے لئے وہ ساری زندگی سرگرداں رہتا ہے۔ پھر بعض کو تو خوابوں کی تعبیر مل جاتی ہے اور بعض کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ شاملہ کے بارے میں میرا جو خیال ہے مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس کے اپنے کوئی خواب نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کا مقصد کچھ بھی ہو جیسا کہ ہر آدمی کچھ سوچ کر تعلیم حاصل کرتا ہے۔ مگر شاملہ کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں۔

میں نے پہلے بھی کہا کہ سادہ سی لڑکی ہے سادہ سے لباس میں ملبوس اس پر ترس سا آنے لگتا ہے۔ پرانی کتابیں لے کر کالج آتی ہے اور سب سے بچ بچا کر کلاس روم میں چلی جاتی ہے۔ پھر بھی راستے میں ایک دو کو بلوہائے بولنا پڑتا ہے اور وہ شاش بٹاش سی مسکراہٹ سے سب کی طرف دیکھتی ہے ایسا لگتا ہے کہ صبر اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر رہا ہے۔ استقامت کا پہاڑ ہے اس کے مقابلے میں کچھ غریب لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ جو پیکوں پر ڈھیروں خواب سجائے رکھتی ہیں۔ کسی امیر زادے پر نظر پڑتے ہی دل میں کک محسوس کرنے لگتی

ہیں حسرت سی ان کے دلوں میں جاگ اٹھتی ہے ان کے دل کے کسی کونے میں حسد بھی بیدار ہو جاتا ہے کہ کاش! یہ سب کچھ نہیں مل جائے۔

ابھی دو ماہ قبل ایک لڑکا عاطف کالج میں انٹرنیشنل لینے آیا پڑوسی گاڑی اور ایجنٹ سوٹ بوٹ میں ملبوس کسی رئیس کی اولاد لگتا تھا کافی پینڈم بھی تھا وہ جیسے ہی گاڑی سے اتر لڑکیاں تو ابے دیکھ کر آہیں بھرنے لگیں۔ اتفاق سے اس وقت شاملہ تیرے پاس کھڑی تھی اور کسی موضوع پر ہمارے درمیان بات چیت چل رہی تھی۔ ہم نے بھی اسے دیکھا کہ وہ اپنی گاڑی سے اتر کر ارد گرد کا جائزہ لے رہا ہے مگر انسان ہر چیز کو ایک بار دیکھنا ضرور ہے شاملہ نے اس وقت یہ ثبوت پیش کیا کہ کسی سے باتوں کے دوران باتوں پر توجہ دینا کتنا ضروری ہے تاکہ سامنے والے کا دل نا دکھے کچھ اسٹوڈنٹس تو آگے بڑھ کر اس سے جان پہچان بنانے لگے ہر ایک کی کوشش یہ تھی کہ وہ اسے اس کی مطلوبہ جگہ یعنی پرنسپل کے دفتر چھوڑ آئے اس دوران میں نے نوٹ کیا کہ شاملہ کی پیشانی پر مل پڑ گئے ہیں شاید اسے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

شاملہ کے اندر جو خوبیاں تھیں وہ مجھے پسند ہیں ایسے لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگوں کا نام میری پرنسپل ڈائری میں موجود ہو۔ کچھ ایسے واقعات لکھ لئے جائیں جن سے ان کی خوبیاں عیاں ہوں اور خیالات کی دنیا میں انہیں وہ مقام دے دیا جائے جس کے وہ مستحق ہیں خود سے تو ان کی اپنی کوئی خواہش نہیں لیکن ہم لوگوں نے ان کے بارے میں سوچنا ہے کہ ان کی اصل جگہ کیا ہے۔ اصل مقام کیا ہے یہی کچھ سوچ کر کے شاملہ کے بارے میں کچھ لکھنا ہے میں اٹھ کھڑا ہوں۔

دوسرے دن پیک پر بھی جانا تھا جس کے لئے سارے شیڈول بنائے گئے تھے ہر ایک نے اپنے طور پر تیاری کرنی تھی یہی باتیں سوچتا ہوں میں ہاسٹل کی طرف بڑھ گیا۔

ڈائری کے جس صفحہ پر لڑکی اور لڑکے کی تصویر تھی وہ صفحہ میرے سامنے تھا میں شاملہ کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا تھا میرے ذہن میں شاملہ کے بارے میں کچھ اس طرح کا خیال ابھرا۔

شاملہ کالج کے وسیع لابی میں پتھر کے بیچ پر بیٹھی خیالوں میں گم ہے تھوڑی دیر اس بھی تھی۔ شاید اسے کوئی پریشانی لاحق ہے۔ اور یہ اس کی عادت رہی ہے کہ وہ اپنی پریشانی کسی سے شیئر نہیں کرتی۔ آج بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ ایسی کچھیشن میں مبتلا ہیں کہ وہ سوچ رہی ہیں کہ وہ خود سے اپنی پریشانی کا حل تلاش کرتی ہے اس کی عادت بہت ابھی ہے خوشیوں میں سب کو شامل کرنا اور غم میں خود ہی ٹوٹ کر بکھرتے رہنا۔ شاملہ بہت گہرے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی اپنے ارد گرد سے بھی بیگانگی کا اس کی فہم چل رہی ہے۔

اچانک سے وہ ہلکی آواز سن کر چونک سی جاتی ہے ”ہیلو شاملہ!“ شاملہ جلجت میں ارد گرد نظر دوڑاتی ہے تو ٹھوڑے فاصلے پر اسے عاطف نظر آتا ہے جو اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا شاملہ اسے مسکراتے دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ ”ہائے شاملہ“ عاطف نے شاملہ کو بیگنی دنیا سے واپس دیکھ کر ایک بار پھر گفتگو کے ابتدائیاں کلمات دہرائے۔ ”کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔“ عاطف نہیں چاہتا تھا کہ شاملہ میری وجہ سے ڈسٹرپ ہو۔

”پلیز، بیٹھے۔“ شاملہ نے ایک طرف سرکتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کو کافی دیر سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ نہ جانے کن خیالوں میں گم پریشان لگتی ہیں۔“ عاطف نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اوہ تو ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ شاملہ نے اپنی پریشانی زائل کرنا چاہی۔

”شاملہ کوئی بات تو ہے کہ آپ پریشان ہیں۔ آپ مجھے اپنی پریشانی بتائیں، ہو سکتا ہے کہ میں آپ کی کچھ مدد کروں۔“ عاطف نے کہا۔

”عاطف صاحب ایسی کوئی بات نہیں کہ میں

پریشان ہوں، اکیلا بیٹھا آدمی خیالوں میں گم ہی لگتا ہے کہ وہ پریشان ہے اور بانی داوے آپ میری مدد کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ شاملہ نے تھوڑا سا تلخ لہجہ اپنایا۔

”انسانیت کے ناطے میں آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔“

”مگر آپ یہ انسانیت کہیں اور بھی تو دکھا سکتے ہیں مجھ پر ہی کیوں۔“

”دیکھو شاملہ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔“ دراصل بات یہ ہے کہ عاطف بات کرتے ہوئے ہنسیاں پھیلاتا ہے۔

”ہاں ہاں بولو کیا بات ہے؟“ شاملہ نے عاطف کو خاموش دیکھ کر کہا۔

”دیکھو شاملہ ہر انسان کے اندر ایک جذبہ پایا جاتا ہے ہمدردی کا جذبہ، کب کس وقت، کس کے لئے وہ بیدار ہو جائے یہ کوئی نہیں جانتا، آپ کے ساتھ ہمدردی جتنا ناکیا معانی رکھتا ہے آپ اسے کوئی بھی نام دے سکتی ہیں۔“

”کوئی بھی نام کیا مطلب؟“ شاملہ نے عاطف کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”مثلاً دوستی کا رشتہ، اس کے علاوہ۔“ عاطف کہتے کہتے رک گیا۔

”اس کے علاوہ۔ اس کے علاوہ کیا؟“ شاملہ عاطف کی باتوں سے ڈسٹرپ ہوئی۔

”اس کے علاوہ ایک اور رشتہ بھی ہوتا ہے۔ محبت کا رشتہ۔“ اتنا کہہ کر عاطف خاموش ہو گیا۔

”محبت کا رشتہ۔“ شاملہ نے عاطف کی بات کو دہرایا۔

”ہاں شاملہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں میں نہیں جانتا کہ مجھے تمہاری کون سی ادائیہ آگئی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ پچھلے تین ماہ سے میں تمہیں ٹوٹ کرنا چلا آ رہا ہوں چپ چپ سی اداس سب سے الگ تھلگ تمہاری اپنی دنیا ہے آج موقع ملا ہے تو تم سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی اپنی اس دنیا میں شامل کرلو۔“

”کتنی ہی لڑکیاں اس کالج میں ایسی ہیں جنہوں نے

اشارہ اور بعض نے صراحتاً مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ مگر دل ہے کہ انتہائی نہیں، میری سلاشی نظروں کا مرکز ہمیشہ تم رہی ہو، آج میں اپنی محبت کا اظہار کرتا ہوں آگے تمہاری مرضی، عاطف بہت جلد آپ سے تم پر آگیا تھا۔ ”چاہے تو میری محبت کا بھرم رکھ لو۔ چاہے تو ٹھکرا دو میں جانتا ہوں کہ ابھی تم میری کسی بات کا جواب نہیں دے پاؤ گی۔ اس کے لئے میں تمہیں کچھ دقت دیتا ہوں تم مجھ سے اپنے دل کی بات کہہ دینا، اوکے میں چلتا ہوں مگر مجھے تمہارے مثبت جواب کا انتظار رہے گا۔ اتنا کہہ کر عاطف اٹھا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

مگر جاتے جاتے وہ ٹائلڈ کو سچوں کے عمیق سمندر میں چھوڑ گیا تھا۔ وہ ٹائلڈ جو کسی سے دوستی کرنے سے پہلے سو بار سوچتی تھی، اسے نئی منزل کا پتہ دے گیا تھا وہ، ٹائلڈ جو دوسروں کو محبت کی تلقین کرتی تھی آج خود محبت کے سمندر میں بھنس گئی تھی، عاطف اسے کڑے امتحان میں دھکیل گیا تھا۔ امتحان بھی تو تھا کہ اگر وہ محبت کا جواب محبت سے دیتی ہے تو اسٹوڈنٹس کیا کہیں گے، ٹائلڈ دولت پر مرثی اور اگر وہ محبت کو ٹھکرا دیتی ہے تو اس کی وہ باتیں کہاں جائیں گی جو وہ ٹوبہ سے کہہ چکی تھی۔ ”اگر تمہاری جگہ میں ہوتی ناں تو ضرور محبت کا جواب محبت سے دیتی۔“

پریشانی اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگی۔ ایک عجیب سا احساس اسے ستانے لگا، دل و دماغ کی جنگ جاری تھی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پاری تھی کہ کس کا انتخاب کیا جائے ایک طرف اس کا بھرم تھا جو وہ پچھلے کئی سالوں سے قائم رکھے ہوئے تھی اور دوسری طرف محبت تھی جو اس کی دنیا میں بسنا چاہتی تھی، کتنی ہی دیر وہ سوچ و بہار کے بجنے میں قید رہی پھر اچانک سے وہ ایک فیصلہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی مگر اس کے چہرے سے ایسا لگتا تھا کہ وہ فیصلہ ایک حفاظتی حصار ہے جس حصار میں اسے قید رہنا پڑے گا۔ ٹائلڈ آہستہ سے چلتی ہوئی بوجھل قدموں کے ساتھ مین گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

دوسرے دن ہم سب نے پکنک پر جانا تھا۔ ہم سب پکنک کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔ اپنے تصور میں کاشف اور ٹوبہ کو ملا چکا تھا اس میں مزید اضافہ کرتے ہوئے میں نے لکھا۔

ٹائلڈ ٹوبہ کو اس کی غلطی کا احساس دلا کر ایک طرف کوچل دی۔ سامنے سے اسے عاطف اپنی گاڑی میں آتا نظر آیا کیونکہ وہ سب کے ساتھ نہیں آیا تھا، عاطف نے گاڑی ٹائلڈ کے قریب آ کر روک لی۔ عاطف اپنی گاڑی کا فرنٹ دروازہ کھول دیتا ہے۔ ”چلیز ٹائلڈ کم ان“ عاطف نے ٹائلڈ کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ ٹائلڈ تھوڑا ہچکچاتی اپنے ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

ٹائلڈ ابھی غصے میں تھی ٹوبہ کی وجہ سے وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا ری ایکشن کیا ہوا ہے۔ ”ہیلو ٹائلڈ کیسی ہو؟“ عاطف نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

ٹائلڈ نے ایک نظر عاطف کو دیکھا اور پھر شیشے سے پار دیکھنے لگی اس نے عاطف کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

”تو کیا سوچا آپ نے کل کی باتوں کے بارے میں؟“ عاطف نے مقصد کی بات کہہ دی ٹائلڈ ابھی بھی خاموش تھی اور پھر کچھ سوچنے کے بعد وہ گویا ہوئی۔

”دیکھو عاطف!“ عاطف ہمد تن گوش ہو گیا جیسے اس کو یقین ہو چلا تھا کہ بات میرے ہی حق میں ہوگی۔ ”میں نہیں سمجھتی کہ محبت بھی کسی سے کی جائے، آج تک اس بارے میں میں نے کبھی نہیں سوچا، بس میری زندگی جس طرح گزر رہی تھی بہر حال میں خوش تھی مگر آج میں نے کاشف کی بے بسی اور ٹوبہ کی بے بسی دیکھی تو جان گئی کہ محبت کیا ہے، دو انہی لوگوں کا ایسے بندھن میں جڑ جانا جو احساس کے رشتے سے بنا ہوں، اس کا نام محبت ہے، میں نہیں چاہتی کہ کاشف کی طرح تم بھی بے بس ہو جاؤ اور پکار پکار کر کہو۔“ ٹائلڈ آنی لویو، ٹائلڈ آنی لویو۔“

محبت میں نا کاکی اکثر انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ وہ اپنے آپ سے بھی لاپرواہ بن جاتا ہے۔ چونکہ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں کہ کسی کی محبت کو ٹھکرا دوں بشرطیکہ اس میں خلوص اور سچائی ہو اب تک میں سمجھتی تھی کہ میری غربت اور سادگی کو دیکھ کر کون مجھے اپنا لے گا کون ایسا ہوگا جو میرے دکھ درد کا میا بنے گا۔ کون میرے زخموں پر مرہم رکھے گا مگر جس طرح تم نے مجھ سادہ اور غریب لڑکی پر دل پار دیا ہے اس سے تو یقین لگتا ہے کہ تمہاری محبت میں سچائی ہی سچائی ہے، خلوص ہی خلوص بھرا ہے، میں ساری رات تمہارے ہی بارے میں سوچتی رہی۔

عاطف میں ایک شرط پر تمہیں اپنے دل میں جگہ دے سکتی ہوں۔ ہماری یہ محبت رازز ہے گی۔ میری کچھ مجبوریاں ہیں جن سے ٹھکانا میرے لئے ممکن نہیں کبھی اکیلے میں ملاقات ہوئی تو ٹھیک ہے ورنہ نظروں کا ٹکراؤ ہی کافی ہے۔“ ٹائلڈ اپنے دل کی بات کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”میری شکستیں ٹائلڈ اتنے میری محبت کا بھرم رکھ لیا۔ ٹائلڈ میں تمہاری عزت پر کبھی آنچ نہیں آنے دوں گا، میں تمہاری مجبوریاں سمجھتا ہوں، ضرور میں تمہاری امیدوں پر پورا اتروں گا۔“ عاطف نے اپنے طور پر یقین دہانی کرائی کچھ دیر گاڑی میں خاموشی رہی انہیں اپنا گروپ آتا نظر آیا۔

”عاطف میرے خیال میں مجھے چلنا چاہئے اس سے پہلے کہ ہمیں کوئی دیکھ لے اور شک کی چادر پھیلائے۔“ اتنا کہہ کر ٹائلڈ گاڑی سے نکل کر ایک طرف کوچل دی۔

سارے اسٹوڈنٹس نے عاطف کو دیکھ لیا تھا اس لئے اس کی طرف بڑھ گئے، تب تک عاطف بھی گاڑی سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔ ”اوہ! عاطف صاحب۔“ میں نہیں لگتا تھا کہ تم بھی پکنک پر آؤ گے۔“ کئی لڑکوں کی آواز سنائی دی اور باری باری عاطف سے ملنے لگے۔ سب سے مل کر عاطف نے مٹھائی کا ڈیہ گاڑی کے لائٹ پر رکھ دیا جیسے پوری دکان خرید لایا ہو۔ ”واہ یہ

کس لئے؟“ سب نے مٹھائی لیتے ہوئے کہا۔ ”بس ویسے ہی میں نے سوچا دوستوں کے لئے کچھ لے چلوں۔“ یہ بات کہتے ہوئے اس نے در کھڑی ٹائلڈ کی طرف ایک نظر دیکھا جو ایک درخت سے ٹیک لگائے ایک ہیرو پر ہاتھوں کو باندھے بڑے اسٹائل سے کھڑی تھی۔

ٹائلڈ سمجھ گئی کہ یہ سب اہتمام کس لئے ہے اور پھر جواب میں وہ ہلکا سا سکرا دی۔ میں اپنی تحریر یہی پر ختم کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ جس منظر پر فلم ڈرامہ یا کوئی کہانی ختم کی جائے وہ منظر آنکھوں میں سا جاتا ہے۔ کاش! ایسا ہو۔

یہ بات لکھنا میں اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ میرا خیال ہے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں بس میں چاہتا ہوں کہ ایسا ہو جائے، یہ سب لکھ کر ایک سرسری نظر تحریر پر ڈالی اور ڈائری بند کر کے ٹیکل پر رکھ دی۔ اب میں سونا چاہتا تھا، میں ٹھکن سی محسوس کرنے لگا شاید ٹھکنے کی وجہ سے یا کوئی اور بات تھی! آنکھیں بند کئے میں بستر پر دراز ہو گیا۔ جلد ہی نیند کی دیوی مجھ پر مہرمان ہو گئی اور میں نیند کی آغوش میں ہر شے سے بیگانہ ہو گیا۔ ہر روز کی طرح مجھے ایسا لگا کہ میں سویا نہیں تھا بلکہ جاگ رہا ہوں اور کبھی کبھی ہی خوشبو مجھے مدھوش کر رہی تھی یہ خوشبو کسی کے آنے کی اطلاع تھی اور پھر ایسا ہی ہوا، وہ پھر روز کی طرح چلتی ہوئی میرے قریب آ رہی تھی، اس کے چلنے کا اسٹائل بڑا خوبصورت تھا۔ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اسی طرح میری طرف بڑھتی رہے اور میں اسے دیکھتا رہوں۔ وہ آ کر میرے قریب بیٹھ گئی۔ اتنا قریب کہ جب وہ منہ میری طرف کر کے سانس لیتی تو ہماری سانسوں کا تبادلہ ہونے لگتا، میں بھی کتنا عجیب ہوں میں اسے نہیں جانتا کہ وہ کون ہے کہاں سے آتی ہے؟ میرے پاس ہی کیوں آتی ہے۔ مجھے اپنی سانسوں کی ہوا دینے روز چلی آتی ہے میں اس کی سانسوں کی گری سے کچھلنے لگتا ہوں، بے خود سا ہو جاتا ہوں اور یہ خواہش میرے

من میں چلنے لگتی ہے۔

آج سانسوں کو سانسوں سے جھک جانے دو
آج ہونٹوں کو ہونٹوں سے ٹکرانے دو
دل ہے پیاسا نہ ترساؤ قطروں سے اب
آج بادل یہ کھل کر برس جانے دو
دوریوں میں جھپٹتے رہے رات دن
اب جو بلیں ہیں توحد سے گزر جانے دو

اس نے کل کی طرح آج بھی ڈائری کو اٹھالیا
اور وہ سب کچھ دھیمی آواز میں پڑھنے لگے جو میں لکھ کر
سویا تھا، کافی دیر وہ ڈائری پڑھتی رہی شاید پوری کہانی
پڑھنا چاہتی تھی، میں اسے اسی طرح تنکٹا رہا کہ اس
کے حسن میں کھوسا گیا تھا، میں اسے دیکھنا چاہتا تھا،
بہت دیر بہت دیر تک اس کے ہلتے ہوئے لیوں کو دیکھنا
چاہتا تھا، جب ایک انسان بات کرتا ہے تو اس کے
دونوں ہونٹ آپس میں ٹکراتے ہیں، بالکل ایسے ہی
اس کے ہلتے ہوئے ہونٹ میرے من میں رگڑ گھول
رہے تھے۔

”اوئے!“ اس نے اپنا مخصوص انداز اپنایا
شاید وہ کہانی پڑھ کر خم کر چکی تھی ”تو یہ حال احوال اتنا
ردائنگ کیوں لکھتا ہے اور طویل بھی، مختصر بھی تو لکھ سکتا
ہے ناں۔“

واقعی اس نے وہ بات کہہ ڈالی تھی جس کا میں
نے اپنی کہانی میں خاص خیال رکھا تھا کہ کوئی لکھ نہ
جائے۔ ”وہ جی!“ میں ہلکایا۔

”کیا جی بولو جی۔“ اس نے جی کی گردان
بنا ڈالی۔ شاید میرے ساتھ مذاق کر رہی تھی مگر اس کے
مذاق میں بھی پیار بھرا تھا۔

”وہ دراصل اصل زندگی میں بھی ایسا ہوتا ہے
ناں۔ اس لئے میں نے کہانی کو طویل دیا ہے۔“ میں
نے جواز پیش کیا۔

”اچھا تو یہ سب بھی ایسے ہی ہوگا جیسا تو نے
لکھا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تو لوگوں کے ساتھ کچھ زیادہ ہی
بھروسہ ہے۔ خیر چھوڑو! اب یہ بتاؤ کہ میری کہانی کب لکھ

رہے ہو۔“ اس نے پہلے کی طرح اپنی کہانی کا ذکر کر دیا
تھا مگر میں ابھی تک اس کی کہانی سے انجان تھا۔
”جی آپ کی کہانی؟ مگر میں تو کچھ بھی نہیں جانتا
۔“ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

”ہوں۔“ اس نے خاموش رہ کر میری بات کی
تصدیق کی۔ ”وہ دن بعد میری کہانی تمہارے سامنے
ہوگی، کل میں تم سے ملنے نہیں آؤں گی تم یکم پر جاؤ
گے ناں اس لئے تمک ہار کر سونا چاہو گے، میں نہیں
چاہتی کہ کل تمہارے آرام میں خلل ڈالوں۔“ اسے
میری جھکن کا بھی احساس تھا۔

یہ بات برحق ہے کہ جب دلوگوں میں احساس
کارشہ پیدا ہو جائے تو دودھت کا درجہ لے لیتا ہے۔ اسے
میرا احساس تھا، حقیقت میں، میں بھی اس سے محبت
کرنے لگا تھا۔

محبت کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نقد ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا
”اب سو جاؤ۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا

اس نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دیا شاید مجھے سلانا
چاہتی تھی اور پھر ایسا ہی ہوا میری آنکھوں کے سامنے
اندھیرا چھانے لگا۔ کچھ دیر میں م میں خود سے بھی بیگانہ
تھا شاید سچ معنوں میں سوچنا تھا۔

دوسرے دن صبح سویرے جلد ہی میری آنکھ کھل
گئی میں بستر پر دراز اور پر چھت کو گھور رہا تھا میں کچھ یاد
کرنا چاہ رہا تھا۔ ہاں یاد آیا اس رات دالی حسینہ
کو جو روزانہ مجھ سے ملنے چلی آتی ہے اس نے مجھے وہ
ڈائری دی تھی مگر اس کے باوجود ابھی تک مجھے اس چیز کا
اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ مجھ سے حقیقت میں ملتی ہے یا کہ
خواب میں۔ ایک بات جس طرح وہ مجھے ڈائری دے
گئی تھی اس سے تو یہ لگتا تھا کہ وہ حقیقت میں مجھ سے ملتی
ہے، دوسری بات اس کی موجودگی میں مجھے اپنے وجود کا
احساس نہیں رہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس کے تابع
ہوں اور وہ میری نیندوں پر قابض آ جاتی ہے۔ اس کی
موجودگی میں میں نے زندگی کا لطف نہیں اٹھایا تھا اس

سے تو یہ لگتا ہے کہ وہ مجھ سے خواب میں ملتی ہے کتنی ہی دیر، میں ایسی باتوں میں الجھا رہا اس کی ملاقات پر مجھے آج حیرت ہو رہی تھی۔

اتنے میں مجھے کاشف کی آواز سنائی دی جو آج مجھے لینے چلا آیا تھا اس کی آواز سن کر میں نے بستر کی جان چھوڑ دی روزمرہ کے معمولات سے فارغ ہو کر میں کاشف کے ساتھ کالج روانہ ہو گیا

کالج پہنچے تو ہر ایک کے چہرے کی خوشی دیدنی تھی کیونکہ ایسے مواقع روز درمیان آتے۔ اور پھر ایسے میں بہت سارے اسٹوڈنٹس کا یہ آخری سال شمار کیا جاتا ہے۔ کچھ تو اپنی مرضی سے کالج کو خیر آباد کہہ دیتے ہیں اور کچھ نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے کسی یونیورسٹی وغیرہ میں ایڈمیشن لینا ہوتا ہے۔

پکنک پارٹی پر جانے کے لئے کالج کی انتظامیہ نے ایک عدد بس کا انتظام کیا تھا باری باری سارے اسٹوڈنٹس بس میں سوار ہو گئے قریب تھا کہ بس رداگی کا الارم بجائی میں اور کاشف بھی اپنے گرد و نواح کا جائزہ لیتے ہوئے بس میں سوار ہو گئے جلد ہی بس اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوئی بس کے اندر خوب ہنگامہ مچا تھا بھی کوئی لڑکا گنگناٹے لگتا تو بھی کوئی کسی پر جملہ کس دیتا، جس سے تمام اسٹوڈنٹس کے قہقہے گونجنے لگتے، سفر خوب دلچسپ تھا، تقریباً چار گھنٹوں کے بعد ہماری بس اپنی منزل پر پہنچ گئی، تمام اسٹوڈنٹ باری باری نیچے اترنے لگے، جو بھی نیچے اترتا "واہ!" کی آواز ہمارے کانوں سے نکل کرانی یہ لفظ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کوئی خوشن واقعہ وقوع پذیر ہو جائے اپنی حیرت یا خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

"واہ کیا خوبصورت علاقہ ہے۔" یہ ٹوبیہ کی آواز بھی جو نیچے اترتے ہوئے کہہ گئی تھی۔ ٹوبیہ کی آواز سن کر کاشف بھی ہولے سے کہہ گیا۔ "واقعی کیا خوبصورت جگہ ہے۔"

"پہلے کچھ دیکھ تو لے کیا علاقہ ہے ایسے بھی بول دیا۔" میں نے کاشف کو متنبہ کیا۔

"تو نے سنا نہیں ٹوبیہ کیا کہہ رہی تھی جب اسے پسند آ گیا ہے تو مجھے کیوں نہیں آئے گا۔" ایک بار پھر کاشف نے اپنی محبت کا ثبوت پیش کیا۔

"اچھا مجنوں چل اب نیچے چلتے ہیں ہم بھی تو دیکھیں کہ کتنا خوبصورت علاقہ ہے۔" پھر ہم دونوں بھی بس سے باہر آ گئے۔

واقعی علاقے کو خوبصورتی کی واد دینی پڑی، ہماری آنکھیں وہ سارا علاقہ اپنے اندر جذب کرنے لگیں۔ کیا یہی خوب علاقہ تھا، ایسا علاقہ ایک رائٹر اور عاشق کی ضرورت ہوتا ہے، رائٹر میں خود تھا اور عاشق میرے پہلو میں کھڑا تھا۔ بالکل ویسا ہی علاقہ تھا جس کا تصور میرے دماغ میں موجود تھا۔ رنگ رنگ کے پھول کھل رہے تھے سرد ہوا کے جھوکے آپس میں کلزارا تھے۔ میں ابھی تک وادی کی منظر کشی میں لگا ہوا تھا میں نہیں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ کہ اچانک مجھے کاشف کی آواز سنائی دی کاشف کی نظر ضرور ٹوبیہ پر پڑ گئی جو زمین پر پڑی کچھ چیزوں کو سمیٹ رہی تھی میں نے دیکھا کہ کاشف ٹوبیہ کے ساتھ چیزوں کو سمیٹنے میں مدد کر رہا ہے حالانکہ یہ بات ٹوبیہ کو بالکل بھی پسند نہیں تھی مگر میں یہ سب سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کیوں چل رہا ہے ٹوبیہ چیزوں کو سمیٹ کر جانے لگی تو کاشف کی آواز سن کر اس کے بڑھتے قدم رک گئے اور پلٹ کر کاشف کو دیکھنے لگی۔

"جی جناب! فرمائیے۔" ٹوبیہ نے تاؤ میں آتے ہوئے کہا۔

"ٹوبیہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" کاشف کے لہجے میں قدرے ججک تھی۔

"ہاں تو پھر کہو! میں کس لئے رکی ہوں تمہاری شکل تو نہیں دیکھنی میں نے۔" ٹوبیہ کی باتوں سے اکتاہٹ جھلک رہی تھی اور وہ کلبوں پر ہاتھ رکھے کاشف کو گھورنے لگی۔

"ٹوبیہ! میں آخری بار تم سے دینی بات کہنا چاہتا ہوں جو میں کئی بار پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اس

امید کے ساتھ کہ ہو سکتا ہے اس پر سکون اور خوبصورت ماحول نے تمہارے اندر چاہت بھردی ہو۔ یہاں پر آ کر انسان کا من خوش ہونے لگتا ہے کچھ خواہشیں پھر سے سر اٹھاتی ہیں۔" کاشف یہ باتیں کرتے کرتے فضاؤں میں بھی گھور رہا تھا شاید وہ اس حسین منظر کی عکاسی کر رہا تھا۔ اور اگر ایسے ہی ماحول میں انسان کو کوئی بڑی خوشی میسر آ جائے تو یہ سب کچھ کتنا اچھا لگنے لگتا ہے۔ اور اگر ایسے ہی ماحول میں کوئی بڑا غم میسر آ جائے تو انسان ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ ٹوبیہ نے اس کی بات کو متضاد صورت میں پیش کیا۔ شاید وہ جان گئی تھی کہ کاشف صاحب کیا کہنے والے ہیں۔

"ٹوبیہ اب بھی میں تم سے وہی کہوں گا جو پچھلے کئی مہینوں سے کہتا چلا آیا ہوں۔" پھر کاشف نے وہ کہہ دیا جسے سن کر میں منہ کھولے حیرت کے سندر میں غوطہ زن ہو گیا! یہ کہتے ہوئے کاشف ٹوبیہ کے بہت قریب ہو گیا تھا، ٹوبیہ آنکھیں پھاڑے کبھی اسے گھورتی اور کبھی زمین کی طرف دیکھنے لگتی۔ اس دوران وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو مسل رہی تھی لگتا ہے ری ایکشن سخت ہو گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔

"تواخ!! کی آواز مجھے سنائی دی۔ ٹوبیہ نے کاشف کو پتھر مار دیا تھا، میری حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، یہ تو سب کچھ ایسا ہی چل رہا ہے جیسا کہ میں اپنی ڈائری میں لکھ چکا تھا اور پھر وہ سب باتیں ٹوبیہ نے کہہ سنائی تھیں جو میں لکھ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ کاشف گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر آئی لوہو کی صدائیں بلند کرتا، میں بھاگ کر بس میں داخل ہو گیا اور اسے بیگ سے وہ ڈائری نکال لایا۔ میں نے جلدی ڈائری کو کھولا اور اپنی لکھی ہوئی تحریر تلاش کرنے لگا۔ میں اپنی لکھی ہوئی تحریر اور موجودہ صورت حال کا موازنہ کرنا چاہتا تھا مگر یہ کیا جس صفحہ پر میں نے وہ تحریر لکھی تھی وہ صفحہ خالی تھا، یہاں تک کہ اس پر موجود لکیریں بھی مٹ چکی تھیں مجھے دہم لگا شاید اگلا صفحہ ہو مگر اگلے صفحہ پر لکھا ہوا تھا۔

کاشف نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لئے اسی اثناء میں میں نے کاشف کی طرف دیکھا تو واقعی اس کے دونوں ہاتھ اس کے چہرے پر موجود تھے۔ ٹوبیہ دور جاتی نظر آ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ کاشف زور زور سے پکارتا۔ "ٹوبیہ آئی لوہو! ٹوبیہ آئی لوہو!" تحریر کے مطابق مجھے اپنا رول ادا کرنا تھا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا میں کاشف کے قریب جانا ہی چاہتا تھا کہ مجھے کاشف کی آواز سنائی دی۔ "ٹوبیہ آئی لوہو!" نجانے وہ کوئی طاقت تھی کہ میں خود بخود کاشف کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ چکا تھا اور اسے دلاستہ دینے لگا مگر ایک بات جو میں نہیں لکھ پایا تھا کہ اس سب کچھ کے دوران میں حیرت کا مجسمہ بنا رہوں گا۔ دلاستہ کے اندر جو جو صلہ ہوتا ہے وہ میرے اندر موجود نہیں تھا، موجود تھا تو وہ اسرار کہ یہ سب کیا ہے، بالکل ویسا ہی ہو رہا ہے جو میں نے لکھا تھا اس سے بڑا اسرار کہ ڈائری سے تحریر کہاں چلی گئی؟

میرا دماغ اس طرح کی سوچوں میں الجھا ہوا تھا، واقعی بات حیران کن تھی جو کچھ ہوتا چلا گیا وہ مٹا چلا گیا میں ڈائری کو دوبارہ کھول کر دیکھتا مگر میں کاشف کو اٹھانا چاہتا تھا جو ابھی بھی سسک رہا تھا۔

میں کاشف کو لے کر ایک طرف کوچل دیا مگر کاشف نے میرے ساتھ آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اور میں اکیلا ہی آگے بڑھ گیا یہ کوئی انہونی طاقت تھی جو مجھے آگے لے کر بڑھ رہی تھی۔

باقی بھی سب کچھ ویسا ہی ہوا جو میں لکھ چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ٹوبیہ اور شاید آپس میں کچھ باتیں کر رہی تھیں، میں پھر سے ٹیک لگائے ان کی باتیں سننے لگا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ ٹوبیہ شرمندہ سی ایک طرف چل دی جہاں پر کاشف اکیلا بیٹھا تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد مجھے کاشف کی خوشی سے لبریز آواز سنائی دی۔

میں خوشی سے جھومنا چاہتا تھا مگر نجانے کیا سوچ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں، آنکھیں بند کر لینے سے انسان کا دماغ تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے کچھ بھی

دیکھنے سے قاصر ہوتا ہے مگر میں اس اندھیرے میں بھی کسی کو دیکھ سکتا تھا۔ یہ وہی جی جو روزانہ مجھ سے ملنے آتی تھی وہ فضا میں معلق کوئی پری لگ رہی تھی اور مسکراتے ہوئے مجھے دیکھنے لگی وہ اڑتی ہوئی میرے قریب آ کر اتر گئی میں بھی آنکھیں بند کئے اسے دیکھتا رہا کہ مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

”اوئے“ وہ اپنے مخصوص انداز کے ساتھ مجھ سے مخاطب تھی۔ ”آگے نہیں دیکھنا کیا۔ کہانی کا دوسرا سین ابھی بھی باقی ہے چل آ نکھیں کھول اور دیکھ کیا ہونے والا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ ایک طرف کو چل دی میں بھی اس کی طرف بڑھنا چاہتا تھا یہی سوچ کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ مگر آنکھیں کھولتے ہی اس کی جگہ مجھے شائد نظر آئی جو ایک طرف کو جا رہی تھی میں آنکھیں بند کر کے اسے دوبارہ دیکھنا چاہتا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں مگر اب کی بار وہ مجھے نظر نہ آئی مجبوراً آنکھیں کھولنی پڑی۔ ایک اور حیران کن منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

شائد عاطف کی گاڑی کے پاس کھڑی تھی اور گاڑی کا فرنٹ دروازہ کھلا ہوا تھا کہانی کا دوسرا سین چل رہا ہے یہی سوچ کر میں ڈائری کو کھولنے لگا کاشف کے متعلق لکھی گئی ساری تحریر منٹ چکی تھی اور شائد کی کہانی کا تھوڑا حصہ باقی تھا۔ مجھے سو فیصد یقین ہو چلا تھا کہ ایسا ہی ہوگا میں نے ڈائری کو بند کر دیا اور اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔

مجھے اس کی باتیں یاد آنے لگیں۔ ”اوئے تو کہانی اتنی روانگ کیوں لکھتا ہے اچھا تو پھر بے فکر ہو جا ایسا ہی ہوگا۔ مگر میری کہانی کب لکھو گے۔“ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا سب ایسا ہی ہو گیا تھا مگر وہ تحریریں میری ڈائری سے مٹ چکی تھیں وہ اپنی کہانی مجھ سے کیوں لکھوانا چاہتی ہے اسے کیا ضرورت پڑ گئی اس کی کہانی میں ایسا کیا ہے جو وہ لکھوانا چاہتی ہے کیا جو میں لکھوں گا وہ سب ایسے ہی ہوگا کہ حقیقت کا روپ بن کر سامنے آ جائے گا یا کوئی اور بات سامنے آئے

گی۔ ”کتنی ہی دیر میں انہی خیالوں میں الجھا رہا کہ مجھے اسٹوڈنٹ کا شور سنائی دیا۔ وہ سب عاطف کی گاڑی کے پاس موجود مٹھائی سے انصاف کر رہے تھے اور ایک طرف درخت سے ٹیک لگائے شائد مسکرا رہی تھی۔ میری کہانی اختتام پذیر ہوئی اور میں بھی اٹھ کر ان کی طرف چل دیا شاید کوئی گلاب جاسن میرے حصے میں بھی آ جائے۔۔۔۔۔

اب سب کچھ نارمل چلتا تھا دو لوگوں کو ملا کر مجھے ایسا لگنے لگا کہ ہر چہرے کی خوشی دیدنی ہے یہ بات کسی کے علم میں نہیں تھی کہ یہ سب کچھ میں دو دن پہلے سے جان لیا تھا اور اپنی ڈائری میں لکھ بھی چکا تھا۔ مگر وہ سب لکھا اب میرے پاس موجود نہیں تھا۔ میں کسی سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ سب کچھ میں نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا آگے جو کچھ ہونا تھا وہ میں نے لکھا ہی نہیں تھا۔ اگر لکھ دیتا تو شاید وہ بھی میری تحریر کا حصہ بن جاتا۔ مگر میں ابھی بھی بہت خوش تھا۔

واپسی پر بھی خوب ہنگامہ رہا۔ میرا دوست کاشف جو پینک پر دو آگے سے پہلے ادا تھا۔ اب اس کا چہرہ خوشی سے سرشار تھا وہ جھوم رہا تھا اور پھر شائد کی طرف دیکھا جو بس کی کھڑکی سے باہر خوبصورت مناظر کا نظارہ کر رہی تھی میں نے اس کے دل کی بات جان لی تھی کہ وہ کن خیالوں میں گم ہے اور پھر ہماری گاڑی ہینکولے بھرتی ہوئی واپسی کے لئے رواں دواں رہی۔

رات نو بجے میں اپنے ہاسٹل کے کمرے میں موجود تھا، ڈائری کے خالی اوراق میرے سامنے تھے، میں اپنی پینک پارٹی کی ساری کارگزاری لکھنا چاہتا تھا مگر جس پر اسرار طریقے سے میری نگاہیں ہوتی تحریر ڈائری سے مٹ گئی، اس سے یہ لگتا ہے کہ جو کچھ لکھنا چاہتا تھا وہ بھی مٹ جائے گا اور ویسے بھی پینک پر بیٹھ لوگوں کو میں پہلے ہی قلم بند کر چکا تھا یہ اور بات تھی کہ وہ سب کچھ میرے پاس موجود نہیں رہا اس میں خوشی کی بات یہ ہے کہ میری چاہت کے عین مطابق سب کچھ ہوا اور اس کے لئے مجھ سے میری تحریر چھین لی گئی مگر میں اپنے

دوست کاشف کی خوشی کے لئے اپنی ایسی سوچیں قربان کر سکتا ہوں کیا ہوا جو میری تحریر کا خراج مانگا گیا۔ کوئی بات نہیں! میں اس سارے واقعہ کو حقیقت کا روپ دے دوں گا اور پھر ایک ہٹ کہانی سامنے آئے گی۔

کتنی ہی دیر میں ایسی باتیں سوچتا رہا، بدن بھی ٹھکن سے غم حال تھا اس لئے نیند بھی اپنا اثر دکھانے لگی، میں سونا چاہتا تھا یہی سوچ کر میں نے ڈائری کو ایک طرف رکھا اور بستر پر دراز ہو گیا جلد ہی میری آنکھ لگ گئی اب مجھے کسی نے نہیں چکایا تھا اور ساری رات میں مٹھی نیند سوتا رہا۔

صبح کو میری آنکھ کھل گئی۔ آج کالج سے چھٹی تھی اس لئے میں ایسے ہی بستر پر دراز رہا مگر اب میں تازگی محسوس کر رہا تھا میرا جسم پرسکون تھا۔ مجھے ایسا لگنے لگا کہ کوئی رات بھر میرے پہلو میں بیٹھ کر مجھے سلانا رہا ہو۔ میرے ہونٹوں پر کبھی تیر گئی اور غالب کا یہ شعر میری زبان سے پھسلنے لگا۔

یار کو رات بھر پہلو میں بٹھا کر غالب جو لوگ کچھ نہیں کرتے وہ کمال کرتے ہیں

آج رات وہ نہیں آئی تھی۔ اپنے وعدے کے مطابق آنے والی رات میں وہ مجھے اپنی کہانی بھی سنانا چاہتی تھی تب آنے اس کی کہانی میں ایسا کیا تھا کہ وہ میری مدد لینا چاہتی تھی۔ پانچویں میرے ذریعے اپنی کہانی نشر کروانا چاہتی تھی۔ آج سارا دن گھر پر ہی گزارنا پڑا۔ کوئی کام وغیرہ بھی خاص نہیں تھا۔ ناول پڑھتے ہوئے اور اس کی یادوں میں دن گزر گیا چہل قدمی کے طور پر کچھ ناظم باہر گزرا، کھانا وغیرہ بھی باہر کھالیا تھا اس لئے نوبے میں اپنے ہاسٹل میں موجود تھا۔ چھپل رات وہ میرے پاس نہیں آئی تھی تو مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اس سے ملے برسوں گزر گئے۔ میں جلد از جلد اسے دیکھنا چاہتا تھا اور اسے دیکھنے کے لئے آنکھیں بند کرنا ضروری امر تھا۔ ورنہ تو میں ساری رات مایہ ہے آپ کی تصویر بتا رہا تھا اس سے ملنے کی چاہت میں، میں نے آنکھیں بند کر لیں اچانک سے

وہی مسکور کن خوشبو میرے تنقوں سے لگرائی اور میں نیند کی وادی میں اترتا چلا گیا۔

میں خود سے بگانہ ہو کر سوچتا تھا خواب میں بھی مجھے اس کی چاہت تھی مجھے ایسا لگتا کہ میں خود موجود نہیں ہوں۔ مگر میرا دماغ حاضر ہے جو دیکھ اور سن سکتا ہے۔ یہ سب نیند کا سماع تھا اور میرا دماغ اس تاریکی میں ٹھیک رہا تھا میں اسے ڈھونڈتا اور دیکھتا چاہتا تھا مگر اس اندھیرے میں وہ مجھے نظر نہ آئی۔

مگر پھر اچانک سے میرے سامنے ایک منظر ابھرنے لگا۔ سب کچھ دھندلا تھا مگر پھر بھی میں ٹھیک طرح سے دیکھ سکتا تھا میں نے دیکھا کہ ایک جوان لڑکی ایک بوڑھی عورت کو سہارا دے کر سڑک کے ایک طرف کو چل رہی تھی۔ میں اس لڑکی کو غور سے دیکھنے لگا میں اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا اور پھر جلد ہی میرے دماغ نے اس کا چہرہ محفوظ کر لیا، یہ وہی چلی بالکل وہی جو روزانہ مجھ سے ملنے آتی تھی مگر آج اس حالت میں یہ بات مجھے سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک بڑی سی گاڑی ان کے قریب آ کر رکتی ہے گاڑی سے ایک ہیڈ مسٹ سانو جوان (نوجوان بھی نہیں کہا جاسکتا 35-40 سال کے لگ بھگ ہوگا) اترتا ہے بہت جلد وہ ان کے پاس موجود تھا۔ یہ سب مجھے بہت تیزی سے دکھایا جا رہا تھا۔

”گیا میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ سکتا ہوں۔“ اس انہی کے لہجے میں ہمدردی تھی مگر نجانے ایسی کیا بات تھی کہ ہمدردی میں بھی مجھے وہ شیطان لگ رہا تھا۔

”نہیں جی شکریہ ہم چلے جائیں گے۔“ یہ اس لڑکی کی آواز تھی، دوبارہ اس آدمی کی آواز میرے کانوں سے لگرائی۔ ”دیکھیں آپ لوگوں نے کافی دور جانا ہے اور آپ کے ساتھ مرلیضہ بھی ہے یہ وہاں تک نہیں جا جائیں گی۔ آپ مجھ پر بھروسہ کریں میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔“ اس بار اس آدمی کے لہجے میں اہانت تھی اس لڑکی نے ایک نظر اس بوڑھی عورت کی

طرف دیکھا۔ جیسے کچھ پوچھنا چاہ رہی ہو۔ پھر میں نے ثابت کت میں یہ سب دیکھا کہ گاڑی میں وہ بیٹھی ہوئی تھی اور گاڑی ایک بوسیدہ سے مکان کے پاس آ کر رک گئی۔

وہ دونوں گاڑی سے باہر نکل گئیں۔ اس لڑکی نے گاڑی والے کو تنکر بھری نظروں سے دیکھا اور اپنے مکان کی طرف بڑھ گئی۔ ”ایکسوزی“ اس لڑکی نے پلٹ کر دیکھا تو اس آوی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی تب تک بوڑھی عورت اندر جا چکی تھی۔ ”لگتا ہے آپ کے مانی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔“ اس انہی نے اس بوسیدہ مکان پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

لڑکی اس کی بات سن کر خاموش ہی رہی۔ ”یہ رکھ لو میرا کارڈ، کبھی میری ضرورت پڑے تو ضرور فون کرنا۔“ لڑکی نے ڈرتے ہوئے کارڈ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ابھی وہ مڑنے ہی والی تھی کہ ایک بار پھر اس آوی کی آواز سنائی دی۔ ”یہ کچھ پیسے ہیں رکھ لو کام آئیں گے۔“ لڑکی جو بیٹے لکھوں سے ہی خوف زدہ تھی پیسے کیسے رکھ لیتی۔

”نہیں صاحب! ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔“ دوسری بار لڑکی گویا ہوئی تھی۔ ”کوئی بات نہیں رکھ لو جب آپ کے پاس ہو جائیں تو واپس کر دیتا۔“

اتنا کہہ کر اس آوی نے زبردستی وہ پیسے اس لڑکی کے ہاتھوں میں تھما دیے اور خود گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ لڑکی غربت سے تنگ آ کر وہ پیسے لینے پر مجبور تھی ورنہ خود داری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اور پھر بوڑھی ماں کا سوال تھا جو کہ بیمار تھی اس کی دوا دارو کے لئے پیسے چاہئے تھے وہ لڑکی بھی حیرت کدہ بنے اپنی جگہ پر ساکت تھی اور پھر اچانک سے منظر بدل گیا۔

وہی لڑکی ہاتھوں میں کتابیں تھامے کھیں جاری تھی شاید کالج پھر سے وہی گاڑی اس کے پاس آ کر رک گئی اس آوی نے گاڑی کا فرنٹ دروازہ

کھولتے ہوئے لڑکی کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ ”پلیز! کم ان لڑکی نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا اور پھر تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی چلنے لگی۔ ”لگتا ہے آپ کے مانی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔“ آوی نے رات والی بات دہرائی اور گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے بارے میں تو آج جان گئی ہوں گی میرا نام جشید ہے اس شہر کا بہت بڑا سیٹھ! سیٹھ جشید۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا۔

اس کے انداز گفتگو سے تکبر عیاں تھا۔ سیٹھ جشید مزید کچھ کہتا اس سے پہلے اس نے گاڑی کو بریک لگا دیے۔ ”میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ لڑکی خاموشی کی تصویر بنے گاڑی میں بیٹھی تھی اور بیٹھے سے پار دیکھ رہی تھی۔ ”اس کے لئے زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم کافی شاپ میں چل کر کافی بھی پیتے ہیں اور باتیں بھی ہو جائیں گی۔“

لڑکی اس کے کسی بات کا جواب نہیں دے پاری تھی۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ کافی شاپ میں جاتا نہیں جاتی مگر پھر! میں نے دیکھا کہ دونوں کافی شاپ میں بیٹھنے کافی پارہے تھے۔ اس آوی کی آواز سنائی دی لڑکی نظریں جھکائے اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ ”دیکھو شیرازیہ! گو یا کہ وہ اس کا نام بھی جانتا تھا اور جب سے وہ لڑکی مجھے ملی تھی مجھے بھی اس کا نام ابھی معلوم ہوا تھا۔“

”میں جانتا ہوں کہ تمہارے گھر کیو حالات ٹھیک نہیں۔ نہیں اور پھر ایسا کوئی گھر کا فرد بھی نہیں ہے جس کے سہارے جیا جائے۔ کب تک غربت کی پگھل میں پستی رہو گی میں چاہتا ہوں کہ تمہاری کچھ مدد کروں اس کے لئے زیادہ بہتر ہوگا کہ ہماری شادی ہو جائے۔“ شادی کا سن شیرازیہ اسے نظریں اٹھا کر دیکھنے لگی اس کی آنکھوں میں کوئی سوال تھا جو کہنا چاہتی تھی مگر۔ ”ہاں شیرازیہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اس طرح ہم دونوں میاں بیوی کے روپ میں رہیں گے تو کوئی انکی بھی نہیں اٹھائے گا۔“

شیرازیہ ابھی تک خاموش تھی اسے کوئی جواب نہیں دے پائی تھی۔ ”میں جانتا ہوں تم میری کسی بات کا جواب نہیں دے پاؤ گی۔ اس لئے سوچ کر جواب دینا میں تم سے پھر مل لوں گا۔“

یہ سب کچھ مجھے دکھایا گیا مگر پھر اچانک سے منظر بدل گیا۔ جس طرح کسی فلم کو فارورڈ کر کے دیکھا جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر جو میں ابھی تک دیکھ پایا تھا اس سے ساری ہسٹری میری کچھ میں آ رہی تھی۔

میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی دلہن کے لباس میں لمبوس راج و سچ کے پھولوں سے نکی ساج میں بیٹھی ہوئی ہے اس نے اپنے میں سیٹھ جشید اندر داخل ہوا دھیرے سے اس نے لڑکی کا گھونٹ اٹھایا تو وہ شرم سے سنسنے لگی۔ ”بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ وہ شیرازیہ کی تعریف کرتا ہے شیرازیہ آنکھیں اٹھا کر ایک نظر اسے دیکھتی ہے ”اوہ تمہاری تو آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔“ یہ سن کر شیرازیہ کے ہونٹوں پر تبسم بکھر گیا۔ پھر وہ اپنا سر شیرازیہ کی گود میں رکھ دیتا ہے ان دونوں میں چار بھری سرشاری ہونے لگتی ہے قربت کی پیاس بڑھنے لگتی ہے یہ سب کچھ میں دیکھ نہیں پا رہا تھا نجانے کیوں۔ رقابت کی آگ میرے اندر جلنے لگی اور میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

میں اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا یہ حقیقت ضرورت تھی جو گزر گئی مگر اس وقت تو وہ سب ایک خواب تھا۔ شیرازیہ تو یہ میری بے روز مجھ سے ملنے آتی ہے یہ حقیقت نہیں ہو سکتی میں اپنے آپ کو دلاسہ دینے لگا اور پھر کچھ سوچ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں مگر اب منظر یکسر بدل گیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ سیٹھ جشید ایک بڑے ریسٹورنٹ میں ایک دوسری خوبصورت دوشیزہ کے ساتھ بیٹھا اس کے من کو لکھانے کی کوشش کر رہا ہے وہ لڑکی بھی اس کی ہر بات سن کر خوشی سے جھومنے لگتی میں نے سنا کہ وہ کہہ رہا تھا۔ ”زائدہ تم میری زندگی میں

سب سے خوبصورت لڑکی ہو میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا اپنا سب کچھ تمہارے نام کروں گا۔ میں دل و جان سے تمہیں چاہتا ہوں بس ایک بار ہماری شادی ہو جائے پھر سب کچھ ہمارا ہوگا۔“

شادی کا سن کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

”یہ کیا اس کی تو شادی ہو چکی ہے شیرازیہ کے ساتھ یہ تو اس کے ساتھ دھوکا ہوگا۔“ مجھے اس انسان پر غصہ آئے لگا میں بے خود سا ہونے لگا قریب تھا کہ میں کچھ کر گزرتا! شاید میں نے کچھ اور بھی دیکھنا تھا۔

ایک دوسرا منظر میرے سامنے تھا۔ میں اس آوی کا نام نہیں لینا چاہتا، میں اس پر سخت برہم ہوں مجھے اس آوی کی آواز سنائی دی۔ جو شامل سمندر پر موجود کسی کو آوازیں لگا رہا تھا میں نے غور کیا تو مجھے ایک نام سنائی دیا۔ عذرا میں نے دیکھا کہ وہ پانی کی لہروں کے درمیان سے گزرتی ہوئی اس آوی کی طرف بڑھ رہی تھی لڑکی نے جنس پہنی ہوئی تھی اور اس کے بال کھلے تھے وہ بھی کافی حسین تھی میں نے دیکھا کہ اس آوی نے لڑکی کو اپنی بانہوں میں بھر لیا جیسے اس میں گہرے مراسم ہوں پھر وہی پیار و محبت کی باتیں جھوٹی محبت کی قسمیں ساتھ نبھانے کے وعدے میں یہ سب دیکھنا نہیں چاہتا تھا مگر پھر بھی مجھے وہ دکھایا جا رہا تھا شاید اس انسان کی شیطانییت سے پردہ فاش کیا جا رہا تھا مجھے یہ بات بتلائی گئی کہ یہ انسان نہیں۔ حسین دوشیزاؤں کی عزت کا لٹیرا ہے ابھی تک تو میں یہ سمجھ پایا تھا شاید آگے بھی کچھ ہو۔

میں نے دیکھا کہ وہ آوی اس ریسٹورنٹ والی لڑکی کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے اپنی بیوی شیرازیہ کو اپنا منتظر پاتا ہے مگر یہ کیا! شیرازیہ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی کو دیکھ کر رنگ رہ جاتی ہے جبکہ اس آوی کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ مجھے اس آوی کی آواز سنائی دی۔ ”شیرازیہ! ان سے ملو یہ ہیں زائدہ“ آوی نے لڑکی کے بارے میں بتایا چاہا شاید شیرازیہ بھی اس کے بارے میں جان لینا

چاہتی تھی۔ ”زائدہ کون زائدہ؟“ شیرازیہ نے معنی خیز نظروں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”شیرازیہ! میرے ساتھ بھلا کون ہو سکتی ہے اب تمہیں بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔“

”نہیں جشید مجھے بتاؤ کہ یہ لڑکی کون ہے؟ اور تمہارے بازو سے لگی کیوں کھڑی ہے؟“ اس بار شیرازیہ کے لہجے سے اس لڑکی کے لئے نفرت جھلک رہی تھی۔

آدی نے ایک نظر اس زائدہ نامی لڑکی کو دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ بتا دوں اور پھر پول پڑا۔ ”شیرازیہ مجھے نہیں پہلے بتادینا چاہئے تھا مگر میں نہیں سب کچھ پہلے ہی بتا دیتا تو تم میرے ہنسنے کی ذہنت بھی ناپتی تمہارا قرب حاصل کرنے کے لئے یہ سب کچھ میں نے کیا وہی بات اس لڑکی کی تو اب ہم دونوں میں بیوی ہیں۔“

”یہ سن کر شیرازیہ پر تو جیسے پہاڑ گرا پڑا“ کیا میں تمہاری بیوی نہیں ہوں۔“ شیرازیہ کی غم میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

”نہیں شیرازیہ تم میری بیوی تھی مگر اب نہیں ہو۔ اگر تم اس گھر میں رہنا چاہتی ہو تو اب تمہاری حیثیت نوکر کی سی ہوگی آگے تمہاری مرضی کہ تم کیا فیصلہ کرتی ہو۔“ آدی نے لاپرواہی سے کہا جیسے وہ شیرازیہ کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔

”ذلیل انسان میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ۔ میں اس عورت کو نہیں چھوڑوں گی جس نے مجھ سے میرا شوہر چھین لیا۔“ اتنا کہہ کر شیرازیہ اس لڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ مگر درمیان میں وہ شیطان کھڑا ہو گیا۔

”اگر اسے ہاتھ بھی لگایا تو ہاتھ کاٹ دوں گا۔“ آدی نے اس لڑکی کا دفاع کیا جو اس ساری سچے پیش سے سنبھلی ہوئی اس آدی کے پیچھے کھڑی تھی۔

شیرازیہ نے اس آدی کو دھکا دیا تو وہ ایک طرف کوچا گرا اور وہ خود اس لڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس لڑکی کی گردن پر ہاتھ رکھ لئے اور زور سے دبائے لگی قریب تھا کہ وہ لڑکی کو جان سے مار ڈالتی۔

میں نے دیکھا کہ وہ آدی خنجر لئے شیرازیہ کے پیچھے کھڑا ہے وہ خنجر شیرازیہ کی پیٹ میں اتار دینا چاہتا تھا۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا مگر میں کچھ نہیں کر پا رہا تھا بس دیکھ اور سن سکتا تھا اس نے خنجر کے پے در پے وار شیرازیہ پر کر ڈالے اور اسے خون میں نہلا دیا۔ شیرازیہ کے ہاتھوں کی گردن ڈھکی پڑ گئی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گئی وہ لڑکی اپنا سانس بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی میں یہ سب دیکھ نہیں پا رہا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے شیرازیہ کو قتل کر دیا گیا۔

میں نے دیکھا کہ ایک بوسیدہ سے کپڑوں میں بلبوس شخص اندر داخل ہوتا ہے چال و حال سے وہ ان کا نوکر ہی لگتا تھا اس نے لاش کو دیکھا تو حیرت کا مجسمہ بنے اس آدی کو سنبھلے لگا۔ جس کے ہاتھ میں ابھی بھی خنجر موجود تھا اور اس سے خون ٹپک رہا تھا۔ ”صاحب جی آپ نے ایک اور خون کروایا۔“ نوکر کی آواز سنائی د گویا کہ وہ پہلے بھی قتل کر چکا ہے۔

”ہاں میں نے ایک اور خون کر دیا ہے۔“ ایسا لگتا تھا کہ اس کا سانس پھولا ہوا ہے۔ ”تم جانتے ہونا لاش کا کیا کرنا ہے۔“

”جی صاحب یہی تاکہ اس کو بھی باقی لاشوں کی طرح گندے نالے میں ڈال دیا جائے۔“

”ویری گڈ! اب تم جاؤ لاش کو غائب کرنے کا بندوبست کرو۔“ وہ نوکر باہر کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ ابھی وہ نوکر دروازے تک بھی پہنچا تھا کہ اس آدی کی آواز سنائی دی۔ ”ٹھہرو!“ نوکر کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور وہ پلٹ کر اس آدی کو دیکھنے لگا۔ ”ایک لاش نہیں بلکہ دو لاشوں کو کھانے لگانا ہے۔“ یہ بات کہتے ہوئے اس آدی نے لڑکی کی طرف دیکھا تھا جو ابھی بھی سنبھلی ہوئی کھڑی تھی۔

میں نے دیکھا کہ وہ خنجر لئے اس لڑکی کی طرف بڑھنے لگا لڑکی خوف سے پیچھے ہٹنے لگی۔ اور اس سے رحم کی بھیک مانگنے لگی۔ ”جشید تم مجھے نہیں مار سکتے دیکھو میں تمہاری ہونے والی بیوی ہوں۔“

”ہاں زائدہ یہ بات درست ہے مگر کیا کروں سب کچھ تمہارے سامنے جو آ گیا ہے تمہیں مارنا میری مجبوری ہے۔“ اس آدی نے اپنا خنجر نکال رکھا۔

”دیکھو جشید میں کسی سے کچھ بھی نہیں کہوں گی خدا کے لئے مجھے مت مارو!“

”تمہیں زائدہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کسی سے کچھ بھی نہ کہو اور واقعی میں اگر تم کچھ نہ بھی کہو تو مجھے ہر وقت خوف لگا رہے گا اور میں خوف سے آزاد زندگی گزارنے کا عادی ہوں۔ زائدہ مجھے معاف کر دینا میں یہ سب کرنے پر مجبور ہوں۔“

تھوڑی ہی دیر بعد وہ لڑکی خون میں لت پت فرش پر پڑی تھی میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا مگر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا میں بے بسی کی تصویر بنے یہ سب کچھ دیکھتا رہا جب مزید مجھ سے دیکھنا نہ گیا تو میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں بند آنکھوں میں ظالم کا ظلم میرے دماغ میں گردش کر رہا تھا مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ دو لاشیں مجھ سے مدد مانگ رہی ہیں۔ اور میں بے حس سا ہو کر کھڑا ہوں کچھ سوچ کر میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

مگر اب میں نے اپنے آپ کو پولیس اسٹیشن میں پایا میں نے دیکھا کہ اس طرح کئی کیس انسپکٹر کے سامنے موجود تھے مگر وہ گہرے خیالوں میں قاتل کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا تھا اتنے میں ایک کانسٹیبل اندر داخل ہوا۔ ”آؤ اخترا! بناؤ کچھ پتہ چلا قاتل کا۔“

”نہیں سر، پہلے ایک ماہ سے ہم قاتل کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر لگتا ہے کچھ نکلنے کی طرح یہ دہشت بھی لگنے رہیں گے اور پھر مجبوراً ہمیں یہ کیس بھی بند کرنا پڑے گا۔“

اور پھر ایسا ہوا قاتل کا سراغ نہ لگنے کی وجہ سے کیس بند کر دیا گیا اور سیٹھ جشید کے خلاف گرفتاری تک کے وارنٹ جاری نہ ہو سکے۔

میں انسپکٹر جمال کو سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا مگر میں کچھ بھی نہیں بتا پایا کہ میری آنکھوں کے سامنے

اندھیرا چھا گیا اور میں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھا۔

اندھیرا چھٹا تو میں اپنے کمرے میں موجود تھا میں نے دیکھا کہ اسی اندھیرے سے وہ لڑکی برآمد ہوئی جو روز مجھ سے ملنے آتی تھی وہ اندھیرے کو ناکافی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی اور میں اپنے بستر پر درازا سے اپنی طرف آتا دیکھ رہا تھا بہت جلد وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی مگر اب وہ قدرے اوپر کھینچی ہوئی تھی وہ خاموشی سے سر جھکائے میرے پاس بیٹھی رہی۔ ”یہ ہے میری کہانی!“ اس بار اس نے اوپر نہیں کہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ غم میں ڈوبی ہوئی ہے اور غم میں ڈوبا انسان بے تکلفانہ گفتگو نہیں کر سکتا۔

”میں چاہتی ہوں کہ میرا قاتل کیفر کر داریک بچنے اور تم میری بے بسی کی کہانی لکھ کر نشر کرو۔ تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ میں کتنی مظلوم تھی اور سیٹھ جشید کے چہرے سے شیطانیت کا پردہ فاش ہو جائے۔ میں چاہتی تو کب کی سیٹھ جشید سے اپنی موت کا انتقام لے سکتی تھی۔ مگر میں یہ سب راز نہیں رکھنا چاہتی تھی یہی سوچ کر سب کچھ تمہیں دکھلایا تاکہ ایک مظلوم کی داستان تم لوگوں کو سناسکو۔ اور میں خود بھی اسے مارنا نہیں چاہتی تاکہ یہ لوگوں کے لئے اسرار ناہن جائے کہ سیٹھ جشید بلاوجہ اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا بلکہ پولیس کے ہاتھوں اسے سزائے مجرم ٹھہرا کر پھانسی کے پھندے تک پہنچانا ہے، ہاں اس سے پہلے ایک کام میں کرتی جاؤں گی وہ اپنی ساری جائیداد تمہارے نام کر دے گا، اب میں چلتی ہوں ہو سکتا ہے یہ ہماری آخری ملاقات ہو تم مجھ گئے ہو گے، تم نے کیا لکھنا ہے۔“

”مگر آپ یہ سب لکھوانا چاہتی ہیں یہ سب تو ویسے بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے اس کے اٹھنے سے پہلے سوال کر ڈالا۔

”اس سے پہلے جو ہوا تھا وہ کیوں لکھوایا گیا تھا۔“ اس نے حاضر جوابی سے کام لیا۔

اس کا اشارہ کا شاف اور شک کہ وہ بارے میں کبھی گئی تحریر کی طرف تھا۔ وہ میری بات کا جواب دے

کر باہر کوچل دی اور میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ کہیں باہر اندھیرے میں گم ہو گئی اور میں اسے الوداع بھی نہ کہہ سکا۔

میں غنودگی کی حالت میں تھا کہ میرے موبائل کی رنگ ٹون بجتے لگی اور میری آنکھ کھل گئی میں موبائل اٹھا کر نمبر دیکھنے لگا۔ کاشف کا نمبر تھا۔ میں نے کال اوکے کی۔ ”لو کاشف کیسے ہو؟“

”یار! منیر کہاں ہو؟ آج کالج کیوں نہیں آئے؟“ میری بات کا جواب دینے کی بجائے اپنا سوال کر ڈال۔

”ابھی ابھی آنکھ کھلی ہے بس تیار ہو کر نکلتا ہوں۔“ میں نے یہ بات ایسے کہہ دی جیسے میں ارد گرد سے بیگانہ تھا۔

”تیار ہو کر نکلتے ہو، تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا، ناظم دیکھا ہے۔“ یہ سن کر میں نے گھڑی کی طرف نظر ڈالی تو گھڑی ون کے بارہ بج رہی تھی ”اوہ! نو! بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔“ (سوری یار! یہ نہیں آج میں ابھی تک کیوں سوتا رہا۔)

”اوکے اوکے شام کو میں تم سے ملتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر کاشف نے کال کنکٹ کر دی۔

”میں ابھی تک سوتا رہا ہوں۔ رات کو بھی جلدی ہی سو گیا تھا اور خاصا تھکا ہوا بھی نہیں تھا۔“ میں خوب سے باتیں کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ مجھے سب کچھ یاد آنے لگا کہ کس طرح وہ میرے خواب میں موجود تھی اور یہ بھی کہ خواب میں، میں نے اور بھی بہت کچھ دیکھا ہے کتنے ہی سین منجھے دکھائے گئے وہ مجھے سب یاد تھے۔

میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور ٹائول لے کر واش روم چلا گیا فریش ہو کر کھانا کھانے باہر کوچل دیا میری واپسی تقریباً تین بجے ہوئی اب میں اپنے اندر تازگی محسوس کر رہا تھا۔ رات والا سارا خواب حقیقت بن کر میرے دماغ میں گھونٹنے لگا۔ اس نے میری تحریر کا خارج مانا تھا اور مجھے اس بات سے درپنچ نہیں تھا اس لئے میں نے ڈائری اٹھائی اور جس صفحہ پر وہ لڑکی اس

انسان کے سینے پر سوار تھی جیسا کہ اسے مارنا چاہ رہی تھی مجھے کچھ یاد پڑنے لگا کہ جیسے اس صفحہ پر اس کی کہانی لکھنی ہو۔ اور پھر یہی کچھ سوچ کر میں نے اس کہانی کے مجرم کو اس طرح کی غیر درایتی سے پچپایا۔

”سرا آپ سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔“ ملازم نے اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے اسے باہر لان میں بیٹھاؤ میں آتا ہوں۔“ تھوڑی ہی دیر بعد میں لان میں بیٹھا تھا۔ میں لان میں بیٹھا لان کا جائزہ لینے لگا میرے خیال میں ایک رائٹر میں وہ ساری خوبیاں ہونی چاہئیں جو ایک پرائیویٹ سرائرساں میں ہونی ہے کچھ ایسے ہی میں گرو و نواح کا جائزہ لینے لگا شاید لکھنے کے لئے کچھ اچھا مل جائے۔ اسے میں مجھے انسپکٹر جمال آتا نظر آیا میں

اوب کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہیلو سر کیسے ہیں۔“ میں نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔

”ہیلو! اچھے۔“ انہوں نے ہاتھ ملاتے ہوئے مجھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ ”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ انسپکٹر نے مجھے تعارف طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”سرا آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو جانتا ہوں۔ ویسے بھی ایک اسٹوڈنٹ کی کیا پہچانی ہو سکتی ہے سر میرا نام منیر ہے اور میں سیکنڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ ہوں۔“ میں نے اپنا مختصر سا تعارف کرایا۔

”ہوں! تو میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ انسپکٹر نے میرے آنے کی وجہ جاننا چاہی۔

”میں سر مجھے آپ کی خدمت میں جانے بلکہ یہ سمجھ لیں کہ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

”میری مدد کرنا چاہتے ہو، میں سمجھا نہیں۔“ انسپکٹر نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔

”میں سمجھا تا ہوں سر! جیسا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ کے علاقے میں ایسے کی قتل سانسے آئے جن

کا قاتل ابھی تک روپوش ہے۔ اور آپ بھی انتھک کوششوں کے باوجود قاتل کا سراغ لگانے میں ناکام رہے۔“

انسپکٹر جمال قتل کا سن کر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ”مگر تم یہ باتیں کیسے جانتے ہو؟“ انسپکٹر نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”سر میں ہی کیا بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ چھ ماہ سے لڑکیوں کا خون ہو رہا ہے اور ان کی لاشیں گندے نالے سے نکالی گئی ہیں۔“ میں نے ان کی حیرت دور کرنا چاہی۔

”دیکھو تم جو کوئی بھی ہو بات گھما پھرا کر کرنے کی بجائے سیدھے پوائنٹ پر آؤ۔“ انسپکٹر کا جھس بڑھتا جا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے سر! میں پوائنٹ پر آتا ہوں۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قاتل کون ہے؟“

”قاتل کون ہے؟ مگر تم قاتل کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟“

”سر! اگر میں آپ سے کہوں کہ میں مقتولوں کی روحوں سے مل چکا ہوں تو آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے اس لئے میں قاتل کے چہرے سے پردہ ہٹا دینا چاہتا ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم قاتل کو جانتے ہو تو پھر تمہارے خیال میں قاتل کون ہے؟“

”سر! میرا خیال نہیں ہے بلکہ یقین سے کہہ رہا ہوں۔ آپ سیدھے جھید کو تو جانتے ہی ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ سیدھے جھید قاتل؟“

”انسپکٹر نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اپنا خدا شفا کر لیا۔

شہر کا بہت بڑا سینٹر اور اٹرو سوخ کا مالک ہے اور تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ اس شہر میں اس کی بہت عزت ہے اور ایسے میں اس کے خلاف قتل کا مقدمہ دائر کرنا ہمارے لئے مشکل ہوگا۔“

واقعی انسپکٹر نے معقول بات کی تھی۔ ”سرا آپ کی مشکل، میں آسان بنا دیتا ہوں۔ یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ قاتل ثابت کرنے کے لئے آپ کو چشم دید گواہ کی ضرورت پڑے گی اور میں ایسے چشم دید گواہ کو جانتا ہوں، پہلے آپ اس پر ہاتھ ڈالنے سب کچھ کھل کر سامنے آ جائے گا۔“

”اچھا تو پھر چشم دید گواہ کون ہے؟“

”سر! چشم دید گواہ سیدھے جھید کا نوکر کر مو ہے۔ جس نے اپنی آنکھوں سے یہ سارے قتل ہوتے ہوئے دیکھے ہیں۔“

”مگر کر مونے ابھی تک کسی کو بتایا کیوں نہیں؟“

”سر پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک ملازم ہے اور اس دور میں ملازمت ملنا مشکل ہے دوسری بات یہ ہے کہ پیسوں کے لالچ میں انسان کچھ بھی کر گزرتا ہے، بس سیدھی بات ہے کہ اسے پیسے ملتے رہے اور وہ سیدھے جھید کے کارناموں پر پردہ ڈال رہا۔“

”دیکھو منیر! تمہاری باتوں میں مجھے کچھ سچائی نظر آتی ہے مگر پھر بھی یہ سب جھوٹ ثابت ہوا تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“ انسپکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا اور میں بھی کھڑا ہو گیا۔

”بہر حال منیر! ہم اپنی کارروائی شروع کرتے ہیں تم اپنا ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ دو، وہ ہو سکتا ہے ہمیں تمہاری ضرورت پڑ جائے۔“

ایڈریس اور فون نمبر لکھنے کے بعد! ”اچھا سر! میں چلا ہوں، اگر میری مدد کی ضرورت پڑے تو ضرور یاد کرنا۔“ میں نے تحریر پر سرسری نظر ڈالی کہ کچھ رہ تو نہیں گیا۔ ہاں یاد آیا اور پھر لکھنے لگا۔ پولیس نے سیدھے جھید کو حراست میں لے لیا ہے، علاقے میں کسے گئے تمام قتل ثابت ہو گئے کہ سیدھے جھید ہی ان کا قاتل تھا



خاموش موت

شائستہ سحر - راولپنڈی

انتقام کی آگ جب بھڑکی تو اس نے سب کچھ جلا کر فنا کر دیا، کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انتقام لینے والا اپنی ہی آگ میں جل کر خاکستر ہو جائے گا، مگر پھر بھی ایک ناقابل یقین واقعہ سامنے آیا۔

خود غرضی اور مفاد پرستی کی رو گئے کھڑے کرتی بہت ہی عبرتناک اور تحیر انگیز کہانی

کبھی کسی میں سوچتا ہوں یہ دولت یہ کتنا بڑا چیز ہے جو انسان کو رشتوں کی پیمائش بھلا دیتی ہے اور انسان انسانیت کے مقام سے گر کر حیوان بن جاتا ہے۔

ایسا ہی ایک واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسے کبھی فراموش نہ کر پایا۔ یہ آج سے کئی سال پہلے کی بات ہے اس وقت میں بی کام کا اسٹوڈنٹ تھا

ذہن میں کھلتی رہی تھی۔ وہ یہ کہ وصیت کے مطابق یہی باتیں سوچتا ہوں، میں اپنے ہاسٹل آگیا مگر جوہی میں نے دروازہ کھولا کچھ کاغذات میرے منتظر تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کاغذات کو اٹھالیا۔ جن میں واضح طور پر لکھا تھا۔ ”وصیت کے مطابق ساری جائیداد کا مالک منیر شیرازی ہے۔“ شیرازی کا نام بڑھ کر میں دھک سے رہ گیا کیونکہ میں منیر چوہدری ہوں اور تحریر میں بھی میں نے منیر چوہدری ہی لکھا تھا۔

یہی سوچ کر میں ڈائری کی طرف بڑھ گیا مگر ڈائری نیل پر موجود نہیں تھی، نیل پر ایک کاغذ کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا میں نے وہ کاغذ کاٹ کر اٹھالیا لکھا تھا۔

”منیر شیرازی مبارک ہو۔ سیٹھ جمشید اپنی ساری جائیداد تمہارے نام کر گیا ہے، میں اپنی چیز واپس لے لے جا رہی ہوں، ہو سکتے تو دوسری ڈائری لے لیتا، اس ڈائری کے اسرار کو تم نہیں جان پاؤ گے مگر پھر بھی اتنا تو تم جان گئے تھے کہ جو کچھ لکھا گیا وہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا اتنا ہی کافی ہے اور تم اتنے حیران کیوں ہو منیر شیرازی، اچھا نہیں لگا، تم نے جو کچھ میرے لئے لکھا اس کیلئے میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔“ شیرازی۔ وہ کاغذ کاٹ کر اڑھتے ہی اسے میں نے سینے سے لگا لیا میں ایک عجیب سی خوش محسوس کرنے لگا۔

وہ جاتے جاتے مجھے ایک نام دے گئی تھی اپنا ہم نام کر گئی تھی، میرے لئے اتنا ہی کافی تھا، میں آنکھیں موند کر اس کے تصور میں کھو گیا، میں سونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی اس شعر کی عملی تصویر بننا بیٹھا تھا۔

رات تیری یاد کا عالم کچھ اس طرح تھا فراز نیند آئی تو آنکھوں نے برامان لیا اور پھر ناچا جتے ہوئے بھی میں سونے کی تکام کوشش کرنے لگا۔ کیونکہ مجھے بازار سے ڈائری لینے جانا تھا۔



کچھ اور یاد آیا۔

وصیت کے مطابق سیٹھ جمشید نے اپنی ساری جائیداد منیر چوہدری کے نام کر دی، یہ بات میں نے شیرازی کی خواہش کے مطابق لکھی تھی ورنہ تو میں ضروری نہیں سمجھتا تھا کہ ایسے لکھا جائے۔

میں اپنے طور پر تحریر مکمل کر چکا تھا اس لئے ڈائری کو ایک طرف رکھ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ ٹوویک لیٹر!

اب یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں کہ انیکٹر جمال سے کب اور کیسے میری ملاقات ہوئی اور تحریر میں موجود ساری باتیں ہمارے درمیان ہوئیں ایک انجانی قوت مجھے یہ سب کرنے پر مجبور کرتی رہی اور میں نے اپنے تمام کردار نبھائے۔

میں اور میرا دوست کاشف کافی شاپ میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ میرے کانوں سے آواز نکل گئی۔

”ہیڈ لائنز کے ساتھ میں ہونیلا بنو! آج کی سنسنی خیز خبر! شہر میں ہونے والی لڑکیوں کے قتل سے پردہ فاش، قاتل اب پولیس کی حراست میں! آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ قاتل کوئی اور نہیں بلکہ شہر کی مشہور شخصیت سیٹھ جمشید ہے۔“ پھر سیٹھ جمشید کو دکھایا گیا اس سے پہلے میں نے اسے خواب میں دیکھا تھا

”سیٹھ جمشید پر تمام قتل ثابت ہو چکے ہیں، سیٹھ جمشید کا کہنا ہے کہ عورت میرا من بھلانے کے لئے ہے، کسی بھی عورت کو میں اپنے بستر کی زینت سمجھتا ہوں۔“ اتنے گندے نظریات رکھنے والا شخص کو کیفر کر دار تک پہنچانے والا انیکٹر جمال ہے لیکن انیکٹر جمال کا کہنا ہے کہ اس کیس کی دوبارہ اوپن کروانے والا ایک انجانی ہے جس نے قاتل تک پہنچنے کے لئے ہمیں چشم دید گواہ پیش کیا۔

یہ سب دیکھ کر میرے چہرے پر خوشی رقص کرنے لگی۔ ”یا منیر! یہ سیٹھ جمشید تو بڑا ہیچ آدمی نکلا۔“ سیٹھ جمشید کے متعلق ہی ہمارے درمیان باتیں ہوتی رہیں۔ باتوں کے دوران بھی ایک بات میرے

فروخت کروا اور اس رقم سے انہوں نے بیرون ملک جا کر کام کرنا مناسب سمجھا یہ ان کا ایک اچھا فیصلہ تھا اور یوں وہ وہی چلے گئے۔

بینک میں وہ کچھ رقم ہمارے گھریلوں خرچے اور دوسری ضروریات کے لئے جمع کر دئے گئے تھے۔ جو کئی ماہ تک ہمارے لئے کافی تھی۔

جس مکان میں ہم شفٹ ہوئے تھے وہ مکان ایک بوڑھی عورت کا تھا جس کی دو بیٹیاں تھیں وہ دونوں بیٹیاں شادی شدہ تھیں۔ اس کی ایک بیٹی اپنے شوہر کے ساتھ بیرون ملک سیٹھل تھی۔ اور وہ اس بہت بڑے گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ اس نے یہی بتایا تھا مگر جب ہم وہاں شفٹ ہوئے تب مجھے پتہ چلا کہ اس مکان میں ایک کمرہ ایسا بھی تھا جہاں ایک ورمیانی عمر کا لاغر شخص رہتا تھا۔ مالک مکان عورت کے بقول وہ اس کا دیور مراد تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ ”مراد نے کوئی ایسا چلہ کیا تھا جس کو کمانے کے دوران وہ ہوائی چیزوں سے خوف زدہ ہو کر بھاگ گیا تھا۔“

بس پھر اس کے بعد مراد کا جتنی توازن بگڑ گیا وہ پاگل تھا اور کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔

اس لئے مالک مکان جس کا نام رضیہ تھا اس نے ہمیں منع کیا تھا کہ ہم مراد نامی شخص سے دور رہیں۔

اس عورت نے مجھے اور میری والدہ کو مراد سے اس قدر خوف زدہ کر دیا تھا کہ میں اس کے کمرے کے نزدیک سے گزرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ اس کا کمرہ راہداری میں ہی موجود تھا۔

مراد خود بھی کم ہی اپنے کمرے سے نکلتا تھا۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے تین ماہ تک اس کی شکل دیکھی ہو۔ مراد کے متعلق قریبی دکان دار سے ہی سننے میں آیا تھا کہ وہ صرف اس دکان دار پر ہی بھروسہ کرتا ہے اور وہ دکان دار جو شاید اس کا کوئی قریبی دوست تھا اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتا تھا۔

مجھے آج بھی یاد ہے ان دنوں میرے

ایگزامز شروع ہوئے تھے میں پیپر کی تیاری کے لئے جیت پر گیا، ابھی میں جیت پر موجود چارپائی پر بیٹھنے لگا تھا کہ مجھے لگا میرے عقب میں کوئی موجود ہے۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو میرا اوپر کا سانس گویا اوپر ہی رہ گیا ہو۔

میرے سامنے انتہائی غلیظ جلیبہ میں ایک شخص کھڑا تھا۔ ٹیلی ٹیلی بنیان اور پٹی پڑانی شلواری پہنے اس کے جسم پر تہہ و تہہ میل جم چکی تھی۔ اس کے سر اور دائرہ کی بال جھاڑیوں کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے چند قدم فاصلے پر کھڑا تھا مگر اس کے جسم سے اٹھنے والے بدبودار مھکوں سے میرا سر پھٹنے لگا تھا۔

میں ایک دم اسے اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گیا اور وہ مجھے دیکھ کر یوں ڈر گیا اور پلٹ کر گریز بیوں کی طرف بھاگا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

یہ مراد سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس دن کے بعد میں نے کئی روز تک مراد کو دوبارہ نہ دیکھا اس کا دروازہ بند ہی رہتا تھا ایک طویل اور خوف ناک خاموشی کا راج اس کے کمرے پر طاری ہوتا تھا، وہ اپنے کمرے میں یوں بند رہتا تھا جیسے کوئی گنہگار قبر میں دفن ہو۔ میں اس سے خوف زدہ تھا۔ اس کے باوجود میرے دماغ میں کئی سوالات تھے ”یہ نہیں وہ کیسے اس کمرے میں پانگل تیار ہوتا ہے؟ نہ وہ کسی سے ملتا ہے اور نہ ہی بات کرتا ہے آخر وہ کیسے لوگوں سے کٹ کر رہا ہے؟ کیا اس کا دل نہیں گھبراتا اس کا دم نہیں گھٹتا اس غلامت میں؟“ ایسے بے شمار سوالات تھے جن کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔

وہ دن اتوار کا تھا، میں دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل کر دوپہر کے وقت گھر لوٹا تھا۔ اسی گھر میں نہیں تھیں، وہ مالک مکان رضیہ کے ساتھ اسی کے کسی رشتہ دار کی شادی میں گئی تھیں، اسی کی بہت گہری دوستی رضیہ کے ساتھ ہوئی تھی اس لئے وہ بازار وغیرہ اکٹھے ہی جایا کرتی تھیں۔ کھانا ای بنا کر گئی تھیں اور مکان تھا کہ وہ رات آٹھ بجے سے پہلے گھر نہیں لوٹیں گی۔

میں بیرونی گیٹ میں داخل ہوا، جیسے ہی میں راہ

واری سے گزرا مجھے اس بند کمرے میں کراہنے کی آواز سنائی دی آواز سن کر میں فوراً ٹھٹھک گیا اور شش و پنج میں مبتلا اس دروازے کو کچھ دیر تک گھورتا رہا مگر دوسری بار ابھرنے والی کراہنے کی آواز نے گویا مجھے سوچنے مجھنے سے عاری کر دیا اور میرے قدم غیر اداری طور پر اس کمرے کی طرف اٹھ گئے۔

میں نے جیسے ہی دروازہ کھولا بدبو کے کئی غلامت بھرے مھکوں نے میرا استقبال کیا، تاہم میں انہیں نظر انداز کر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ مراد دروازے کے قریب انتہائی بے تربیتی کے عالم میں زمین پر پڑا تھا میں نے فوراً اس کے لاغر وجود کو چھوا تو ایک جھک سا مجھے لگا۔ اس کو اتنا تیز بخار ہو رہا تھا کہ اس کا پورا وجود کسی انگارے کی طرح تپ رہا تھا۔

میں نے فوراً مراد کو سہارا دے کر زمین پر پڑی ہوئی کچلی چٹائی پر لٹا دیا وہ کچھ ہوش میں تھا اور مسلسل کراہ رہا تھا میرے گھر میں بخار کی کچھ گولیاں موجود تھیں میں فوراً بھاگا اور جلدی سے بخار کی گولیاں اور دو دھ کا گلاس لے آیا، مراد کو دو دھ کے ساتھ دو گولیاں دیں تو وہ سکون سے سو گیا تب میں اس کے بستر کے قریب ہی بیٹھ کر اس کے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے کمرے میں بوسیدہ بستر اور چند پرانے برتنوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا، میں کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھ گیا۔

رات ہوئی تو میں نے سوچا مراد کی خیریت دریافت کر لوں اس لئے میں اس کے کمرے میں گیا، آہستہ کی آواز سن کر وہ فوراً بیدار ہو گیا مگر فضاہت کی وجہ سے وہ اٹھ کر بیٹھ نہ سکا، مجھے دیکھ کر وہ چونکا ضرور تھا مگر وہ پھر کے وقت والا میرا سلوک اسے یاد تھا اس لئے وہ مانوس انداز سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے کھانے کا پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ میں فوراً بازار سے روٹیاں لے آیا ساکن گھر میں موجود تھا، وہ گرم کسے کے جب میں کھانے کے کراس کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا، میں کھانا اس کے قریب ہی رکھ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اس نے

کپکپاتے ہوئے لاغر ہاتھوں کے ساتھ میرے ہاتھ کو تھما اور پھوٹ پھوٹ کر رہنے لگا۔

میں سخت حیران ہوا کہ وہ کیوں ایسے رومل کا مظاہرہ کر رہا ہے تاہم اس کو کھانا کھلانے کے بعد میں وہاں سے اٹھ گیا اپنے کمرے میں آتے ہی میرے دماغ میں مزید کئی سوالات ابھرنے لگے۔

”مجھے مراد بالکل بے ضرر اور قابل رحم لگا تھا اس کا لاغر وجود اس قابل تھا ہی نہیں کہ وہ کسی کو نقصان پہنچا سکتا پھر رضیہ نے کیوں اس کو خطرناک پانگل کہا تھا؟“

کیا وہ نہیں چاہتی تھی کہ مراد کے قریب کوئی آئے؟

”وہ ایسا کیوں چاہتی تھی؟“ یہ باتیں میری سمجھ میں نہ آسکتیں۔ میری توقع کے مطابق ای رات نوبتے گھر لوٹیں وہ بہت تھکی ہوئی تھی اس لئے میں نے مراد کا ذکر کرتا ان سے مناسب نہ سمجھا۔ صبح جب میں کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا تب میں نے مراد کے متعلق ساری بات ای کو بتائی۔

میری ای ایک دم دل خاتون تھیں ان کو مراد پر ترس آ گیا انہوں نے مراد کے لئے بھی ناشتہ بنایا میں ناشتہ مراد کے کمرے میں رکھ کر چلا گیا، مراد جب سے کچھ نہ بولا بس منوں نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا تھا۔

یہ ایک رات کی بات ہے اس رات شدید طوفان آیا تھا بادل ہولناک آواز میں گرج رہے تھے اور شدید موسلا دھار بارش ہو رہی تھی ایسے میں دفعتاً مجھے جیت سے کسی کے چیختے چلانے کی آواز سنائی دی۔ میں اور ای بیک وقت گھبرا کر اپنے اپنے کمروں سے نکل کر صحن میں آ گئے میں فوراً دروازہ کھول کر چھت کی طرف بھاگا تو مجھے مراد چیخ و پکار کرتا ہوا وہاں دکھائی دیا۔ وہ ٹھیک طرح سے بول نہیں پارتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ آگے بڑھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

”کیا ہوا.....“ میں شدید بارش اور بادلوں کے شور میں چیختے ہوئے بولا۔

مراد بول نہیں پڑا تھا بس بچے کی طرف اشارہ کر رہا تھا جیسے اس کے کمرے میں کوئی ہو، میں نے مراد کو سہارا دیا اور اس کے کمرے کی طرف لے جانے کی نیت سے میز حیاں اترنے لگا۔ مراد اپنے کمرے میں نہیں جانا چاہتا تھا وہ بہت خوف زدہ تھا مگر یہ نہیں کیوں وہ مجھ پر اس حد تک بھروسہ کرنے لگا تھا کہ میرے سامنے انکار نہ کر پایا۔ میں اسے تھاہتے ہی نیچے اس کے کمرے میں لے آیا اس کا پورا وجود بھگ گیا تھا۔ میری ای بھی مراد کے کمرے میں آگئیں وہ کبل اور میرے کپڑوں کا ایک جوڑا لائی تھیں وہ بولیں۔ ”اس کے کپڑے تبدیل کرو اگر اسے لٹاؤ۔“ میں نے ایسے ہی کیا۔ جب میں دروازے سے نکلے لگا تو چونک گیا میرے سامنے مالک مکان رضہ چائے کی پیالی تھا سے کھڑی تھی وہ سرگوشی سے بولی۔ ”مجھے اس پائل سے ڈر لگتا ہے تب میں اسے دیکھنے نہیں آئی تم ایسا کرو یہ قبوہ اسے پلا دو بہت ٹھنڈ ہے اس کو سردی لگ گئی ہوگی۔“

میں نے فوراً پیالی کو پکڑا اور پھر مراد کے کمرے میں چلا آیا اس کے پاس بیٹھ کر میں نے اس کو قبوہ پلایا اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

وہ طوفانی رات بڑی لمبی اور وحشت بھری تھی یوں لگتا تھا جیسے وقت ختم سا گیا ہو۔ ایک ایک لمحہ کسی صدی کی طرح گزرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا کیسا عجیب وحشت بھرا احساس مگر اس تمام کیفیت کی وجہ مراد ہی تھا۔ میں ساری رات کروٹیں بدل بدل کر اس کے متعلق سوچتا رہا۔ ”کچھ تو تھا ایسا جو پوشیدہ تھا۔“

مراد کی جو حالت تھی، دل نہیں مانتا تھا کہ وہ کسی چلے میں اس حالت کا شکار ہوا تھا، میں تنہائی سے مراد کے معاملے کے متعلق سوچ رہا تھا اور فیصلہ کر چکا تھا کہ میں ضرور مراد کی گزشتہ زندگی سے پردہ اٹھاؤں گا۔“

مگر اگلے دن کا سورج گویا ہر بات کا اختتام بن کر طلوع ہوا تھا وہ گویا جس کا مجھے بھی اندازہ ہی نہ تھا۔ صبح رونے اور چیخ و پکار کی آواز سن کر میری

آنکھ کھلی، میں یہ نہیں کس وقت سویا تھا، رونے کی آواز سن کر میرا بے چین و ماغ فوراً بیدار ہو گیا۔ میں جلدی سے بیڈ سے اتر اور جھن میں آ گیا جہاں میری ای پہلے سے موجود تھیں ”کیا ہوا ای؟“ میں نے پریشانی سے پوچھا۔

”بیٹا مراد فوت ہو گیا ہے۔“

”کیا؟!!“ ای کی بات سن کر مجھے شدید غم کا جھکا لگا۔ میں مزید کچھ پوچھے بغیر فوراً اپنا حلیہ درست کر کے صورتحال کا جائزہ لینے باہر نکلا۔ مراد واقعی فوت ہو گیا۔

سننے میں یہی آیا تھا کہ رات کے کسی پہر وہ فوت ہوا تھا اس کی موت بڑی اچانک تھی، سب یہی سمجھ رہے تھے ”شدید سردی کی وجہ سے مراد کی موت واقع ہوئی ہے۔“ اور ان سب میں ایک میں بھی شامل تھا۔

مراد کفن میں ملبوس میرے سامنے چار پائی پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ آخری غسل کے بعد کہیں بہتر لگ رہا تھا وہ کسی اسرار لئے منوں مٹی تلے دفن ہونے جا رہا تھا اور میں حسرت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے سوائے افسوس کے کچھ نہ کر سکتا تھا اب سب کچھ ختم ہو چکا تھا وہ وجود ہی مٹ گیا تھا جو میرے لئے باعث محسوس تھا، اب میں مراد کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش کرتا بھی تو کس لئے؟ اس کا فائدہ کیا تھا؟

کیونکہ یہ سب کر کے مراد تو واپس آنے والا نہیں تھا۔ اسی لئے میں نے خاموشی اختیار کر لی مگر پھر عجیب صورت حال رہنے لگی۔ مراد کی بھانجی رضیہ کی حالت بہت حد تک ایب نارمل سی ہونے لگی تھی۔ وہ ساری ساری رات اونچی آواز میں گانے سننے رہتی یا اکثر کسی بے چین روح کی طرح بوہرا دھڑکتی رہتی تھی وہ اندر ہی اندر اندہ ناک پریشانی کا شکار تھی، وہ پریشانی کیا تھی یہ تو بس وہی جانتی تھی مگر اس کی ان حرکتوں کے سبب آس پاس رہنے والے لوگوں نے اس کے متعلق چہ گوشتیاں شروع کر دی تھیں کچھ کا خیال تھا کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے

کچھ اسے ناپسندیدہ لگا ہوں سے دیکھنے لگے تھے کہ وہ اس عمر میں ایسی حرکتیں کر رہی تھی۔

کچھ ہی دنوں میں اس کی بیٹی اور داماد اس کے گھر آ گئے پہلے میرا خیال تھا کہ وہ کچھ دن کے لئے آئے ہیں۔ مگر اب ان کا ارادہ رضیہ کے گھر مستقل رہنے کا لگتا تھا اس لئے اس کے داماد نے مجھے فوری طور پر گھر خالی کرنے کا کہہ دیا اور دس دن کی مہلت دی تاکہ میں کوئی اچھا گھر دیکھ سکوں۔

رضیہ نہیں چاہتی تھی کہ ہم وہاں سے جائیں مگر اپنے داماد سے تھوڑی بہت بحث کے بعد اس نے خاموشی اختیار کر لی، میں نے بہت جلد ایک اچھا مکان تلاش کر لیا اور اپنی ای کے ساتھ وہاں شفٹ ہو گیا۔ دو ماہ گزر گئے۔ میں بی کام میں اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا اور یونیورسٹی میں ایڈمیشن بھی سمجھ ل گیا اور میں نے اپنی تمام تر توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز کر دی۔

ایک شام ای نے مجھ سے رضیہ سے ملنے کا اصرار کیا تو میں ای کو رضیہ سے ملانے لے گیا، ابھی ہم دونوں راہ داری میں ہی داخل ہوئے تھے کہ راہداری میں واقع کمرے سے کسی کے کراہنے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ کمرہ بھی مرحوم مراد کا تھا۔

میں فوراً ای کے ساتھ دروازہ کھول کر اس کمرے میں داخل ہوا اور دنک رہ گیا میرے سامنے رضیہ انتہائی بری حالت میں چار پائی پر پڑی کراہ رہی تھی، وہ کئی دنوں کی تیار تھی یہ کہ اس کے پاس کوئی اس کی تیمارداری کے لئے بھی موجود نہ تھا۔

رضیہ مجھے اور میری ای کو دیکھ کر بہت حیران ہوئی اور رونے لگی میری ای نے اس کے قریب ہی بیٹھ کر اسے دلاسا دیا تو وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میرا آخری وقت قریب ہے، میں کتنی بد قسمت ہوں کہ اس وقت بالکل تنہا ہوں، میرے داماد نے مجھے اس بوسیدہ کمرے میں بیکار سامان کی طرح پھینک دیا ہے میری اولاد کو بھی میری کوئی پروا نہیں۔“

چھوٹا سا نے میری ای کا ہاتھ پکڑ لیا اور نجیف

آواز میں بولی۔ ”میں..... میں چاہتی تھی کہ کوئی تو ایسا ہو جس کے سامنے میں اپنی حالت زار بیان کر سکوں میں اپنے اندر کی گناہوں کا بوجھ چھپا بیٹے ہوئے ہوں۔“

وہ گویا پھٹ پڑی تھی ”میں نے قتل کئے ہیں ایک اپنے شوہر کا اور دوسرا اپنے پورے مراد کا“ رضیہ کے منہ سے یہ حیرت ناک انکشاف سن کر ای لرز گئیں اور پریشانی سے میری طرف دیکھنے لگیں، میں نے آنکھوں کے اشارے سے ان کو پرسکون رہنے کا کہا۔

”آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں آئی؟“ میں نے فوراً اس سے پوچھا تو وہ ناک لہجے میں بولی۔ ”میں آج اس دورا پر کھڑی ہوں جہاں موت کا خوف ختم ہو جاتا ہے۔ میرے سامنے ایک ہی خوف ہے اور وہ اپنے خدا کا خوف ہے، مجھے یقین ہے خدا مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ میں نے اس دنیا میں جو سفاکی اور ہر بریت کا کھیل کھیلا ہے وہ میری آخرت برباد کر دے گا۔“

میرا شوہر کمال اولاد زینہ نہ ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں فطری طور پر ایک جاسد اور جوانی عورت ہوں جو کبھی اپنے شوہر کو کسی دوسری عورت کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتی تھی، میں نے پہلے کمال کو بہت سمجھایا کہ وہ دوسری شادی نہ کرنے جب وہ کسی طرح بھی نہ مانا تو میں نے انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو زہر دے دیا، میں نے اس وقت ہر رشتہ بر لحاظ کو بھلا کر یہ سب کیا تھا، یہ بھی نہ سوچا کہ وہ میری بیٹیوں کا باپ ہے۔

مراد ان دنوں انگلینڈ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا بھائی کی موت کا سن کر وہ فوراً پاکستان آیا مگر اس نے آنے میں بہت دیر کر دی تھی جب وہ پاکستان پہنچا تو کمال کی تدفین ہو چکی تھی پورا خاندان جانتا تھا کہ کمال بیمار رہتا تھا اس لئے سب ہی کمال کی موت کو طبعی موت سمجھ رہے تھے مگر مراد کو یقین نہیں تھا اس نے پاکستان آتے ہی میرا جینا دوہر کر دیا، وہ میرے سامنے برلا کہتا تھا۔ ”میں نے کمال کو مارا ہے اور وہ لازمی اس



جناتی دنیا

ساجدہ راجا - ہندواں سرگودھا

اچانک کمرے میں موجود جن کو ایک بیٹ ہی کرخت ڈراٹونی اور خوفناک آواز سنائی دی، جسے سن کر وہ دھل گیا، پھر وہ خوفناک کریہہ صورت مخلوق کمرے میں وارد ہوگئی اور اس کی قہر برساتی نگاہوں سے.....

دو اور آئی مخلوق کی لرزائے والی خوفناک اور ڈراؤنی ناقابل یقین..... خونی روداد

صرف ایک ہی بیٹا تھا۔ ”زرباش“ جو اسے بہت متوں مرادوں کے بعد ملا تھا اور اسے بہت پیارا تھا اس کی ہر جائز بات ضرور پوری ہوتی تھی۔

لیکن گوباش اپنے اصول کا بہت پکا تھا، جہاں بات اصول کی آتی وہ کسی صورت پیچھے نہیں ہٹتا تھا یہی بات تھی کہ زرباش اس کا بہت لاڈلا ہونے کے باوجود گبڑا ہوا ہرگز نہ تھا اور نہ ہی اسے اس بات پر غور تھا کہ

”بابا مجھے ایک بار انسانی دنیا میں جانے کی اجازت دے دیں۔ مجھے بڑا شوق ہے انسانوں کو دیکھنے اور ان کے ساتھ رہنے کا۔“ زرباش نے اپنے والد گوباش سے التجائیہ لہجے میں کہا لیکن وہ کسی صورت ماننے پر تیار نہیں تھا۔

ان کا تعلق قبیلہ جنات سے تھا اور وہ مسلمان جنات تھے گوباش عمر رسیدہ اور قبیلے کا سردار جن تھا اس کا

بڑا اور چیت کی طرف بھاگ گیا، میں پریشانی کے عالم میں تھوڑی دیر تک وہاں کھڑی رہی پھر موقع دیکھ کر فوراً اپنے پورشن میں آگئی پھر میں نے قبوہ بنایا اور اس میں زہر ڈال کر تھیں وہ بیانی پکڑائی، مجھے یقین تھا کہ مراد تم پر اعتبار کرنے لگا تھا اس لئے وہ قبوہ پی لے گا اور وہی ہوا، وہ قبوہ پی کر مر گیا۔ میں بڑی گناہ گار ہوں مجھے پتہ ہے آپ دونوں بھی مجھ سے یہ سب سننے کے بعد نفرت کر دو گے۔“

میں حیرت کے عالم میں اس کے منہ سے وہ تمام روداد سن رہا تھا، وہ درود کرتا رہی تھی کہ ”جب سے مراد فوت ہوا ہے، اس کی روح اس گھر میں منڈلاتی رہتی ہے وہ میرے بستر کے ارد گرد گھن پینے چکر لگا رہتا ہے، میں اسے دیکھ کر چیخ چلاتی ہوں، تب میرے داماد نے تنگ آ کر مجھے اس کمرے میں منتقل کروایا ہے، وہ مجھے پاگل سمجھتا ہے مگر میں سچ بتا رہی ہوں مراد اس گھر سے گیا نہیں بلکہ میرے بدترین اعمالوں کی سزا سن کر میرے آس پاس رہتا ہے۔“

وہ اپنے بال پکڑ کر نوچنے لگی ”میں کیا کروں میرے خدایا! میں مرکیوں نہیں جاتی، مجھے نجات دے اس تکلیف سے“ وہ بیانی آواز میں مسلسل چیخ رہی تھی اور میری امی اسے سنبھالنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

میں اپنی جگہ ساکت کسی گھر سے صدمے میں غرق تھا، رضیہ نے میرے ہاتھ سے مراد کو زہر زیا تھا، وہ بے چارہ تو مجھ پر اعتبار کرنے لگا تھا۔

اس سارے خوریز واقعہ میں میرا کوئی قصور نہ تھا مگر میں پھر بھی خود کو گناہ گار سمجھتا ہوں، ہر وعائیں اپنے رب سے اپنے لئے بخشش کی دعا مانگتا ہوں۔ رضیہ تو کچھ ہی دنوں بعد مر گئی مگر میں آج تک اس خلس سے آزاد نہ ہو پایا اور نہ ہی میں مراد کی موت کو کسی فراموش کر سکتا ہوں۔



سارے معاملے کی تفتیش کروائے گا۔“

میں نے اس کے سامنے بالکل بھی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ کیا مگر میں مجرم تھی اور دل ہی دل میں مراد کی دھمکی سے خوف زدہ ہوئی اسے ایک دم راستے سے ہٹانے سے مجھ پر شک بھی کیا جاسکتا تھا۔

اس لئے میں ایک عقلی علم کرنے والے عامل کے پاس پہنچ گئی اور اس کو منہ مانتے پیسے دے کر مراد پر ایسا سٹفل کا علم کروایا کہ وہ چپے حواسوں میں ہی نہ رہا، وہ غلاظت کو پسند کرنے لگا اور غلاظت زدہ حلیہ میں سب سے الگ تھلگ رہنے لگا۔

میں نے خاندان میں یہی مشہور کر دیا کہ وہ چلہ میں کوتاہی کی وجہ سے اس حالت کا شکار ہوا ہے۔ ”مگر اس کی حالت کی ذمہ دار صرف اور صرف میں تھی۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ مراد بد حواس ہو کر بہت جلد مر جائے گا یا وہ خودکشی کر لے گا مگر ایسا نہ ہو سکا۔

بد حواس ہونے کے باوجود اس کی مجھ سے نفرت برقرار رہی تھی وہ کسی سے کچھ نہیں کہتا تھا زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی بند رہتا تھا یہی میرے حق میں بہتر تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کوئی امی اس کے قریب آئے اس لئے مراد کے متعلق لوگوں میں ایسی ایسی باتیں مشہور کر دی تھیں کہ جو بھی سنا مراد سے خوف زدہ ہو جاتا۔

مراد اس مکان کے آدھے حصے کا مالک تھا اس کے علاوہ اس کی زمینیں بھی تھیں میں چاہتی تھی کہ وہ نمر جائے اور اس کی جائیداد میرے اور میری بیٹیوں کے حصے میں آجائے اس لئے میں نے ایک خطرناک منصوبہ بنایا۔

مراد کو قتل کرنے کا، اس طوفانی رات میں جب مراد بیمار تھا تم مراد کو کھانا دے کر سونے چلے گئے تب میں دے قدموں نکلے لے کر مراد کے کمرے میں پہنچی میرا ارادہ یہی تھا کہ اس نیکیے کو مراد کے منہ پر رکھ کر اس کا سانس بند کر دوں گی مگر میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی اور مراد کے قریب پہنچی تو وہ بیدار ہو گیا بلکہ کی گرج چمک میں اس نے مجھے پہچان لیا اور خوف زدہ ہو کر چیخ

وہ سردار کا بیٹا ہے۔

ہر چند وہ نہایت شرارتی کھانڈر اور من موچی قسم کا نوجوان جن تھا لیکن اس کی کسی عادت میں بھی دوسروں کا نقصان نہیں تھا بلکہ وہ ہر ممکن طریقے سے مصیبت زدوں کی مدد کرتا تھا قبیلے کا ہر جن اس سے خوش تھا اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتا تھا۔

زرباش ہر وقت خوش رہتا اور اپنی شرارتوں سے دوسروں کو خوش رکھتا تھا پھر اس نے اپنے بزرگوں اور قبیلے کے دوسرے جنات سے انسانوں کے بارے میں سنا تو اس کے دل میں بھی انسانی دنیا کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی جس کا اظہار اس نے اپنے والد کو زرباش سے کیا کیونکہ سردار کی اجازت کے بغیر کوئی بھی جن انسانی دنیا میں نہیں جاسکتا تھا اگر وہ ایسا کرتے تو ان کو اس کی بہت بھیا تک سزا ملتی تھی۔ زرباش کو اس بات کی توقع بھی کہ اسے اتنی جلدی اجازت نہیں ملے گی لیکن اس نے بہت نہ ہاری۔

”بابا مان جائیں ناں۔ میں وہاں جا کر انسانوں کو صرف دیکھنا اور ان کی عاقبت کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں مان جائے پلیر؟“

اس کی اس بات پر گوباش نے خشکیں دکھائیں۔ ”سے گھور اور بولا۔“ یہ پلیر وغیرہ کے الفاظ تم نے کہاں سے سیکھ لئے؟“

اس کے سوال پر زرباش گڑبڑا کر وضاحت کی۔ ”وہ بابا۔۔۔۔۔ دراصل۔۔۔۔۔ مجھے کھان نے بتایا ہے کہ انسانی دنیا میں انسان ہر بات پر پلیر، پلیر! کارنا لگائے رکھتے ہیں اس لئے میری زبان پر بھی۔۔۔۔۔“ زرباش نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

ہماری دنیا میں مداخلت نہیں کی تو ہم کیوں ان کو تک کریں ان کی زندگی میں مداخلت کریں؟ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کی کچھ حدود بتائی ہیں جن سے نکلنے کا انہیں خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم انسانی دنیا میں جا کر وہاں کچھ غلط کرو جس کی تمہیں سزا ملے۔ تم میرے اکلوتے بیٹھے ہو۔ میں کبھی تمہیں کھونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ کہہ کر گوباش خاموش ہو گیا لیکن اس کی آنکھوں کی نمی نے اس کے دل کی حالت کی وضاحت کر دی۔

زرباش نے لاڈ سے باپ کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں اور بولا۔ ”بابا کیا آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں؟“ بابا آپ کی تربیت کبھی مجھے کچھ غلط نہیں کرنے دے گی اور میں آدم زراؤں کا ذہن تو نہیں ہوں جو میں کچھ ایسا کروں گا۔ آپ مجھ پر یقین رکھیں۔ بالکل میں کچھ بھی غلط نہیں کروں گا۔ پلیر! بابا پلیر!“

گوباش نے سرزنش کرنے والی آنکھوں سے دیکھا تو زرباش گڑبڑا کر خاموش ہو گیا پھر دونوں باپ بیٹے کی ہنسی نے پر سکوت فضا میں ایک ظلم بھیر دیا۔ ”ٹھیک ہے بیٹا! میں تمہیں وہاں جانے کی اجازت تو دے رہا ہوں لیکن وعدہ کرو کہ وہاں بے گناہ اور معصوم لوگوں کو تک نہیں کرو گے اور مظلوموں کو جہاں تمہاری ضرورت ہوئی تو ضرور مدد کرو گے۔“ گوباش نے زرباش کو جانے کی اجازت دی تو وہ خوش سے پاگل ہونے لگا۔

”بابا بہت بہت شکریہ۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ بالکل وہی کروں گا جیسا آپ نے کہا ہے۔“

”لیکن بیٹا! ابھی تو تم انسانوں میں گئے بھی نہیں اور ان کی اتنی باتیں تم نے اپنی ہی اگر ان کے پاس چلے گئے تو یہ نہیں اپنے طور طریقے بالکل بھول ہی نہ جاؤ۔“ گوباش نے زرباش کے ”ٹھیک پڑا“ کہنے پر ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو زرباش کی ہنسی چھوٹ گئی۔۔۔۔۔ زرباش انسانی دنیا میں آیا تو حیران ہو گیا اس

نے خواب میں بھی اس طرح کی چیزیں نہیں دیکھی تھیں۔ بڑی بڑی آسمان کو چھوئی عمارتیں ٹریفک کا اڑوہام۔ لوگوں کا ہجوم۔ غرض ہر چیز اسے حیران کئے دے رہی تھی وہ ابھی کھڑا رو کر دکا جائزہ لے رہا تھا کہ اس کی نظر لوگوں کے زیادہ ہجوم پر پڑی وہ اس ہجوم کی طرف بڑھ گیا اس وقت وہ انسانی شکل میں ایک خوبصورت نوجوان کے روپ میں تھا قریب جا کر اسے پیٹ چلا کہ وہ بارات تھی جو روانہ ہونے کے لئے تیار تھی شادی بارات کا مطلب تو وہ بہر حال جانتا تھا۔ دولہا گھوڑے کے قریب اس پر چڑھنے کے لئے پرتول رہا تھا جب زرباش گھوڑے کے سامنے جا کھڑا ہوا پھر گھوڑے کی نظر زرباش پر پڑی تو وہ بدگیا کیونکہ جانور جنوں کی موجودگی فوراً محسوس کر لیتے ہیں گھوڑے کا بدگنا تھا کہ دولہا جو گھوڑے پر چڑھنے کے لئے چھلانگ لگا چاہتا دوسری طرف زمین پر جا گرا۔

سب لوگوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر انہوں نے گھوڑے کو قاپ کیا اور دو لمبے کو اس پر سوار کر دیا۔ زرباش اس وقت تک گھوڑے کے سامنے سے ہٹ چکا تھا اس لئے گھوڑے نے پھر کوئی مزاحمت نہیں کی۔ بارات پیدل ہی روانہ ہوئی، زرباش بھی ساتھ ساتھ تھا کسی کی توجہ اس کی طرف نہیں گئی بھلا اتنی بھیڑ میں کون اس پر توجہ دیتا اور وہ بے بسی وہ انسانی شکل میں تھا۔

سفر زیادہ طویل نہیں تھا وہ بہت جلد ہی دہلیں کے گھر پہنچ گئے ساری رسموں کو اس نے بڑے غور اور دل چسپی سے دیکھا پھر کھانے کے وقت اس نے خوب ہیٹ بھر کر کھایا۔ بے چارے ویلز بھی حیران تھے کہ شکل سے معصوم نظر آنے والا نوجوان اتنا خوش خوراک تھا بلکہ خوش خوراک سے بھی کچھ آگے۔

پہاڑی علاقے میں پہنچ کر وہ معصوم ہو گیا قدرت کے حسین نظارے دل موہ رہے تھے۔ اتنی خوبصورتی اس نے کہاں دیکھی تھی مانا کہ ان کی اپنی دنیا بھی کافی حسین تھی لیکن جو دل کشی یہاں تھی وہ اس نے کہیں نہیں دیکھی تھی عدا کی پاس جا کر وہ بیٹھ گیا ندی سبک

رو سے بہتی ہوئی دیکھنے والوں کو سحر کر رہی تھی۔ پانی اتنا شفاف تھا کہ ندی کی تہ تک ہر چیز نظر آ رہی تھی زرباش کا دل بے اختیار چاہا کہ وہ ندی کے صغاب شفاف پانی میں کود جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنے سے اس کی جان جانے کا بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔

جن چونکہ آگ سے بنے ہوتے ہیں اس لئے پانی ان کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ان کی اپنی دنیا میں بھی پانی تھا لیکن وہ اس پانی سے اس لئے مختلف تھا کہ اس میں نہانے یا اسے پینے سے انہیں کوئی نقصان نہیں ہوتا تھا۔ ہر مخلوق کی اپنی کچھ حدود ہوتی ہیں جنہیں بہر حال انہیں پورا کرنا ہوتا ہے۔

زرباش غلطی باندھے ندی کے پانی پر نظر پڑا۔ ندی کی تہ شفاف پانی میں واضح تھی اور اسی تہ میں زرباش کو کچھ ایسا نظر آیا جس سے وہ چونک پڑا۔

☆.....☆.....☆

”گوما تم جانے ہو۔ مجھے جنات سے کتنی نفرت ہے میرا دل چاہتا ہے میں انہیں تمہیں نہیں کروں۔ وہ ہر کام نہیں جو ہم فطرت کے خلاف کرتے ہیں روڑے اٹکاتے ہیں خاص کر گوباش نامی وہ جن۔ جسے جنات کے قبیلے کی سرداری ملی ہے وہ بہت زیادہ مداخلت کر رہا ہے اس کا کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا پڑے گا ورنہ وہ ضرور ہمیں تمہیں نہیں کر دے گا۔“ گوما کے سردار نے اسے مخاطب کیا۔

وہ ایک ایسی مخلوق سے تعلق رکھتے تھے جو نہ انسان تھے نہ جنات، بلکہ وہ ان دونوں کے خلاف تھے ان کی ہیئت اتنی خوف ناک تھی انسان تو انسان جنات بھی حیران اور خوف زدہ ہو جاتے تھے۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سردار۔۔۔۔۔ اب کیا حکم ہے؟“ گومانے مودبانہ لہجے میں سردار کو مخاطب کیا تو جواباً وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بولا۔ ”انہیں یک مشت ختم کرنا ناممکن ہے۔ ہمیں

کچھ ایسا سوچنا ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لالھی بھی نہ ہوئے۔“

”تم ایسا کرو خود بھی اور کچھ دوسروں کو بھی لے کر جنات تو م پر نظر رکھو اور جیسے ہی موقع ملے سردار گوباش کے پاس جواگٹھی ہے وہ چرائی ہے اور مجھے لاکروینی ہے۔“

”لیکن اس سے کیا ہوگا سردار.....؟“ گومانے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”تم شاید نہیں جانتے کہ اس انگوٹھی کی خاص بات یہ ہے کہ جب تک جنات کی شادی کے وقت وہ انگوٹھی موجود نہ ہو اس وقت تک شادی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ جس طرح مسلمانوں میں قاضی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا اسی طرح جنات میں اس انگوٹھی کی غیر موجودگی میں نکاح واقع نہیں ہوتا اور تم تو جانتے ہو مسلمان جنات ہو یا آدم زاد..... غلط طریقے سے عورت سے تعلقات قائم نہیں کرتے۔

اگر وہ انگوٹھی غائب ہو جائے تو وہ شادیاں نہیں کر سکیں گے اور شادی نہیں ہوگی تو لازمی بات ہے بچے بھی پیدا نہیں ہوں گے اس طرح جو بوڑھے جنات ہیں وہ آہستہ آہستہ مرتے رہیں گے چونکہ بچے پیدا نہیں ہوں گے تو آہستہ آہستہ جنات کا وجود ختم ہو جائے گا ہمیں خود کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔“ سردار نے گومان کو اپنا منصوبہ بتایا تو وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔

”واہ سردار..... کمال کرو یا..... اتنا اعلیٰ منصوبہ صرف آپ ہی بنا سکتے ہیں۔“ گومانے خوشامد انداز اختیار کیا جبکہ سردار اپنی تعریف پر زبردست ہو گیا۔

تعریف کسے بری لگتی ہے چاہے انسان ہو یا کوئی بھی مخلوق۔ اپنی تعریف سننے میں سب کو مزہ آتا ہے۔ پھر وہ بل کر منصوبے کے متعلق باتیں کرنے لگے۔

جب منصوبہ ہر طرح سے مکمل ہو گیا تو سردار نے گومانے کہا۔ ”کیا تم آدم زادوں کی دنیا سے وہ چیز لائے ہو جسے پیتے ہی عجیب سا سرد آ جاتا ہے.....؟“

”جی سردار۔ میں کل ہی مزید وہ چیز لایا تھا بہت زیادہ مقدار میں۔ آدم زاد اسے شراب کہہ کر پکارتے ہیں، مسلمان تو اس سے دور رہتے ہیں لیکن پھر بھی بہت سے چوری چھپے پیتے ہیں۔“

”بہت خوب..... ہم تم سے بہت خوش ہیں گومانے یہ انسان ہے کمال کی چیز..... ایسی ایسی چیزیں تیار کر لی ہیں کہ ہم تو بس سوچتے رہ جاتے ہیں۔ اب شراب کو ہی دیکھ لو۔ کتنے مزے کی چیز ہے۔ تم کیا کہہ رہے تھے کہ مسلمان زیادہ تر اس سے دور رہتے ہیں۔“ سردار نے سوالیہ نظروں سے گومان کی طرف دیکھا۔ ”اتنی زبردست چیز انہوں نے تیار کی ہے اور اس کے پاس ہے بھی زیادہ مقدار میں تو پھر وہ کیوں اس سے دور رہتے ہیں؟“

”سردار مسلمانوں کے مطابق یہ حرام چیز ہے جو انسان کو حیوان سے بدتر بنا دیتی ہے اور وہ اپنے پرانے کی تیز بھول جاتا ہے۔ ان کے مذہبی پیشوائے بھی انہیں شراب پینے سے منع فرمایا ہے اس لئے وہ اس سے دور رہتے ہیں لیکن میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ کچھ ہیں جو شراب کو پانی کی طرح پیتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔“ گومانے تعصبات ساری معلومات سردار کو فراہم کر دی تو وہ حیران رہ گیا۔

”واہ گومانے..... تم تو آدم زادوں کے متعلق کافی کچھ جانتے ہو اب مجھے یقین آ گیا ہے کہ تم ضرور جنات کے سردار سے وہ انگوٹھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ بس اب جلدی سے وہ انگوٹھی لا کرو تا کہ ان جنات کا خاتمہ یعنی ہو سکے۔“ سردار نے اٹھتے ہوئے کہا تو گومانے بھی سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا.....

وہ ایک بد فطرت مخلوق تھی نہایت سرکش..... قدرت کے قانون کے خلاف چلنا ان کا وظیفہ تھا خاص کر مسلمان جنات کے خلاف تھے، انسان کی نظروں سے تو وہ دور تھے لیکن جنات کو ان کی ساری سرگرمیوں کی خبر تھی اور وہ ان کو غلط کاموں سے روکتے رہتے تھے

ان جنات کی وجہ سے وہ کھل کر نہیں کھیل سکتے تھے اس لئے وہ ان کے خلاف تھے اور ان کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔

لیکن جنات ان سے زیادہ طاقتور تھے اس لئے وہ کھل کر ان کے خلاف کارروائی نہیں کر سکتے تھے اس لئے بہت سوچ بچار کے بعد ان کے سردار کے ذہن میں انگوٹھی چرانے والا منصوبہ آیا۔ اس طرح جنات کا خاتمہ ہونے میں بہت عرصہ لگ جاتا لیکن کچھ نہ ہونے سے ہونا بہر حال بہتر ہوتا ہے۔

وہ اسی اصول پر کاربند ہو کر رہتا اور جنات کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے انگوٹھی چرانے کے لئے کوششیں شروع کر دیں اور انہیں جلد ہی اس میں کامیابی ہو گئی۔ ہر قوم میں کچھ نہ کچھ خدا ہوتے ہیں جو میر صادق کا کردار ادا کرتے ہیں۔

سردار گوباش کے پاس بھی ایک خادم آستین کا سانپ ثابت ہوا..... اس نے لالچ میں آ کر وہ انگوٹھی چرا کر گومانے کے حوالے کر دی بعد میں اس کی غداری ظاہر ہوئی تو اس کے ساتھ دی سلوک ہوا جو عموماً غداروں کے ساتھ ہوتا ہے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا لیکن وہ انگوٹھی واپس نہ حاصل کر سکے اس وجہ سے ان کے قبیلے میں شادیاں رک گئیں۔

سردار گوباش بہت زیادہ فکرمند تھا اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح وہ انگوٹھی حاصل کر لے لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی دیے بھی انگوٹھی اس مخلوق کے قبضے میں ہونے کی وجہ سے جنات کا زور ان میں نہیں چل سکتا تھا۔

اور پھر سردار کو یہ چلا کہ وہ انگوٹھی انسانی دنیا میں پہنچ گئی ہے اور کسی پہاڑی علاقے میں کسی بچے جیسے میں پھینک دی گئی ہے تو وہ بایوس ہو گیا ایک توان کی جناتی طاقتیں پانی پر بے اثر تھیں اور دوسرا وہ جیسے سارا سال پہنچ رہے ہیں یہ نہیں وہ انگوٹھی کہاں سے کہاں چلی گئی ہوگی اب سوائے مبرا اور خدا سے دعا کے اور کوئی چیز نہیں تھی انہیں یہ تو بھی نہیں تھا کہ وہ کس پہاڑی علاقے کے کس جیسے میں پھینکی گئی ہے اگر اسے پتہ ہوتا تو انسانوں

کی مدد بھی حاصل کر سکتا تھا۔

اس وقت زرباش بہت چھوٹا تھا لیکن بڑا ہونے تک یہ بات اسے ازبر ہو چکی تھی اور ویسے بھی ان کے قبیلے میں شادیاں رک چکی تھیں اور جو بوڑھے تھے وہ مرتے جا رہے تھے اور کبھی بھی ہونے والے حادثات میں نوجوان بھی مرنے لگے تھے یہ بات بہت تشویش ناک تھی اگر یہی صورت حال رہتی تو وہ دن دور نہیں جب ان کا خاتمہ یعنی ہو جاتا۔

اسی سوچ نے گوباش کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ زرباش بڑا ہو گیا تھا؟ جنات کی عمریں ہزاروں سال کی ہوتی ہیں اور کئی ہزار سال تو وہ جوان ہی رہتے ہیں۔

زرباش کو انسانی دنیا دیکھنے کا بہت شوق تھا اس لئے وہ اپنے باپ یعنی سردار گوباش کی اجازت سے انسانی دنیا میں آیا تھا۔

ایک دن جس چیز کو دیکھ کر زرباش چونکا تھا وہ انگوٹھی نما کوئی چیز تھی جو ایک بچہ کے پاس پڑی چمک رہی تھی اس میں سرخ یا قوت جڑا تھا جو شفاف پانی میں اور بھی دک رہا تھا۔

اچانک زرباش کے ذہن میں جھماکا ہوا جواگٹھی اس کے والد سردار گوباش کے پاس سے چورنی ہوئی تھی اس میں بھی سرخ یا قوت جڑا ہوا تھا اور وہ بھی کسی پہاڑی علاقے میں پہنچنے والے جیسے میں پھینکی گئی تھی۔

زرباش اس انگوٹھی کو حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو گیا چونکہ وہ خود پانی میں نہیں جاسکتا تھا اس لئے اسے کسی انسان کی مدد کی ضرورت تھی۔ اس نے آس پاس نگاہ دوڑائی اسے ایک نوجوان لڑکا اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

زرباش نے اسے آواز دی تو وہ اس کی طرف آ گیا۔

”کیا بات ہے صاحب..... مجھے کیوں بلایا.....؟“ لڑکے نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف

دیکھا تو زرباش بولا۔

”بیادے لڑکے کیا تم اس ندی کے پانی میں اتر کر تہ تک جاسکتے ہو؟“

”ضرور کیوں نہیں۔ یہ تو میرے ہائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لیکن تمہاری معلومات کے لئے بتا دوں کہ پانی کی گہرائی اتنی نہیں ہوتی جتنی ہمیں نظر آتی ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس شفاف پانی کو دیکھ کر تم سمجھ رہے ہو گے کہ اس کی گہرائی میں نہیں تو یہ تمہاری بھول ہے یہ اس سے دو گنا گہرائی ہے جتنی تمہیں نظر آ رہی ہے دیمے کیوں پوچھ رہے ہو؟“ لڑکے نے دوبارہ سوال کی طرف آتے ہوئے کہا۔

”دراصل میری انگلی پانی میں گر گئی ہے وہ دیکھو۔“ زرباش نے انگلی کے اشارے سے اسے وہ جگہ دکھائی جہاں انگلی پڑی چک زری تھی۔ ”مجھے پانی سے خوف آتا ہے اس لئے میں اس میں جا نہیں سکتا۔ تم ذرا جا کر مجھے وہ انگلی نکال کر دوے دو میں تمہیں اس کا انعام دوں گا۔“

”ابھی لایا۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر لڑکے نے ندی میں چھلانگ لگادی۔ تھوڑی دیر بعد انگلی زرباش کے پاس تھی وہ خوشی سے چھو لے نہیں سار ہاتھ لیکن ابھی مزید تصدیق کرنی لازمی تھی۔

اس نے لڑکے کا شکریہ ادا کیا اور جیب میں ہاتھ ڈالا اس کے ہاتھوں میں نوٹوں کی ایک گڈی تھی جو اس نے لڑکے کے ہاتھوں میں تھادی لڑکا حیرانی سے آنکھ پھاڑے نوٹوں کی گڈی کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکے نے خواب میں بھی اتنے پیسوں کے بارے میں نہیں سوچا تھا غریب لوگوں کی خواہشیں اور خواب بھی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں ان کی چادر کی طرح۔۔۔۔۔!

زرباش ایک طرف بڑھ گیا اب مزید یہاں رہنا فضول تھا اس لئے وہ واپس اپنی دنیا میں آ گیا اور جب اس نے وہ انگلی سردار کو باش کے سامنے رکھی تو وہ کچھ دیر سکتے کے عالم میں اسے دیکھتا رہا پھر انگلی کو زرباش کے ہاتھوں سے چھپٹ لیا۔ ”یہ۔۔۔۔۔ یہ نہیں

کہاں سے ملی۔۔۔۔۔؟“ خوشی سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔ جواباً زرباش نے انہیں سارا واقعہ سنا دیا وہ سن کر بہت خوش ہوئے پھر ایک غلام کو حاضر ہونے کا حکم دیا تھوڑی دیر بعد پورے قیلے میں اعلان کر دیا گیا کہ اب سے تین دن بعد ایک بڑا جشن ہوگا انگلی ملنے کی خوشی میں، اس کے ساتھ ہی بڑے پیمانے پر اجتماعی شادیوں کا بندوبست بھی کر دیا گیا۔

سارے جنات بہت خوش تھے اور زرباش کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ وہ ان کے لئے ایک فرشتہ ثابت ہوا ہے۔

☆ ☆ ☆

’غضب ہو گیا سردار۔۔۔۔۔ غضب ہو گیا۔۔۔۔۔‘ گویا جو اب کافی حد تک بوڑھا ہو چکا تھا پھولی ہوئی سانسوں سے سردار کے پاس آیا اور بولا۔

”کیا ہوا ہے گویا۔۔۔۔۔ کچھ منہ سے پھوٹو۔۔۔۔۔“ سردار نے گویا کی گھبراہٹ دیکھ کر سوال کیا۔

”سردار آج سے بہت سال پہلے جنات کی جو انگلی ہم نے انسانی دنیا میں ایک ندی میں پھونکی تھی وہ دوبارہ ان کے ہاتھ لگ گئی ہے ان کا جو بیٹا ہے زرباش وہ آدم زادوں کی دنیا میں گھومنے گیا تھا اتفاقاً اس کی نظر اس انگلی پر پڑ گئی اور وہ اسے حاصل کر کے سردار کو باش کے حوالے کر چکا ہے اور اب سے دو دن بعد بڑے پیمانے پر اجتماعی شادیوں کا انتظام کیا گیا ہے۔“ گویا نے سردار کو تعظیم ساری بات بتائی۔

سردار کے کردہ چہرے پر نگر و پریشانی کے آثار پھیل گئے پھر وہ بولا۔ ”یہ تو بہت پریشانی والی بات ہے۔ اب وہ دوبارہ طاقتور ہو جائیں گے ان کی نسل ختم ہونے کی بجائے اور بڑھے گی ہمارے ہر کام میں روڑے لگائیں گے۔ کچھ اور کارنڈے لگا۔“

کچھ اور۔۔۔۔۔ ”سردار نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔“

کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولا۔ ”تم ایسا کرو سردار کو باش کے بیٹے زرباش کو اٹھوا کر اپنی اس دنیا

میں لے آؤ۔ پھر اس کے بعد جو کرنا ہے میں تمہیں بتا دوں گا۔“

زرباش اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا خوش گیسوں میں مصروف تھا کہ ایک جن موہا نہ حاضر ہوا اور نہایت ادب سے بولا۔ ”چھوٹے سردار۔ سردار گویا باش نے آپ کے لئے پیغام بھیجا ہے کہ فوراً ان کے پاس حاضر ہوں۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ میں آتا ہوں۔“ زرباش نے غلام جن کو کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ پھر زرباش نے دوستوں سے اجازت لی اور سردار گویا باش کے پاس روانہ ہو گیا۔

راستے میں ایک جگہ اسے ایک پریشان حال جنی ملی وہ زرباش کو دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف آئی اور بولی۔ ”چھوٹے سردار خدا کے لئے میری مدد کریں وہ کمینہ رومان جن زبردستی مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے وہ کہتا ہے اگر میں نے اپنی رضامندی سے اس سے شادی نہ کی تو وہ میری عزت لوٹ لے گا اور مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ خدا کے واسطے میرا اس بد بخت سے پیچھا چھڑائیں چھوٹے سردار، میں تمام عمر آپ کو دعاؤں میں دوں گی۔“ اس لڑکی کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ واقعی مسئلہ گھمبیر ہے۔

”ٹھیک ہے مونی۔۔۔۔۔ تم گھر چلو۔ میں تھوڑی دیر میں آ کر اس معاملے کو نبھاتا ہوں۔“ مونی حسرت آمیز نظروں سے زرباش کو گھمتی ہوئی وہاں سے چلی گئی زرباش ایک ٹھنڈی سانس بھر کے وہاں سے چلا گیا۔

مونی حد سے زیادہ خوبصورت جنی تھی اور زرباش دل ہی دل میں اسے بے حد چاہتا تھا لیکن اس نے بھی اپنے انداز سے کبھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے کیونکہ وہ سردار کا بیٹا تھا اور اپنے کسی بھی انداز سے وہ لوگوں کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے اس نے اپنے دل کی بات کبھی کسی سے نہیں کہی۔

دوسری طرف مونی کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی

اسے دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی لیکن کچھ کہنے سے اس لئے ڈرتی تھی کہ وہ سردار کا بیٹا تھا۔ حیثیت دمر ہے میں اس سے بڑا۔۔۔۔۔ اگر وہ مونی کو نکھڑا دیتا تو وہ صدمے سے شاید ہی زندہ رہ پاتی اور ایسا اس لئے بھی تھا کہ زرباش کے کسی انداز میں مونی کو اپنے لئے کبھی پسندیدگی محسوس نہیں ہوئی وہ اس سے بھی سب کی طرح نارمل انداز میں بات کرتا تھا اس لئے مونی کے قدم اس کی طرف اٹھتے اٹھتے پلٹ آتے۔

زمانہ نا ہی ایک جن عرصے سے اس کے پیچھے پڑا تھا وہ بڑا بد خصلت اور کمینہ صفت تھا جب مونی کے والدین زندہ تھے تو وہ اپنی حد میں تھا لیکن جب سے ان کا انتقال ہوا تھا اسے گویا کھلی چھوٹ مل گئی تھی مونی کو تنگ کرنے کا کوئی بہانہ ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ اور اب بھی مونی کو دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اس سے شادی پر رضامند نہ ہوئی تو وہ اس کی عزت کی دھجیاں بکھیر دے گا۔ کبھی وہ خوف زدہ ہو کر زرباش کے پاس آئی حالانکہ وہ بڑے سردار کو باش کے پاس بھی جاسکتی تھی لیکن وہ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر زرباش کے پاس چلی آئی جس نے اپنے کسی بھی انداز سے یہ ظاہر نہ کیا کہ اسے زمانہ پر غصہ آیا ہے یا نہیں؟

مونی کا خیال تھا زرباش اس کے بتانے پر شدید رد عمل ظاہر کرے گا اور زرباش کو جان سے مارنے کا کہے گا لیکن وہ یوں نارمل تھا جیسے وہ اک عام بی بی تھی۔ وہ گھر کی طرف بڑھتی جا رہی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے شام ہونے کے قریب تھی اور اسے ڈر تھا کہ زرباش آج کی رات پھر آئے گا اور ہو سکتا ہے اس کے انکار پر اپنی حد سے بڑھ جائے تبھی وہ ست قدموں سے چل رہی تھی لیکن گھر تو بہر حال اسے جانا تھا۔

جب وہ رات کو سونے کے لئے لیٹی تو زرباش آ موجود ہوا وہ خوف زدہ ہو گئی۔ ”پھر کیا سوچا ہے تم نے میری جان۔۔۔۔۔؟“ زرباش نے خباثت بھرے لہجے میں بولا۔ ”مجھ سے شادی کرو گی یا اپنے اس خوبصورت وجود کو میرے حوالے کر دو گی؟“

”میں تم پر تھوکانا بھی پسند نہیں کرتی شادی تو دور کی بات۔ دُخ ہو جاؤ میرے گھر سے نکل جاؤ۔“ وہ ہنسیاں انداز میں چلائی اور زردمان کے چہرے پر غصے بھرے تاثرات نمودار ہوئے۔ ”یہ کہہ کر وہ اس کی طرف بڑھا تو موٹی پیچھے ہٹے ہٹے دیوار کے ساتھ لگ گئی اور زردمان مکروہ انداز میں ہنسنے لگا۔“

پھر اس سے پہلے کہ وہ موٹی کو چھو تو زرباش ایک جھماکے سے نمودار ہوا۔ ”موٹی سے دور ہو زردمان اگر تم نے موٹی کو ہاتھ بھی لگایا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”چھوٹے سردار! آپ درمیان میں نہ آئیں میں اس لڑکی کو حاصل کئے بنا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔“ زردمان نے اٹل لہجے میں کہا تو زرباش کے چہرے پر غصے کے تاثرات نمودار ہو گئے۔

”ٹھیک ہے پھر اپنا انجام دیکھو۔“ یہ کہہ کر زرباش نے اپنے ہاتھوں کا رخ اس کی طرف کیا، زرباش کے ہاتھوں سے برقی لہریں نکلیں اور زردمان کے وجود میں پھوٹت ہو گئیں۔ زردمان کے منہ سے اذیت ناک چیخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنی جگہ سے غائب ہو گیا۔ موٹی نے تشکرانہ انداز سے زرباش کی طرف دیکھا جو مسکرا کر موٹی کو ہی دیکھ رہا تھا۔

”اب تمہیں زردمان کی طرف سے ٹکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ ہمیشہ کے لئے اپنا ج ہو چکا ہے۔“

”بہت بہت شکریہ چھوٹے سردار۔“ موٹی نے کہا تو زرباش بولا۔

”موٹی کیا تم مجھے زرباش کے نام سے نہیں پکار سکتی۔“

زرباش یک تک اس کی طرف دیکھا، موٹی جھینپ گئی۔ ”ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں آپ؟“ موٹی کی آواز شدت جذبات سے لبریز ہو گئی۔

”دیکھ رہا ہوں کہ آج سے دو دن بعد جب تم میری لہن ہوتی تو کیا لگے گا؟“

زرباش کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور موٹی آنکھیں پھاڑے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی وہ اس بات پر شرمناک بھی بھول گئی تھی۔

”کیا ہوا ایسے کیوں دیکھ رہی ہو.....؟ یا ربچین سے آج تک محبت کرتا آیا ہوں لیکن کبھی ہمت ہی نہیں ہوئی، آج موقع خدا نے دیا تو کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھاؤں۔ یہی سوچ کر تم سے کہا، اگر تمہاری رضا مندی ہو تو دو دن بعد ان شادیوں میں سے ایک ہماری بھی ہو سکتی ہے۔“ اور موٹی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اس کا مطلب ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ زرباش نے اس کی شرمیلیں مسکراہٹ کی طرف دیکھ کر کہا تو موٹی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

سردار گوباش نے زرباش کو بلا کر اسے رات کو سرحدی علاقے کی حفاظت سونپی تھی حالانکہ سردار کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اسے خصوصی رعایت اور مراعات حاصل تھی لیکن سردار گوباش اس چیز کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کی نظر میں سب برابر تھے اس لئے باقی جنات کی طرح زرباش کو بھی سرحدی علاقے کی رکھوالی کے لئے ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

زرباش اپنی ڈیوٹی مکمل چاکہ دیتی سے وہ نے بار تھا کہ اچانک اسے کچھ عجیب سی آوازیں آنا شروع ہو گئیں وہ تجسس سا آگے بڑھا آوازیں اور دور ہو گئیں وہ اور آگے بڑھا یہ جانے بغیر کہ وہ اپنی سرحد سے آگے نکل آیا ہے۔

اچانک آوازیں بند ہو گئیں اس نے چونک کر آس پاس دیکھا اور حیران رہ گیا وہ اپنے علاقے سے کافی آگے نکل آیا تھا اس کو اچانک خطرے کا احساس

ہوا اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا اک دھواں سا اس کے نتھنوں میں گھسا اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ جب زرباش کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ اس کو خود نے چھڑانے کی کافی کوشش کی لیکن بے سود..... اس نے آس پاس نگاہ دوڑائی وہ اک عجیب و غریب جگہ پر بندھا ہوا تھا کمرے کو دیکھ کر یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوئی کہ وہ کمرہ کسی چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا۔

اچانک ایک طرف سے زردار گزرا کہتے کی آواز آئی تو زرباش نے چونک کر ادھر دیکھا۔ دیوار کا چھریک طرف زردار آواز سے سرک رہا تھا پھر اس میں سے ایک نہایت عجیب و غریب مخلوق اندر داخل ہوئی جس کی شکل اور جسمات نہایت خوف ناک تھی وہ خود جن تھا لیکن ان کی خوف ناک دیکھ کر خود بھی حیران رہ گیا۔ پھر وہ مخلوق زرباش سے مخاطب ہوئی..... ”سنو جن زادے۔ تمہاری زندگی کی خفانت صرف اس صورت میں دی جاسکتی ہے اگر تم وعدہ کرو کہ وہ انگلی ہمیں لا کر دے دو گے، ورنہ ایک بھیانک موت تمہاری منتظر ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے رکنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی اور واپس اسی طرف بڑھ گئی جہاں سے داخل ہوئی تھی۔ ”کل تک سوچ لو ورنہ.....“ یہ کہہ کر وہ سوراخ کی دوسری طرف غائب ہو گئی۔

زرباش نے ابھی طرح سوچ لیا تھا کہ وہ ان کی شرط پر موت کو ترجیح دے گا۔ اس لئے دوسرے دن اس نے ان کی شرط پوری کرنے سے انکار کر دیا وہ مخلوق بہت غصے میں آ گئی عجیب اخلاق گویا آگے بڑھا اور وہ پانی جو وہ انسانی دنیا سے لایا تھا زرباش کے برہنہ جسم پر پھینک دیا، زرباش کی اذیت ناک چیخیں غار کی دیواروں سے گونجنے لگیں اور اس مخلوق کا جو سردار تھا وہ زردار سے تھپتھپانے لگا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اس پر پانی پھینکے ایک گرجدار آواز نے انہیں اپنی جگہ ساکت ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ ”خبردار اگر کسی نے اب زرباش

کو کچھ بھی کہا تو..... پہلے بہت عرصے سے تمہاری عادتوں کو نظر انداز کرتے آئے ہیں لیکن اب مزید نہیں..... تم جیسے سرکشوں کو اگر زیادہ چھوٹ دی جائے تو وہ پونہی سرکشی کرتے رہتے ہیں۔“ یہ آواز سردار جنات کی تھی۔

پھر اچانک ہر طرف دھواں پھیل گیا، بالکل سیاہ رنگ کا وہ کافی دیر چھایا اس دوران نہایت دل دہلا دینے والی آوازیں آتی رہیں پھر اس کے بعد سب کچھ پہلی حالت میں آ گیا۔

زرباش زنجیروں سے آزاد ہو چکا تھا اس کی حالت نہایت مخدوش تھی اور وہ زنجیروں سے آزاد ہوتے ہی گر پڑا بہت سے جنت جلدی سے آگے بڑھے اور اسے اٹھالیا اور اسے لیکر اپنے قیلے میں واپس آ گئے۔

سردار جنات بہت خوش تھا کہ اس مخلوق کے سرکش سردار کا خاتمہ ہو گیا تھا ورنہ پتہ نہیں وہ کب تک انہیں سکون سے جینے نہ دیتے۔

مکمل علاج سے زرباش دونوں میں بھلا چنگا ہو گیا تھا آج اس کی شادی تھی موٹی سے۔ یہ ایک بڑے پیارے پر تقریب تھی جس میں بہت سے جنت جوڑوں کی شادی بھی سب بہت خوش تھے خاص کر زرباش اور موٹی.....! پھر وہ کمرے میں پہنچا دیئے گئے۔

زرباش پیار سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا جو بہت خوبصورت لگ رہی تھی پھر وہ بولا ”بہت محبت ہے تم سے اگر کو تو اپنی جان وار دوں۔“

موٹی گھبرا گئی..... ”نہیں نہیں.....“ پھر شرارت سے بولی۔ ”اگر چاند تارے توڑ کر لاسکتے ہو تو ٹھیک ہے۔“

زرباش سرکھانے لگا۔ ”بھئی یہ سانس ہی دور ہے کوئی آسان کام کہو۔“ پھر وہ دونوں کھٹکھٹا کر نرس پڑے۔



وہ واقعی پر اسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جاوہی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

سردار کی غضبناک آواز پوری محفل میں گونج گئی اور روشاک بے حس و حرکت بت کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا اور کنبہ سے میں آ کر کھڑا ہو گیا، مگر یہ کیا اچانک کنبہ سے دھواں سا اٹھا اور روشاک کنبہ سے غائب ہو چکا تھا۔ اس کیفیت کو دیکھ کر محفل میں موجود سارے جنات اور سردار اچنبھے میں پڑ گئے، تو پھر سردار اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور جنات مجاہدوں سے مخاطب ہوا۔ فوراً جاؤ اور روشاک جہاں بھی ملے اور جس حال میں بھی ملے فوراً گرفتار کر کے لاؤ، اگر اس پر سختی کی ضرورت پیش آئے تو بالکل بھی انکپا نا نہیں۔ یہ میرا حکم ہے۔ روشاک فرار ہونے کے بعد خوشبو کے کمرے میں پہنچا اور خوشبو کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا کہ اچانک اس جگہ رولوکا کے کارندے پہنچے اور روشاک کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ روشاک وہاں سے بھی بھاگا اور پھر کافر جنات کے ایک قبیلہ میں پہنچ گیا۔ کافر جنات کا سردار اس کی روداد سن کر بولا۔ تم گھبراؤ نہیں میں ہر ممکن تہاری مدد کروں گا۔ اس صورت میں دونوں قبیلہ والوں میں گھسبان کارن پڑا، لیکن خفیہ طور سے رولوکا روشاک کو نکال لایا، اس کے بعد روشاک کو اس قبیلہ میں تمام جنات اور رولوکا کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اس طرح روشاک کے خاتمہ ہونے پر خوشبو کی جان اس سے چھوٹ گئی۔ رولوکا اور حکیم وقار مطلب میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ حکیم وقار نے کہا، حکیم کامل کچھ دن پہلے ایک صاحب آئے تھے، جن کا نام پرہتاب تھا اور انہوں نے ایک ڈائری بھی دی تھی وہ کل بھی آئے تھے مگر آپ سے ملاقات نہ ہوئی۔ یہ سن کر رولوکا بولا۔ جی حکیم صاحب مجھے یاد آیا۔ میں آج ہی ان کی ڈائری پڑھوں گا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ رات میں رولوکا نے پرہتاب کے حکیم کی ڈائری نکالی اور پڑھنے لگا لکھا تھا۔ حکیم صاحب میں کالج سے گاؤں آ گیا مگر کالج میں جس کے ساتھ کمرے میں رہتا تھا وہ بھوت چڑیل کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتا بلکہ لکھتا بھی تھا۔ اس کی ڈائری میں عجیب و غریب دل دہلا دینے والے واقعات درج تھے کہ چڑیل، بھوت اور دیگر آتماں بہت ہی سختی شامی ہوتی ہیں، میں نے پوری ڈائری پڑھ لی تھی۔ خیر جب میں گاؤں پہنچا تو میں اندرونی طور پر بہت ہی ہلکا بن رہا تھا۔ میرا دل پڑھائی سے بالکل ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔ میں اکیلا کھیت مکیناؤں میں گھومنے لگا ایک روز میں ایک باغ میں اکیلا بیٹھا تھا کہ اچانک ایک ایسا اجنبی سندری سندری میرے سامنے آ گئی اور میری آنکھیں جیسے اس کی سندرتا میں کھو گئیں۔ مجھے اپنا کوئی ہوش نہ رہا اور جب ہوش آیا تو.....

(اب آئے پڑھیں)

میں نے دیکھا کہ میں ایک عالی شان بچے سجائے کمرے میں موجود ہوں۔ کمرے میں موجود ہر چیز سے ظاہر تھا کہ وہ کمرہ کسی بہت ہی امیر کسیر یا پھر کسی راجہ کا کمرہ تھا۔ میری آنکھیں ہر چیز کو ٹھنکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ اور سب سے کمال یہ تھا کہ میرے جسم پر اس وقت جو لباس تھا وہ کسی شہزادے جیسا تھا۔ اپنے جسم پر موجود اپنے لباس کو میں نے کھینچ کھینچ کر دیکھا۔ اور جب

اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو میں نے اپنی گردن پر زور کی چٹکی بھری کہ شاید میں ہوش و حواس میں ہوں کہ نہیں۔ چٹکی میں نے اتنی زور کی بھری تھی کہ دروازے ہلکا اٹھا۔ میں اچنبھے کی حالت میں بستے سے نیچے اتر اور کمرے میں موجود ساری چیزوں کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ دیواروں پر بڑی بڑی کئی کئی کھواریں بھی لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک طرف زرہ بکتر بھی موجود تھا۔ ایک طرف تیر کمان بھی موجود تھی بلکہ مجموعی طور پر میدان جنگ میں استعمال

ہونے والے سارے ہتھیار موجود تھے۔

پھر میری نظر سہری یعنی چھپر کھٹ پر پڑی۔ ایسا عالی شان چھپر کھٹ تھا کہ میں کیا بتاؤں، بہت ہی بڑا اور لمبا چڑا بستر تھا۔ ایسا جیسا کہ کسی راجہ مہاراجہ کا ہوتا ہے۔ کمرے کی لمبائی چوڑائی بھی ناقابل بیان ہے۔ پورے کمرے میں گھوم پھر کر میں نے ایک ایک چیز پر نظر ڈالی اور جب میری آنکھیں تھک گئیں تو اچانک میرے منہ سے نکلا۔ ”کوئی ہے؟“

”میرے منہ سے آواز کا نکلنا تھا کہ اچانک ایک طرف موجود دروازہ کھلا اور ایک ملازم اندر آیا، وہ بہت ہی مودبانہ تھا اس کی نظر میں جھکی ہوئی تھیں، وہ بولا۔ ”جی چھوٹے سرکار! حکم کریں۔“ میں اچھیجیہ کی حالت میں اسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ”تم کون ہو؟“

”حضور! آپ کا خادم ہوں، آپ حکم کریں۔“ وہ بولا۔ ”اور میں کون ہوں؟“ میں جیسے چیخ کر بولا۔ ”حضور! آپ چھوٹے سرکار ہیں۔“ وہ بولا۔ ”خادم! چھوٹے سرکار! مہاراج! یہ تمام لفظ میرے لئے اجنبی تھے اور میرے ذہن پر جیسے تھوڑے برسار ہے تھے۔ ”ارے بھائی! کون مہاراج، کون سرکار اور کون سا خادم۔ یہ تم کیا بک رہے ہو، میں تو ایک عام آدمی ہوں، میرا نام پر تاب ہے۔“ میں نے کہا۔

”حضور! آپ کا نام تو امر سنگھ ہے، اور آپ یہ کیا بول رہے ہیں۔“ اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور مجھ پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں، وہ بدستور مجھے گھورتا رہا تو میرے منہ سے نکلا۔ ”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو، فوراً مجھے پانی پلاؤ۔“ یہ سنتے ہی وہ اٹھ لپٹ گیا۔

چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ دوسری طرف کا دروازہ کھلا اور ایک دلکش اور دل بھانے والی لڑکی ہاتھ میں جھلکا ہوا ایک گلاس لئے ہوئے میرے قریب آگئی اور جب میں نے اس پر نظر ڈالی تو جیسے اچھل گیا۔ کیونکہ وہ تو وہی تھی جو کہ آج کے باغ میں اچانک میرے سامنے آئی تھی۔

”تم اور یہاں! تم کون ہو اور مجھے یہاں پر کون لایا، یہ کون سی جگہ ہے؟ اور میرے جسم پر تو عام سا لباس تھا اور یہ راجہ مہاراجہ جیسا لباس اس وقت میرے جسم پر۔ کیا میں کسی جادوگری میں آ گیا ہوں۔ مجھے جلدی سے بتاؤ، تاکہ میں حقیقت جان سکوں، میرا دماغ درد کی وجہ سے پھنسا جا رہا ہے۔“ میں بولا۔

”تم اسر ہو! اور تم اپنی راج وہانی میں ہو، تم مہاراج کے اکلوتے سپوت ہو اور میں تمہارے چاچا کی پتری لالہ دیتی ہوں۔“

یہ بول کر وہ مسکرانے لگی اور میرا ہاتھ پکڑ کر بستر پر بیٹھا دیا، اور خود میرے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی، چمکدار جگ سے گلاس میں پانی ڈالا اور میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ گلاس کا منہ سے لگنا تھا کہ میں غٹا غٹ پانی پینے لگا اور پھر پورا گلاس خالی ہو گیا۔ اس نے جب گلاس چاندی کے ٹرے پر رکھا اور ایک میز پر رکھ دی۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور میرے ہاتھوں کو اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے دبانے لگی۔ چند لمحے بعد بولی۔ ”اسر تم گھبرا کیوں رہے ہو، ارے یہ پوری راج وہانی تمہاری ہے، چاچا جی یعنی تمہارے پتا یہاں کے راجہ ہیں اور میں تمہاری لالہ دیتی ہوں۔ بس تمہیں میں یہ بتا دوں کہ ہم دونوں جنم جنم کے ساتھی ہیں۔“

میں نے دیوتا کے آگے زبردست پراستھان کی ہے، دیوتا کو خوش کرنے کے لئے میں رات رات بھر ناچتی رہی ہوں۔ دیوتا کی سیوا میں، میں نے کوئی کسر نہیں اٹھار رکھی اور یہ سب میں نے اس لئے کیا کہ خوش ہو کر دیوتا میرے من کی کامنائیں پوری کر دیں۔

تم یہ نہیں پوچھو گے کہ میرے من کی کامنائیں کیا ہیں؟

”کیا ہیں؟“

”چلو یہ بھی بتا دو کہ وہ کامنائیں کیا ہیں؟“ میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ”میری کامنائیں ہیں۔ ہر جنم میں تم میرے ہی ہو اور میں تمہاری سیوا کرتی رہوں۔“

”تم یہ سب باتیں جو کر رہی ہو، یہ میری سمجھ سے باہر ہیں، میں تمہاری کسی بات کو سمجھ نہیں سکتا رہا۔ بس اتنا معلوم ہے کہ میرا نام پر تاب ہے اور میں کانج میں پڑھتا تھا اور اب میں نے پڑھائی چھوڑ دی ہے۔“ یہ سنتے ہی اس کی نیلگوں آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔ جسے دیکھ کر میرا من مچلنے لگا کہ اتنی سندر جس کی سندرنا ناقابل بیان ہے میں نے اس کا دل دکھایا، پھر میں نے سوچا۔ کیوں نہ میں اس کا دل رکھنے کے لئے ہاں کرتا رہوں۔“

میں نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور پھر بہت قریب سے اس کی جمیل سے بھی گہری آنکھوں میں اپنی نظریں گاڑ دیں۔

اس کے ہونٹوں پر مسکان بکھر گئی اور پھر بے تابانہ وہ مجھ سے لپٹ گئی اور سکنے لگی۔ میں اس کے ریشمی بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگا۔ چند منٹ ایسا ہوتا رہا پھر اس نے اپنا چہرہ اوپر کیا اور بولی۔ ”اسر میرا بس چلے تو میں تمہیں سارے سنسار سے اپنے من میں چھپا لوں اور کوشش کروں کہ میرے علاوہ یہ چلے ہوئی ہو ابھی تمہیں نہ چھو پائے۔ مگر آدمی کی ہر اچھا بک پوری ہوتی ہے۔“

تمہاری خاطر میں سارے سنسار سے ٹکرا سکتی ہوں، میرے علاوہ اگر کسی نے تم پر پریم کی نظر ڈالی تو میں اس کا خون پی جاؤں گی۔ ”اسر تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں تمہارے پتا ہر ایک پل بیا کل رہتی ہوں۔ تم پر میں اپنا جیون تیاگ دوں گی اور تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ اب تک کیا ہوتا آ رہا ہے، تمہاری جدائی میں شاید ہی میں کسی پل سو پاتی ہوں۔“

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔“ میں نے کہا۔

”اور یہ تمام باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔“

”تم چنانچہ کرو میں تمہیں بتاتی ہوں۔“ یہ بول کر اس نے سیدھے ہاتھ کی سیدی انگلی سے دیوار کی طرف اشارہ کیا تو صاف شفاف دیوار پر جیسے فلم کا سین چلنے لگا۔ ایک بہت ہی خوب صورت گاؤں تھا۔ ہر طرف ہریالی اور سبزہ کا راج تھا۔ کھیتوں میں سرسوں کے پیلے

پیلے پھل لہلہا رہے تھے۔ گاؤں میں بڑی رونق تھی۔ بچے اپنے کندھوں پر جھولا (بستہ) لٹکائے ہوئے ایک طرف کو جا رہے تھے کہ اس جھولے (بستے) میں ان بچوں کی کتابیں تھیں۔

دو بچے ایسے بھی تھے جو دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ان تمام بچوں کے ساتھ چل رہے تھے، دونوں بچوں میں ایک لڑکی اور ایک لڑکا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ ان دونوں میں کچھ زیادہ ہی جانت و غلوں ہے اور پھر اس طرح وہ پڑھنے جاتے اور آتے رہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ پروان چڑھنے لگے اور پھر وہ دونوں جوانی کی دلہیز پر پہنچ گئے۔ یہ تمام واقعہ بالکل فلم کے سین کی طرح چل رہا تھا۔ اس لڑکی کی سندرنا کو دیکھ کر گاؤں بھر کے نوجوان بلکے سارا گاؤں ہی عشق عیش کرتا تھا۔ خاص طور پر نوجوان اور مرد حضرات حلقہ کی باندھ کر اس لڑکی کو دیکھتے اور ان کی نظروں سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ سب اس لڑکی کو اپنی آنکھوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھپا لیں گے۔

وہ نوجوان بھی بہت ہی گہر تھا۔ ہر جگہ وہ دونوں نظر آتے رہتے اور صرف رات میں سونے یا پھر دیگر ضروریات زندگی کے لئے الگ ہوتے تھے۔

وہ منظر دروازا واضح ہوا، اور پھر بہت ہی قریب آیا تو میں جیسے اچھل ہی گیا۔ ”ارے اس منظر میں تو میں خود تھا اور میرے ساتھ جو لڑکی تھی وہ..... وہ..... تو لالہ دیتی تھی۔ جو کہ اس وقت میرے پہلو میں میرے جسم سے لگے بیٹھی تھی اور نہ جانے کن خیالوں میں مگن تھی۔“

اچانک میرے دماغ میں جیسے آندھیاں چلنے لگیں، میں اندرونی طور پر سہم کر رہ گیا۔ خود کو اس منظر میں دیکھ کر۔ پھر منظر ابھرا۔ ایک کشش نالی لڑکا لالہ دیتی میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ ہر روز بلا ناغہ لالہ دیتی کو نظر آنے لگا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے ہم دونوں کو آتے جاتے دیکھنے لگا اور پھر دقت کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپی لالہ دیتی میں بڑھنے لگی۔

پھر نظر آیا، وہ اپنے چند دوستوں میں بیٹھا تھا،

اس کے چہرے پر خاموشی اور دیرانی کا راج تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر ایک لڑکا بولا۔ ”ارے گیش یہ کیسا منہ لٹکائے بیٹھا ہے، ارے وہ تیری پہنچ سے بہت دور ہے، وہ تو تجھے نظر بھر کر دیکھتی تھی نہیں اور تو ہے کہ اس کے لئے اپنے جیون کو تیا گئے پر بھی تیار ہے۔“ اور پھر تو کیا دشمن بلکہ ایک جگہ پانچ لڑکے بیٹھے تھے سب نے اسے لہن طعن کرنا شروع کر دیا۔

”ارے! بہت بننا ہے پیسے خان، تو یہ سوچ لے! چاہئے تو کچھ بھی کر لے، وہ تجھے گھاس بھی نہیں ڈالے گی۔“

”ارے وہ تو امر کے نام کا ملا جپتی ہے، اسے دیوتا سنان سمجھتی ہے، اگر اس کا بس چلے تو وہ بھگوان کو چھوڑ کر امر کو ہی پوجنا شروع کر دے۔“

ایک اور بولا۔ ”گیش بچو! میں نے امر اور لاج وئی کا پریم دیکھ کر اندازہ کیا ہے کہ اگر سارے سنسار کے لوگ ایک طرف اور امر ایک طرف ہو تو لاج وئی سارے سنسار سے منہ موڑ کر امر کے چروں میں اپنا جیون بتا دے گی۔“

اور گیش تو اسے صرف دیکھتا ہی رہ جانے لگا، تو ہر پل آپہں بھرے گا، تیرے جیون کا سکھ جینن بر باد ہو جائے گا، تو کسی کام کا نہیں رہے گا، اور پھر تو اپنے پتا کو جانتا ہے کہ وہ کس قدر سخت اور اصول کے کپے ہیں، اگر تو نے لاج وئی کو چھیڑا بھی تو سب سے پہلے تیرے پتا ہی تیری گردن پر چھری چلا دیں گے، اس سے تو اچھا ہے کہ تو لاج وئی کو اپنے من سے نکال دے۔“

دو پریمیوں کو خوش رہنے دے، اگر کوئی دو پریم کرنے والوں کو دکھ پہنچاتا ہے تو اسے تو بھگوان بھی نہیں چھوڑتا، کیونکہ بھگوان پریم کرنے والوں سے خوش ہوتا ہے۔“

گیش تو ہاتھ ہتھ مارہ جائے گا، اور لاج وئی کو امر ڈولی میں بیٹھا کر لے جائے گا۔ پھر تو سوچ تیرا اس سے کیا ہوگا۔ اس طرح رات دن سوچتے سوچتے تو کنزور اور بزدل بھی ہو جائے۔“

لفظ بزدل کا سن کر گیش طیش میں آ گیا اور پاؤں پختا ہوا بولا۔ ”میں امر کو برباد کر دوں گا، اس کا خون کر دوں گا اور پھر ساتھ ہی اپنا جیون بھی تیا گ دوں گا، اگر لاج وئی میری نہیں ہوئی تو۔“ اور طیش میں اس جگہ سے ایک طرف کو چلا گیا۔

وقت آہستہ آہستہ آگے کو بڑھتا رہا۔ امر اور لاج وئی دونوں اپنی اپنی مستیوں میں مگن تھے، سارے گاؤں والے ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے، ان دونوں کی محبت و چاہت خود غرضی پر مبنی نہیں تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے پاکیزہ محبت کرتے تھے۔

ایک دن صبح ہی سے گاؤں میں بوند باندی ہو رہی تھی۔ وقفے وقفے سے تیز بارش ہو جاتی تھی، اس لئے سارا گاؤں اپنے اپنے گھروں میں دبکا پڑا تھا۔ لیکن منظر میں نظر آیا کہ امر اور لاج وئی ایک کھیت کے کنارے دنیا دافیا سے بے خبر بارش سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دونوں آسنے سانسے بیٹھے صرف یک یک ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے، لاج وئی سفید گھاگھر، سفید کرنی اور سفید بنی اور مٹی میں ہلبوس تھی، لیکن اور مٹی بھگے کر اس کے کندھے پر بڑی تھی۔

سنگ مرمر کا تراشا ہوا شفاف بدن کسی انجان مخلوق کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ بارش نے اس کی کرنی کو اس کے جسم سے جیسے پیوست کر دیا تھا۔ برستی بارش کا پانی اس کے سر پر پڑتا تو سر سے نیچے کچھ سسلے ہوئے اس کے جسم میں جیسے جذب ہو کر رہ جاتا۔ اس کے خوب صورت اور دلکش گلاب کی پتلیوں جیسے گلابی ہونٹ ایسے لگ رہے تھے جیسے کہ وہ لاج وئی کے نہیں بلکہ کسی امیر کے ہونٹ ہوں۔ دونوں بالکل بیہوش تھے اور دونوں کی نظر میں ایک دوسرے میں جیسے پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔ دور سے ایسا لگتا تھا کہ پھر کے دو بونوں کو اس جگہ لاکر رکھ دیا گیا ہے۔

لاج وئی کے انگ سے مستی ابل رہی تھی، ایسا لگتا تھا کہ بار بار سو بار بلکہ ہزاروں مرتبہ بتانا کہ بھگوان نے مٹایا ہوگا۔ جب کہیں جا کر لاج وئی کا وہ حسین اور دلکش دل وہ لینے والا سراپا اس رنگ میں ڈھلا ہوگا۔ وہ کسی صورت بھی

زمین مخلوق نہیں نظر آتی تھی۔ بلکہ حقیقت میں حسن کا کوئی خوب صورت آسمانی مخلوق نظر آتی تھی۔ منظر میں اچانک گیش ایک طرف سے آتا ہوا دکھائی دیا، وہ بہت ہی تپ تول کر اپنا قدم اٹھاتا ہوا ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

قد آور سروس کے کھیت میں وہ چھپتا چھپتا آ رہا تھا۔ ارے یہ کیا! اس کے ہاتھ میں تو ایک بہت بڑا چمکا ہوا چھرا موجود تھا۔ وہ ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ چند قدم ان سے دوری پر تھا۔ وہ دونوں ہر طرف سے بے خبر ایک دوسرے کو دیکھنے میں مہمک تھے۔ بارش چمچ چمچ برسی رہی تھی۔ لیکن آنے والے وقت کا ان دونوں کو کچھ پتہ نہ تھا۔

گیش نے اپنے ہاتھ میں موجود چھرے کو نظر بھر کر دیکھا، اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر آنا فانا گیش نے پشت سے امر کی پائیں سمت پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ امر کی دلخراش چیخ نکلی تو گیش بھی۔

اور پھر اس سے ترنت ایک شیش ناگ نے گیش کے پاؤں پر اپنا ڈنک مار دیا اور اس طرح گیش کی چیخ سنا دی۔ یہی نہیں اسی ثانیہ لاج وئی نے بھی بجلی کے کوندے کی طرح چھرا گیش کے دل کی جگہ گھونپ چکی تھی۔ گیش تڑپ رہا تھا۔ امر شانت ہو چکا تھا۔ لاج وئی کی نظر میں امر پر مرکوز تھیں کہ پھر اچانک لاج وئی گیش کی طرف بچی اور اس کے سینے سے چھرا نکال کر پورے کا پورا چھرا اپنے دل میں اتار لیا۔

”.....!.....!.....! امر۔“ لاج وئی نے دلخراش اور دل بھڑا دینے والی چیخ چاروں اور کو دہلائی۔ دیوار پر نظر آنے والا منظر کس قدر غائب ہو گیا۔

اور میرے پہلو میں بھی ہوئی لاج وئی کی حقیقت میں دلخراش چیخ ”امر۔“ امر۔“ پورے کمرے کو دہلائی۔ لاج وئی اب مجھ سے لپٹ چکی تھی۔ اس کی سانسیں دھوکے کی طرح چل رہی تھیں۔ اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بازو میرے گلے میں

ڈال رکھے تھے۔ وہ میری طرح بانپ رہی تھی۔ اس کی ہانپی بے آب کی طرح حالت کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی اسے پوری طاقت سے پیچھنچ لیا تھا۔ کئی منٹ تک ہم دونوں اسی کیفیت میں رہے اور پھر زور دہرے سے پھیرا ہوا طوفان آیا اور ہم دونوں کو تہہ و بالا کر کے گزر گیا۔

کافی دیر بعد جب ہمارے حواس بحال ہوئے تو میں لاج وئی کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگا۔ کئی منٹ گزرنے کے بعد اس نے اپنی محور نگاہیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں میں گہرے رنگ کی سرخی نظر آ رہی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے دیکھ کر میں گویا ہوا۔

”لاج وئی یہ سب کیا ہے؟ میرا تمہارا بچپنا، جوانی، اور پھر گیش ناکی لڑکے کی دشمنی، اور پھر اس کا مجھے قتل کرنا، اسے سانپ کا ڈنسا، پھر تمہارا اس پر جھپٹ کر اسے قتل کر دینا، یہی نہیں بلکہ تم نے خود کو بھی مار لیا۔“

”امر یہی تو اصل حقیقت ہے کہ ہم دونوں کا جنم جنم کا ساتھ ہے۔ ہر جنم میں ہم دونوں کا ملاپ نہ ہوا کوئی نہ کوئی دشمن ہم دونوں کو الگ کر تا رہا۔“

امر، میں جنم جنم سے تمہارے پیار کی پیاسی ہوں، میں ڈولی میں نہیں بیٹھی، ہم دونوں کا لگن نہیں ہوا۔ ہم دونوں منڈپ میں نہیں بیٹھے، امر تمہارے لئے میں جنم جنم سے بھگ رہی ہوں، پل پل تمہاری چاہ میں سرگرداں ہوں۔

ہر جنم میں، میں بھگوان سے پرارضا کرتی ہوں کہ بھگوان ہم دونوں کا کسی جنم میں تو ملاپ کرادے تاکہ میرے من کو شانتی ملے، میں نا امید نہیں ہوں، مجھے پکا یقین ہے کہ ہمارا ملاپ ضرور ہوگا۔ اب تم مجھے مل گئے ہو، میں کسی صورت بھی اب اپنے سے دور نہیں جانے دوں گی۔

میں ہر جنم میں تمہاری چاہت میں اکیلی رہی ہوں، اور یہی حالت تمہاری ہے، جس طرح میں تمہارے لئے تڑپتی ہوں اس طرح تم میرے لئے نہیں

ترتیب، وجہ یہ ہے کہ میں نے تم سے پیار کیا ہے، میں نے تمہیں چاہا ہے، میں نے تمہیں اپنے من مندر کا بھگوان جانا ہے، کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں آیا کہ ہم دو پریمی جنم سے ایک دوسرے کو پانے کے لئے ترس رہے ہیں۔

یہ بھی بھگوان کی کرپا ہے کہ ہم دونوں انسانی روپ میں جنم لے رہے ہیں، انہیں تو ایک انسان ایک جنم کے بعد یا پھر بھگوان کی اچھا کے مطابق انسان سے کسی جانور کے روپ میں جنم لیتا ہے، دیوتا سے میرے پرارتنا کا اور پوجا کا صلہ ہے کہ ہم دونوں انسان کے روپ میں جنم لے رہے ہیں۔

لیکن لاج دینی مجھے ابھی بھی یاد نہیں آرہا ہے کہ حقیقت میں جو اس منظر میں جو جان تھا۔ امرادہ میں ہوں۔ چلو اگر تمہاری بات میں مان بھی لیتا ہوں کہ ہم دونوں کئی جنم سے ایک دوسرے کے لئے اس دنیا میں آ رہے ہیں۔

لیکن اصل بات یہ ہے کہ بقول تمہارے ہماری شادی کیوں نہیں ہو سکی ہے۔ اور شادی نہ ہونے کا اصل بھید کیا ہے؟ میں نے کہا۔

”امریہ بھگوان کی لپٹا ہے اور اسے بھگوان ہی جانتا ہے۔ تم چتتا نہ کرو، میں تمہیں اس سے پچھلے جنم کے واقعات دکھلائی ہوں شاید کچھ تمہیں یاد آجائے۔“

اسی دیوار کی طرف اس نے اپنی پھیلی کارن کیا تو اس کی پھیلی سے برقی لہریں نکل کر دیوار پر پڑیں اور پھر دیوار روشن ہو گئی۔ چند لمبے بعد دیوار پر منظر نظر آیا۔

ایک سبز سبز شاداب گاؤں ہے، رات کا سہ پہر، پورن ماشی کا چاند اپنے جوبن پر ہے، چاندنی ہر طرف اپنا جوبن دکھلا رہی ہے، اتنا سہانا اور خوب صورت سا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ وہ سماں اسی طرح قائم دوام رہے۔

پھر ایک گھر نظر آیا۔ اس گھر کا آنگن بہت بڑا ہے۔ آنگن میں ایک طرف نیم کا ایک درخت ہے، اس گھر میں چند عورتیں جمع ہیں اور کئی مردیم کے درخت

کے نیچے چار پائی ڈالے بیٹھے ہیں، ان کے سامنے حقہ رکھا ہے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہر کوئی حقہ پی رہا ہے کہ اتنے میں ایک بوڑھی عورت کمرے سے نکلتی ہے اور قریب آ کر بولتی ہے۔ ”جگدیش خوش ہو جا، بھگوان نے تجھے کٹکشی دی ہے۔ بڑی خوب صورت چندرماجھی تیرے گھر کٹکشی آئی ہے۔“ اور یہ بول کر وہ عورت دوبارہ کمرے میں چلی جاتی ہے۔

چارپائی پر بیٹھے لوگوں میں سے ایک آدمی اٹھتا ہے، لگتا ہے وہی جگدیش ہے، ایک تھالی میں اس کے پاس ہی گڑموجود تھا۔

وہ بولتا ہے۔ ”بھائیو! گڑ سے منہ میٹھا کرو، بھگوان کی کرپا ہے کہ اس نے پتری سے لوازا۔“ اور پھر تھوڑا تھوڑا گڑ سب کے منہ میں ڈالتا ہے۔

گڑ کھا کر سب بولتے ہیں۔ ”جگدیش تجھے بہت بہت بدحالی ہو۔ اب تو آرام کر اب ہم لوگ اپنے گھروں کو چلتے ہیں۔ اور یہ بھی بھگوان کی کرپا ہے کہ تیری گھر والی اور تیری پتری خیریت سے ہیں۔ کل صبح مندر چلے جانا اور چڑھا دو چڑھا دینا۔ پوی دیوتا کو ایسے سے خوش کرنا بہت اچھا ہوتا ہے۔“

”تھیک ہے بھیا! آپ لوگوں کی بہت مہربانی کہ آپ لوگ میرے پاس بیٹھے رہے اور بھگوان سے میرے اور میری گھر والی کے لئے پرارتنا کرتے رہے۔ صبح ہوتے ہی میں مندر ضرور جاؤں گا اور دیوی کے چنوں میں دل کھول کر چڑھا دو چڑھا دوں گا۔“

جگدیش نے کہا۔ ”منظر میں صبح ہوتی نظر آئی، کوئی نو بجے کے قریب ایک چھ سات سالہ بچہ گھر میں داخل ہوا اور بولا۔ ”رادھا موسیٰ! ماں نے یہ چوڑیاں بھیجی ہیں، اور پوی ہے کہ یہ چوڑیاں چندرماجھی کو پہنا دو۔“ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لال چوڑیاں، جگدیش کی گھر والی رادھا کو دیکھ کر اور ترنت دیکھ چلا گیا۔

پورے گاؤں میں بہت زیادہ چرچا تھا کہ جگدیش کی پتری کی خوب صورتی سے چاند بھی شرما

جائے۔ جسے دیکھ کر وہ اپنے تئیں اس بچی کی خوب صورتی کو لئے بیٹھا ہے سب کی سنتا اور پھر جگدیش بولتا۔ ”یہ تو بھگوان کی کرپا ہے، بھگوان جو چاہے ہو سکتا ہے، بس بھائیو! سب دعا کرو کہ چندرماجھی کا بھاگ اچھا ہو، ارے صورت میں کیا رکھا ہے، سیرت اور بھال میں سب کچھ پوشیدہ ہے۔ اگر کسی کے بھاگ ٹھیک نہیں تو کیا صورت کو لے کر وہ جائے گا۔“

بہر حال گاؤں کے سارے لوگ اس بچی کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ ہر کسی کی خواہش ہوتی کہ وہ اس بچی کو اپنے قریب رکھے، اس کی ماں جس کے گھر بھی اس بچی کو لے کر جاتی تو گھر کی عورتیں اس کی خوب صورتی کو بیان کرتے نہ نکلتی تھیں۔

وقت پر لگا کر اڑنے لگا اور وہ بچی دھیرے دھیرے جوانی کی طرف بڑھنے لگی۔ ابھی جوانی نہیں آئی تھی کہ اس کی جوانی اور خوب صورتی کے چرچے ہر زبان پر تھے، ہاتھ پاؤں اس نے ایسے نکالنے شروع کر دیے تھے کہ وقت سے پہلے ہی وہ جوان لگنے لگی تھی، جب وہ چلتی تو نو جوانوں کے دل دھڑکنے لگتے، نو جوانوں بلکہ بڑوں کی نظر میں بھی اس پر یک کر رہ جاتی تھیں، ہر وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چلتی رہتی تھی، ہر کسی کو اپنا نیت اور پھر پورنظر سے دیکھتی تھی۔

اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ جوانی کی بہاریں لوٹنے لگی۔ وہ جوان کیا ہوئی، گاؤں بھر کے جوانوں کی فینڈیں اچاٹ ہو گئیں۔ جو بھی اس کی نظر نظر اٹھاتا اور یہ سوچتا کہ کاش! چندرماجھی جھ پر مہربان ہو جائے۔ گاؤں میں موجود ہر اس گھر میں رہنے والوں کی خواہش تھی جس گھر میں کہ جوان لڑکے تھے ان کی خواہش ہو گئی تھی کہ چندرماجھی ہماری بیوی بن کر ہمارے گھر میں آجائے۔

گاؤں کا ٹھکانہ بھی اسے بہت ہی پیار و محبت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ اکثر اس کے باپ جگدیش سے بولتا۔ ”ارے جگدیش! اپنی پتری کو گھر میں زیادہ رکھا کر، اسے زیادہ نہ بٹکنے دیا کر، بلکہ یہ کوشش کیا کر کہ باہر کے سارے کام اس کی ماں یا پھر تو کر لیا کر، یا پھر اپنے

لڑکوں سے کر لیا کر، میں تجھے ہمدرد بن کر سمجھاتا ہوں، میری باتوں کا بار نہ مان لیتا۔

جگدیش زمانہ خراب سے خراب تر ہوتا جا رہا ہے۔ تیری پتری نے جو رنگ روپ نکالا ہے، وہ گاؤں بھر کے جوانوں کے لئے غضب کا ہے۔ میری بوڑھی اور تجربہ کار آنکھیں اسے دیکھ کر کبھی کبھی چٹکی کھانے لگی ہیں، بھگوان نہ کرے کوئی سر پھرا، اس پر بری نظر نہ ڈال بیٹھے، آگے تیری مرضی جگدیش۔“

جگدیش بولتا۔ ”ٹھاکر صاحب! آپ کی باتیں سر آنکھوں پر، آپ میری بھلائی کے لئے یہ باتیں کرتے ہیں، آپ اچھے آدمی ہیں اور آپ کے دل میں گاؤں بھر کے لئے ہمدردیاں ہیں۔ اس میں برا ماننے والی کوئی بات نہیں۔ آپ کی باتوں کو میں نے من میں رکھ لیا ہے۔ اور اب سوچنے لگا ہوں کہ جتنی جلدی ہو سکے اس کے ہاتھ پہلے کر دوں۔ اور ہو سکتا ہے کہ اگلی کٹائی کے بعد اس کا گنن کر دوں۔“

”جگدیش تو نے ٹھیک سوچا ہے۔ بھگوان کرے ایسا جلدی ہو جائے، تو گھبرانا نہیں، جہاں تک ہو سکا میں تیری مدد کروں گا۔“

ایک مرتبہ تو ٹھاکر نے یہاں تک کہہ دیا تھا۔ ”ارے جگدیش، میں تو ذات برادری سے مجبور ہوں، ورنہ میں ہی تیری پتری کو اپنی بہو بنا لیتا۔ یہ تو سب گاؤں والوں کو معلوم ہے کہ میں ذات برادری کے معاملے میں زیادہ کٹنگ نہیں، مگر پھر بھی یہ رکھوں گا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

نہیں سن کر جگدیش بولا۔ ”ٹھاکر صاحب میں ہی کیا بلکہ سارا گاؤں جانتا ہے کہ آپ جیسا ہمدرد اور دیا لو کبھی کوئی اس گاؤں میں گزرا ہی نہیں اور نہ ہی کبھی سننے میں آیا ہے کہ آپ جیسا رحم دل اور گاؤں والوں کا خیال رکھنے والا کوئی اور ہو۔ آپ کی بہت بہت مہربانی کہ آپ ہم سب کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔“

لیکن ٹھاکر کے یہ نسبت، ٹھاکر کا بیٹا پران بہت ہی ادب باش، شربازی اور گھمنڈی تھا۔ اگر اس کا گنن چلتا تو گاؤں بھر کی بہو بیٹیوں کو دن دھاڑے اٹھوا لیتا۔ مگر اپنے

با اصول اور سخت مزاج انصاف پسند باپ کی وجہ سے مجبور تھا۔ مگر پھر بھی موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔

باپ کی سختی کے باوجود چوری چھپے اب تک گاؤں کی لڑکیوں کی عزت پامال کر چکا تھا۔ جس کے ساتھ زیادتی کرتا اس کا منہ زیادہ نوٹوں سے بھر دیتا اور ساتھ ہی کہتا کہ ”اگر شور شرابہ کیا تو پورے گاؤں میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گی اور پھر جان سبے الگ جائے گی۔“

لہذا غریب کی بیٹیاں رو دھو کر اپنی عزت کی خاطر اور سب سے بڑھ کر موت سے بچنے کے لئے خاموش ہو جاتی تھیں۔

اس کے اپنے گاؤں کے علاوہ دوسرے گاؤں کے کئی لوگوں سے دوستانہ تھا۔ وہ بھی اس مزاج کے یعنی شرابی کہانی تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ خود کسی کے سامنے نہیں آ سکتا تو دوسرے گاؤں والوں کو ان کے پیچھے لگا دیتا تھا اور گاؤں والے اس لئے بھی ڈرتے تھے کہ اس کا باپ گاؤں کا ٹھاکر، گاؤں بھر کے لوگوں کی بڑھ چڑھ کر مدد کیا کرتا تھا اور خاص طور پر شادی بیاہ میں ٹھاکر زیادہ مدد کرتا تھا، اور وہ بھی اگر لڑکی کی شادی ہوتی تو زیادہ مدد کرتا تھا۔

لوگ بھی سوچ کر اور بھی اس کے بیٹے کی غلطیوں کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے کہ آخر اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے۔

جلدیش کے پڑوس میں ولیپ رہتا تھا۔ یہ وہی لڑکا تھا جب چندر کبھی پیدا ہوئی تھی تو صبح ہی صبح اس کی ماں نے اس کے ہاتھوں چندر کبھی کے لئے چوڑیاں بھجوائی تھیں۔ ولیپ بہت ہی گھبر اور دیکھنے والا نوجوان تھا۔ بہت زیادہ سختی اور ہر کسی کے کام میں کام آنے والا، جس کا بھی کوئی کام ہوتا تو وہ بڑھ چڑھ کر کام کر دیتا تھا۔

اگر یہ کہا جائے کہ ولیپ گاؤں بھر کے لئے آنکھوں کا تار تھا تو یہ جھوٹ نہیں۔

ولیپ اکثر چندر کبھی کو چوری چوری اپنی نظروں سے دیکھتا کرتا تھا۔ مگر کبھی بھی اپنے دل کی بات کا اظہار

نہیں کیا تھا اور نہ ہی کبھی اپنے دوست یا روں کے درمیان بیٹھ کر چندر کبھی کے متعلق کوئی بات کرتا تھا۔ مگر یہ بات چندر کبھی سے چھپی نہیں تھی کہ ولیپ دل کے ہاتھوں بھید ہو کر اسے دیکھتا ضرور ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر عورت ہر مرد کی نظر میں کا زادی بہت بھانپ لیتی ہے کہ اس کے لئے اس کے دل میں کون سا جذبہ کار فرما ہے۔

دونوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا اور ویسے بھی گاؤں دیہات میں زیادہ پروے وغیرہ کا رواج نہیں ہوتا، گاؤں کے سارے افراد آزادانہ طور پر ایک دوسرے کے سامنے آتے جاتے رہتے ہیں۔

اور پھر ایک دن دوپہر کے وقت چندر کبھی کی ماں نے ولیپ کو بلایا اور ولیپ۔ ”ولیپ پتر! دوپہر کی گاہ سے ہے، گری بچھڑ زیادہ ہی ہے، ذرا چندر کبھی کے ساتھ جا کر اس کے باپ کو روٹی دے آؤ۔“

ولیپ اس وقت خالی ہی بیٹھا تھا۔ فوراً راضی ہو گیا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے چاچی! اگر آپ مجھے روٹی دے دیں تو میں خود اکیلا جا کر چاچا کو روٹی دے آتا ہوں۔“

”ارے نہیں پتر! چندر کبھی بھی تمہارے ساتھ چلی جائے گی، ایک اور بات بھی ہے جو یہ اپنے باپ کو بتلا دے گی۔ میں نے روٹی باندھ دی ہے، چندر اچھ اور ولیپ کے ساتھ چلی جا۔“

”ٹھیک ہے ماں!“ چندر کبھی نے کہا اور روٹی کی گھڑی اٹھا کر ولیپ کے ساتھ جانے کے لئے گھر سے نکل پڑی۔ ان کے گھر سے کھیت تھوڑا دوری پر تھا۔ اتنی گری تھی کہ بٹو بچو، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ پاؤں کا پسینہ سر کو چڑھ رہا تھا۔ آدھے راستے جاتے جاتے چندر کبھی کا تو برا حال ہو گیا۔ وہ بولی۔ ”ولیپ اس گری نے تو مجھے ہلکان کر دیا، اب مجھ سے چلتا دو گھر ہوا ہے۔“

چندر کبھی کی بات سن کر بولا۔ ”اچھا ایسا کرتے ہیں، وہ سامنے جو بڑ کا درخت ہے اس کے نیچے بیٹھ کر تھوڑی دیر سستائیتے ہیں، جب سانس بحال ہو جائے گی تو پھر چل پڑیں گے۔“

یہ سن کر چندر کبھی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تھوڑی دیر بیٹھ کر سستائیتے ہیں۔“ اور پھر دونوں اس بڑ کا درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ درخت کے نیچے اچھا خاصا سایہ تھا۔ چند منٹ بعد چندر کبھی بولی۔ ”ولیپ ایک بات پوچھوں! دیکھو جھوٹ بالکل نہیں بولنا اور اگر تم نے جھوٹ بولا تو پھر میں ناراض ہو جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے پوچھو! یہ میرا وعدہ ہے کہ میں جھوٹ بالکل نہیں بولوں گا۔“ ولیپ بولا۔

چندر کبھی بولی۔ ”یہ بتاؤ! میں کیسی ہوں؟ اور تمہیں کیسی لگتی ہوں۔“

”چندر کبھی تم اچھی ہو، سندر ہو، سارے گاؤں والوں کو اچھی لگتی ہو اور جہاں تک مجھے کسی لگتی ہو تو۔۔۔۔۔“

بہت سندر لگتی ہو، بلکہ میں تو کہوں گا کہ تم سے زیادہ سندر سارے سنسار میں کوئی اور نہ ہوگا، تمہاری سندر تباہی مثال ہے۔“ ولیپ بولا۔

ولیپ کی باتیں سن کر چندر کبھی مسکرائے لگی اور غور سے ولیپ کو دیکھنے ہوئے بولی۔ ”ولیپ کیا یہ سچ ہے کہ تم مجھ سے پریم کرتے ہو؟ مگر تم نے اس کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ ولیپ دیے تم بہت کٹھور ہو، کاش! کہ تم اپنے دل کی بات اپنی زبان پر لے آتے، مگر تم بہت گہرے بھی ہو، میں تمہارے دل کی بات جانتی ہوں کہ تم گاؤں بھر کے تمام لوگوں سے بڑھ کر مجھے چاہتے ہو، اور یہ بھی آج بھگوان کی کرپا ہے کہ آج بھگوان نے یہ موقع دیا کہ میں تمہارے ساتھ آئی تاکہ تمہاری زبان سے تمہارے دل کی بات سن سکوں، دیکھو مجھے جھوٹ مت بولنا۔“

چندر کبھی کی یہ باتیں سن کر ولیپ غور سے چندر کبھی کو دیکھنے لگا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”سندر کبھی یہ بات درست ہے، میں تم سے پریم کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا، کبھی اس کا اظہار کرنے کی ہمت نہ ہوئی کہ تم کتنی ناراض نہ ہو جاؤں، اور پھر اس ناراضگی کی وجہ سے جو میرے سامنے آئی ہو، وہ سامنے آنا ہی بند کر دو، لہذا اپنی باتوں کی وجہ سے میں نے اپنی زبان بند کر لی اور آج تمہارے پوچھنے پر میں نے سچ اچھل دیا۔ اب

تمہاری مرضی لیکن تم سے میری بختی ہے کہ بھگوان کے لئے مجھ سے ناراض نہیں ہونا، اگر میری بات بری لگی ہے تو میرے منہ پر تھپڑ مار دو، لیکن ناراض نہیں ہو۔

اور اگر تم ناراض ہو گئی تو یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں تمہاری ناراضگی کے پیش نظر، مجھ سے تمہاری ناراضگی برداشت نہیں ہوگی اور پھر میں اپنا جیون تیاگ دوں گا، مگر تمہاری ناراضگی۔۔۔۔۔“ اور ولیپ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

ولیپ کی باتیں سن کر چندر کبھی مسکرائے لگی اور پھر بولی۔ ”ولیپ میں اپنے دل کی بات کہہ دوں، کسی سے بولو گے تو نہیں اور ناراض تو نہیں ہو گے، تو اپنے اپنے دل کی بات ہے، جو جس کو اچھا لگے، اور اچھا لگنے والا ہر سے دل میں رہتا ہے، دل تمام کر میری بات سنو! ولیپ میں بھی تم سے پریم کرتی ہوں۔“ اور یہ بول کر چندر کبھی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔

یہ سن کر ولیپ لمبے لمبے سانس لینے لگا، اس کی آنکھیں کھلنے اور جھپکنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد ولیپ نے چندر کبھی کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اس کا چہرہ اوپر کو اٹھایا، اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”چندر کبھی تمہارا بہت بہت دھن دھن دہن نے اس قابل سمجھا، یہ میرا وعدہ ہے کہ میں پوری زندگی تمہاری سندر تباہی کی حفاظت کروں گا۔ ہر بل میری کوشش ہوگی کہ تم ہر وقت مسکراتی رہو، میں تمہارے سارے دکھ اپنے سر لے لیا کروں گا، میں زندگی بھر تمہاری پوجا کروں گا۔“ اور پھر ولیپ نے ایک لمبا سانس کھینچا۔

چندر کبھی بولی۔ ”اس کا ذکر کسی اور سے نہیں کرنا بلکہ خاص طور پر اپنے دوستوں میں۔“

”ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا، میں ماں کو بہت جلد تمہارے گھر بھیجوں گا، تم اس کا خیال رکھنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری ماں اور تمہارے باپ اس رشتہ سے انکار کر دیں، اس کے لئے میری بختی ہے تم سے، میری خوشیوں اور چاہت کا سارا دار و مدار اب تم پر ہے۔“ ولیپ بولا۔

”تم گھبراؤ نہیں، وہی ہوگا جو میں چاہوں گی، اچھا اب اٹھو، باپو کی روٹی کا انتظار کر رہے ہوں گے۔“
تھوڑی دیر میں دونوں اس کھیت میں پہنچ گئے، جہاں چند رکھی کے باپو کام کر رہے تھے۔ دونوں کو دیکھ کر بولے۔ ”اے رے دلیپ بیٹا! تم تمہیں میری وجہ سے کشت اٹھانا پڑا، آج دینے بھی گری زیادہ ہے، چند رکھی تو نہ آتی اتنی گری میں۔“

دلیپ بولا۔ ”مچا چاچی کوئی بات نہیں، گری ہے تو کیا ہوا، آپ بھی اور پھر سارے لوگ گری میں کام کر رہے ہیں۔ چاچی نے مجھ سے کہا کہ تم چند رکھی کے ساتھ چلے جاؤ گری زیادہ ہے اور پھر دوپہر کا وقت بھی ہے، اور آج آپ اپنے ساتھ روٹی نہیں لائے تھے، خیر آپ باتوں کو چھوڑیں اور جلدی سے روٹی کھالیں۔“
اور وہ روٹی کھانے میں مصروف ہو گئے۔ جب وہ روٹی کھا چکے تو دونوں واپس آ گئے۔

ادھر ٹھا کر کاواش اور شرابی بیٹا ہران، ہاتھ دھو کر چند رکھی کے پیچھے بڑھ گیا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا کہ ”اب میرا چند رکھی سے دور رہنا ممکن نہیں۔ اب تو چند رکھی کی یادیں مجھے رات میں سوئے بھی نہیں دیتیں اور پھر یوروں بے چینی میں گزر جاتا ہے۔ بہر حال میں اپنی جان پر کھیل کر چند رکھی سے اپنی پیاس ضرور بجھاؤں گا۔“ اس کے دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ ”ہم ہر حال میں تیرے ساتھ ہیں۔ جس طرح تو نے کئی لڑکیوں کے ساتھ کھلوڑا کیا۔ اسی طرح اس کے ساتھ بھی کر گزر۔“

اور پھر ایک دن دوپہر میں چند رکھی دلیپ کے ساتھ اپنے باپو کے لئے روٹی لے کر جا رہی تھی۔ راستے میں ہران اپنے تین دوستوں کے ہمراہ ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ جب وہ دونوں اس درخت کے پاس سے گزرنے لگے تو ہران بولا۔ ”چند رکھی اس طرح اٹھلا کر جانا ٹھیک نہیں، آخر میں بھی تو مرد ہوں، مجھ میں کیا کمی ہے، کبھی ہمارا دل بھی خوش کر دو۔“

یہ سن کر چند رکھی پھر گئی اور بولی۔ ”بے شرم

مجھے شرم نہیں آتی، ایسی بات کرتے ہوئے، آج میرا ٹھا کر کا کا کے پاس ضرور جاؤں گی اور تیری ان باتوں کے ان کے سامنے رکھوں گی۔“ چند رکھی کا یہ بولنا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ آگے بڑھا اور چھپت کر چہرہ رکھی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

یہ دیکھتے ہوئے دلیپ پر تو جیسے جنوں سوار ہو گیا اور وہ شیر کی مانند پران پر چھٹا اور اپنے سر کی نگر اس کی ناک پر ماری۔ جس سے پران کی ناک سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ اور اس اثناء میں چند رکھی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔

پران دھاڑ کر بولا۔ اپنے دوستوں سے۔ ”سارے کو پکڑ لو، بچ کر نہ جانے پائے، اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔“ اس کے تینوں دوست فوراً آگے بڑھے اور دلیپ کو دبوچ لیا۔

چند رکھی سکتے کے عالم میں ایک طرف کھڑی تھی، لیکن پھر اچانک چونک بڑی اور پران کی جانب چھٹی لیکن اس وقت تک دیر ہو چکی تھی، پران اپنے بچنے میں اڑسا ہوا بڑا چاقو دلیپ کے سینے میں گھونپ چکا تھا۔ دلیپ نیچے گر کر ترپنے لگا تھا۔ دلیپ کا خون دیکھ کر چند رکھی پر جیسے جنوں سوار ہو گیا اور اس نے دلیپ کے سینے سے جھبٹ چاقو کھینچا اور شیرنی کی طرح پران پر چھٹی۔

لیکن اس سے پہلے کہ پران کے زرخے پر چاقو بڑتا۔ پران نے پھرتی سے چند رکھی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر نیچے کی طرف موڑ دینے لیکن ہاتھ زیادہ نیچے مڑنے کے بجائے ہاتھ والا چاقو چند رکھی کے سینے میں پھنس گیا۔ اور پھر تیزی سے خون نکل کر چند رکھی کے کپڑوں کو رنگنے لگا۔ چند رکھی تیار کر گری لیکن پھر اچانک ہوا میں اڑتی ہوئی چاقو کا بھر پور وار پران کے زرخے پر کیا۔ پران کا زرخہ اکٹ چکا تھا اور پران اپنا زرخہ پکڑے اور ادھر لہرانے لگا تھا اور پھر لہراتے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔ یہ تمام خونی معاملہ ایک جھپٹے میں ہوا تھا۔

ادھر چند رکھی بھی دلیپ کے سینے پر سر رکتے

ساکت ہو چکی تھی۔ یہ خونی معاملہ دیکھ کر پران کے تینوں دوست سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ دیوار پر ابھرنے والا منظر اچانک بہت واضح ہو گیا اور ساتھ ہی قریب آ کر بڑا ہوا تو میں جیسے اچھل پڑا۔ نیچے گرا ہوا مردہ حالت میں، میں خود تھا اور میرے سینے پر سر رکھ کر مردہ حالت میں لا لاج دیتی تھی جو کہ اس وقت میرے پیلو میں بیٹھی تھی۔

اور پھر مجھے اچانک لا لاج دیتی کی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ لا لاج دیتی بری طرح تسک رہی تھی۔ میں نے لا لاج دیتی کو اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا، کافی دیر تک ہم دونوں بے حس و حرکت ساکت رہے، پھر میں نے کہا۔ ”لا لاج دیتی۔“

میرے منہ سے اپنا نام سن کر اس نے اپنا چہرہ اوپر کو اٹھایا اور بولی۔ ”اس تم نے دیکھ لیا، دشمنوں نے ہمارا ملاب اس جنم میں بھی نہیں ہونے دیا۔“

اس میں تمہیں پانے کے چکر میں ہر جنم میں دکھ جمیلی ہوئی آ رہی ہوں اور میرے ساتھ ساتھ تم بھی اذیت کا شکار بن رہے ہو۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ایک ناری جو کہ بہت کم ہمت اور کم حوصلہ ہوتی ہے، وہ کہاں تک دکھوں کو جھیلے اور اپنے پریمی کو حاصل کرنے کے لئے بار بار ہر جنم میں بھگوان سے پراعتنا کرے کہ اس کا پریمی اسے مل جائے۔

اس میں ہمت ہارتی جا رہی ہوں مگر صرف تمہارا پریم، تمہاری چاہت اور تمہارا قرب مجھے ہر جنم میں با حوصلہ بناتا ہے اور میں تمہیں پانے کے لئے تمہارا راستہ نکلتے نکلتے میری آنکھیں جیسے پتھر گئی ہیں۔

اس پر مجھے سات جنموں تک جنم لینا پڑے تو بھی میں ہمت نہیں ہاروں گی۔ میں نے کمر باندھ لیا ہے، کہ برصورت میں، میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گی، بلوکم کیا کہتے ہو، کیا تمہارا دل میرے دکھوں اور چاہت کو دیکھ کر ذرا بھی نہیں ہلکتا، کیا تمہیں میری چاہت نہیں، کیا تم نہیں چاہتے کہ میں تمہیں حاصل کر لوں، کیا تمہارے من میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں، کیا میں اس طرح جنم

لیتی رہوں گی اور ہر جنم میں تمہارے ساتھ منڈپ کے چکر دو کو پورا نہیں کر پاؤں گی؟“
”لا لاج دیتی، میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ سب بھگوان کی اچھا سے ہورہا ہے، نہیں معلوم کہ بھگوان کیا چاہتا ہے، اور ابھی تک اپنے کسی جنم کا کوئی واقعہ بھی یاد نہیں آ رہا ہے۔“

”اس تمہیں بتیے سے کے واقعات ضرور یاد آئیں گے، میں تمہیں یاد کرانے رہوں گی اور مجھے دھواں ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ضرور ہو جاؤں گی۔“

لا لاج دیتی کی آنکھوں سے آنسو اب رواں ہو چکے تھے، اس نے اپنے سیدھے ہاتھ کا رخ دیوار کی طرف کیا تو ہاتھ کی تھیلی سے چنگاریاں نکلیں اور دیوار کے پاس جا کر دیوار میں چوست ہو گئیں، اور دیوار سفید روشنی میں نہا گئی۔

پھر عجیب و غریب منظر ابھرا، اس مرتبہ میں نے خود کو جوان پایا، میری شکل واضح تھی، میں فوجیوں کے لباس میں ملبوس تھا، پھر کی دربار کا منظر ابھرا، اس بار میں ایک عالی شان کرسی پر بیٹھا تھا، دربار کی بادشاہ کا تھا، اس دربار میں اوپر کی جانب زنان خانہ تھا، جہاں کہ شہزادی اور اس کی خادماں موجود ہوتی ہیں۔ لا لاج دیتی اپنے منہ پر آدھا نقاب ڈالے بیٹھی میری طرف نظرس جمائے مسکرا رہی ہے۔ مہاراجہ میرا نام لے کر پکارتا ہے۔ میں اپنا نام سن کر اپنی جگہ کھڑا ہو جاتا ہوں۔ مہاراجہ کی آواز پھر سنائی دیتی ہے۔ ”رنجیت تم میرے پتر ہو، تم راج کار ہو، میں ہی کیا دربار میں جیتنے بھی لوگ موجود ہیں سب کے سب تمہاری بہادری کے قائل ہیں۔ تم نے بڑے بڑے دشمنوں کو شکست سے دو چار کیا ہے۔ میں نے بہت دھار کیا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کیوں نہ تمہیں سپہ سالار بنادیا جائے۔“

اور تمہارے اس عہدہ کے لئے سارے درباری متفق ہیں۔ سب کی رائے تمہارے حق میں ہے۔ لہذا آج سے تم سپہ سالار کی ذمہ داریوں کو سنبھالو اور ہر محاذ پر

دشمنوں کے دانت کھٹے کر دو، جو بھی میلی آنکھ سے ہماری سلطنت کو دیکھنے کی ہمت کرے اس کی گردن اس کے دھڑ سے الگ کر دو، مجھے بہت زیادہ امید ہے کہ تم اپنی ذمہ داریوں کو چاک و چوبند طریقے سے نبھائو گے، آج سے تم سینا پتی رنجیت ہو۔“

اور پھر مہاراجہ نے اپنے سامنے ایک میز پر پڑی ہوئی تلوار اٹھائی اور سینا پتی کو بلا کر اس کے ہاتھ میں تلوار پکڑا دی۔ پھر وہ بولا، ”رنجیت یہ تلوار ہمارے پرکھوں کی ہے۔ اس کی عزت، وقار، دبدبہ اور حفاظت اب تمہاری ذمہ داری ہے۔ یہ تلوار ہمیشہ بلند رکھنا، یہ تلوار کسی صورت بھی کسی اور کے ہاتھ میں نہ جانے پائے، میرا آشریہ زاد تمہارے ساتھ ہے۔“

یہ سننا تھا کہ دربار میں موجود تمام لوگ اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے اور ”سینا پتی رنجیت..... سینا پتی رنجیت“ کے نعرے لگائے گئے۔

پھر مہاراجہ نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو نعرہ لگانے سے منع کیا اور بولا، ”رنجیت اب تم جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔“ یہ سنتے ہی میں پلٹا اور واپس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اوپر بالکونی میں بیٹھی لاج وئی کی مشرقی ہوئی نظریں میرے اوپر مرکوز تھیں۔ میں نے بھی جب بھر پور نظر سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے اپنی گردن ہلکی سی خم کی اور مجھے بدھا کی دی۔

تھوڑی دیر بعد مہاراجہ نے دربار برخواست کرنے کا اعلان کیا تو سب اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر چلے گئے، جاتے جاتے میری نظریں اچانک بالکونی کی طرف گئیں تو دیکھا کہ لاج وئی ہاتھ کے اشارے کر رہی تھی۔ میں نے بھی ہاتھ اٹھا کر اپنے ماتھے پر پھیر لیا۔

مجھے سینا پتی کی ذمہ داری سنبھالنے چند دن ہی گزر رہے تھے۔

وہ رات بہت اندھیری تھی۔ اماؤس کی راتیں شروع ہو چکی تھیں، اچانک ہمارے خبروں نے خبر دی کہ فلاں سلطنت کی فوجیں ہم پر حملہ کرنے والی ہیں اور کسی بھی رات میں ایسا ہو جائے گا۔

اس خبر کے ملتے ہی ہم نے زور و شور سے اپنی تیاری شروع کر دی۔ رات میں تمام سیناؤں کو چکر کر دیا جاتا تھا۔ یہ کئی گھنٹے کی دشمن رات میں ہی حملہ کرے گا۔ مہاراج کا میرے لئے حکم تھا کہ اگر حملہ زبردست ہو اور پھر بچاؤ کی کوئی تدبیر نظر نہیں آئی تو میں اپنی سیناؤں کو لے کر اس جگہ سے نکل جاؤں اور پھر بعد میں دشمن پر چڑھائی کروں کیونکہ اکثر فتح کے بعد لوگ جشن مناتے ہیں اور ہونے والے حملہ کو بھول جاتے ہیں۔ اس تدبیر پر مجھے عمل کرنا تھا۔

اور پھر ایک رات دشمن نے ہم پر واقعی حملہ کر دیا۔ میرے لوگوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ہمارے قدم اکٹھے گئے اور ہم مہاراجہ کے حکم کے مطابق فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ پوری راج دھانی میں خون کی ندیاں بہا دی تھیں۔ لوگوں کو دشمنوں نے گاجرمولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ محل میں موجود سب کے سب موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ قتل ہونے والوں میں لاج وئی بھی شامل تھی۔

میری دنیا تباہ ہو گئی۔

لیکن میں نے دشمن سے بدلہ لینا تھا۔ اس حوصلے اور ہمت کی بدولت میں زندہ تھا۔ بھاگتے بھاگتے ہم ایک گھنے جنگل میں پہنچ گئے۔ جب ہم نے اطمینان کر لیا کہ ہم دشمن کی پہنچ سے کافی دور نکل آئے ہیں تو ہم نے جنگل میں پڑاؤ ڈال دیا۔

اس جنگل میں کئی دن بیت گئے۔ پھر سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ اس جنگل سے نکلنا موت کو دعوت دینا ہے۔ بلکہ اس جنگل میں رہتے ہوئے ہم اپنی طاقتیں بڑھا سکتے ہیں اور پھر کسی بھی رات اچانک حملہ کر کے دشمن کو نیست و نابود کر سکتے ہیں۔

جہاں پر ہمارا پڑاؤ تھا وہاں سے تھوڑی سی دوری پر اپنی کنیاش میں ایک سادھو رہتا تھا۔ اس سادھو کے ساتھ اس کی ایک بہت ہی سندر پتھی بھی تھی۔ سادھو نے کئی بکریاں پال رکھی تھیں۔ میں ہر روز بلا تاغہ سادھو کی کنیاش میں جاتا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر سادھو سے باتیں کرتا اور پھر

اٹھ کر چلا آتا۔ یہ روز کا معمول بن گیا تھا کہ سادھو کی پتھی سادھو کے حکم پر بکری کا تازہ دودھ ایک مٹی کے پیالے میں ڈال کر دیتی اور میں بلا جھجک وہ دودھ پی لیتا۔ میں نے اپنی ساری کٹھا سادھو کو سنا دی تھی۔ جسے سن کر سادھو بہت بے چینی ہوا تھا۔ وہ سادھو بہت زیادہ مہینے تھا۔ جاوہر میں اس کی پہنچ بہت اوپر تک تھی۔

روز روز کے آنے جانے سے سادھو کی پتھی مجھ سے بہت زیادہ مانوس ہو گئی تھی۔ سادھو کا بھروسہ بھی مجھ پر زیادہ ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی میں دوسرے کے وقت بھی چلا جاتا تھا اور پھر ہم دونوں بکریوں کو لے کر کنیاش سے دور جنگل میں نکل جاتے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہم دونوں قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔

ویسے بھی سادھو کی پتھی اپنے باپ کے ساتھ جنگل میں رہتے رہے جنگل کی زندگی سے اور وہ بھی بالکل اکیلی اکیلی تھی۔ چونکہ انسان معاشرتی کڑا ہے لہذا ہر انسان جو کہ باشعور اور ہوش مند ہوتا ہے وہ انسان کے درمیان رہنا پسند کرتا ہے۔ جب میں کنیاش میں جاتا تو سادھو کی پتھی دیکھتے ہی جھپکے لگتی تھی۔ اس کی خوشیاں کئی گنا بڑھ جاتی تھیں۔ اس میں جیسے کئی بھجڑیاں تھیں۔

جب ہماری قربت زیادہ ہو گئی تو سادھو کی پتھی جس کا نام گنگا تھا اس نے برملا اظہار کر دیا۔ ”بالاجی آپ مجھے اپنی دنیا میں لے چلیں، میں سارا جیون آپ کے چرن دھو دھو کر پیوؤں گی۔“ ہر روز راز و نیاز کی باتیں ہونے لگیں۔ سادھو ہم دونوں پر بھروسہ کرتے ہوئے جنگل سے دور نکل جایا کرتا تھا۔ مانگتے مانگتے دسوا سلف لانے کے لئے۔

اور پھر ایک دن ہم دونوں نے جذبات کے رو میں بہہ کر وہ کچھ کر لیا جو کہ ہمیں نہیں کرنا چاہئے تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ سادھو سامنے کھڑا تھا، اس کی غصہ برساتی سرخ آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ترشول تھا۔ اس نے غصہ ناک حالت میں ترشول کا درن اپنی پتھی کی طرف کر دیا تو ترشول کی نوک

سے چنگاریاں نکل کر گنگا کے جسم میں گھسنے لگیں۔ گنگا کی چیخیں پورے جنگل کو ہلانے لگیں۔ اور پھر چند منٹ میں ہی اس کے پورے وجود میں شعلے بھڑکنے لگے۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تمام حالات کو آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر مجھ میں اتنی سکت نہیں بچی تھی کہ میں سادھو کو رک سکوں یا گنگا کے جسم پر بھڑکتے شعلوں کو بجھا دوں۔ چند منٹ نہ لگے اور گنگا اپنی جگہ جل کر راکھ میں تبدیل ہو گئی۔

اچانک سادھو کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”پانی! اب میری نظروں سے دور ہو جا، میں نے تجھ پر بھروسہ کیا اور تو نے میرے بھروسے پر پانی بھیر دیا۔ میرا شراب ہے کہ تو بھی کبھی سکھی نہیں رہے گا۔ اور کبھی نہیں بلکہ ہر پون ماشی کی رات میں ایک بچہ میرے پاس لائے گا اور اس بچے کی ٹہنی میں دوں گا، اور یہ بھی کان کھول کر سن لے کہ تو وقتاً فوقتاً اپنے خاندان سے بھی بچہ میرے پاس لائے گا۔ اور تو اپنا پہلا ستان (بچہ) بھی میرے پاس لائے گا اور میں تیرے سامنے تیرے ستان کی ٹہنی دوں گا۔

تو کئی جنموں سے ختم لے رہا ہے اور ہر جنم میں تو ایک ناری سے بچھڑ جاتا ہے، وہ ناری تیرے پریم میں بار بار جنم لے رہی ہے۔ تیرے پریم میں وہ چلتی رہتی ہے تم دونوں کا وہاں نہیں ہوتا، تم دونوں اکیلے موت کا شکار ہو جاتے ہو، مگر اب تو وہاں کرے گا کسی اور ناری سے، اب تیرا اس جنم والی ناری کی آتما سے چھٹکارا مل جائے گا، مگر مجھ سے تیرا چھٹکارا پانا ناممکن ہے، تو مرنا بھی چاہے تو مر نہیں سکے گا۔“ اور پھر اس سادھو نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میری گردن پکڑ لی۔ اس کے ہاتھ کے لمبے ناخن میری گردن میں پیوست ہو گئے اور میں درد سے بلبلہ کر چیخ پڑا اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔

اب میں ہوش و حواس میں تھا، اندھیری جگہ، ہر طرف ہو کا عالم، میں آنکھیں میچاڑے چاروں طرف دیکھنے لگا مگر لاکھ کوشش کے باوجود مجھے کچھ بھی نظر نہیں آئے دے رہا تھا، خیر میں مایوس ہو کر نیچے ٹولا تو

میں کافی حیران پریشان ان ترشوں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس قدر بے شمار فاصلے پر ترشوں کیوں سڑک کے کنارے زمین پر گاڑے گئے ہیں۔ میرے ذہن میں آیا کہ ترشوں تو بہت زیادہ پوتہ ہوتے ہیں اور ہر سنیا سی، سادھو اور سنسار تیا گئے والے کے ہاتھ میں ترشوں چاہے چھوٹا ہو یا بڑا جو ضرور ہوتا ہے۔

اب کوئی بھی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں کوئی دو گھنٹے تک ان ترشوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا کہ اچانک مجھے ایک مندر کا گنبد نظر آیا۔ تو میری جان میں جان آئی۔

اور میں زیادہ تیز تیز چلا ہوا مندر کے اور بڑھنے لگا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ بعد میں مندر کے سامنے پہنچ گیا۔ مندر کے باہر کئی لوگ موجود تھے۔ شاید وہ سب مندر میں دیوی کے چروں میں چڑھاؤ چڑھانے آئے تھے، میں نے ان لوگوں پر ایک اچھٹی نظر ڈالی اور پھر مجھے زبردست چکر آیا، میں تورا کر نیچے زمین پر گر گیا اور میری آنکھوں میں تاریکی چھائی چلی گئی۔

کچھ بھی ہوش نہ رہا تھا اور جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک کمرے میں پایا۔ میں ایک دروازے پر بیٹھا بیڑا تھا۔ میں کسمسا کر اٹھ بیٹھا اور گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ مجھ میں اب اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ میں اپنے قدموں پر کھڑا ہوں۔

میں کافی دیر تک اسی حالت میں دروازے پر بیٹھا رہا۔ اس کمرے میں سوائے اس دروازے کوئی اور چیز بھی نہیں تھی یہاں تک کہ پانی کا گھڑا بھی نہیں تھا۔ اگر گھڑا ہوتا تو میں گھسٹتا ہوا ایک گلاس پانی پی لیتا۔

میرے دماغ میں سوچوں کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ میں بھی اپنا سر نیچے جھکا لیتا اور کبھی سر اڑھ کر کھڑے ہو کر گھومنے لگتا۔ تقریباً کوئی ایک گھنٹہ بعد ایک شخص اندر آیا، اس نے سفید دھوئی باندھ رکھی تھی، اوپری دھڑ اس کا رنگ تھا اور گلے میں ایک جینو ڈال رکھا تھا۔

”بالک تم اٹھ گئے! یہ دیوی کی کرپا ہے کہ تم

مندر کے سامنے گر کر بے ہوش ہو گئے تھے، دیوی بڑی دیوانو ہے۔ اپنے سیوکوں کا بہت خیال رکھتی ہے، تم بہت دھمی اور کشش میں مبتلا لگتے ہو۔ خیر اب تم چھوڑ کر دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ پنڈت منہ شخص بولا۔ یہ تو مجھے پکا یقین ہو گیا تھا کہ وہ مندر کا پنڈت نہیں تھا کیونکہ اکثر مندر کے پنڈت بڑے گھمنڈی اور گردن اکڑ ہوتے ہیں۔

بولنے کی جگہ میں طاقت نہیں تھی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا کہ ”میں پانی پیتا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی کچھ کھانا بھی چاہتا ہوں کیونکہ میں بہت بھوکا ہوں۔“

میرے ہاتھ کے اشارے کو دیکھ کر وہ فوراً اٹھا اور اپنے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”مظہر، میں ترنت کچھ نہ کچھ لے کر آتا ہوں۔“

چند منٹ بعد ہی وہ واپس آ گیا، اس کے ہاتھ میں پیتل کی ایک تھالی تھی۔ اس نے وہ تھالی میرے سامنے رکھ دی، تو میں نے دیکھا کہ اس تھالی میں کئی پوریاں اور آلو کی بھجیا تھیں۔ وہ بولا۔

”بالک تم کھانا شروع کر دو، میں پانی بھی لے کر آتا ہوں۔“ اور وہ واپس چلا گیا۔ پھر وہ بہت جلد آیا اس کے ہاتھ میں ایک بہت ہی چھوٹا سا سنی کا گھڑا اور ایک مٹی کا پیالہ تھا، اس نے گھڑا اور پیالہ دیوار کے پاس رکھا اور میرے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ ”بالک آرام سے کھاؤ، میں کشن کو بول آیا ہوں، وہ اور بھی پوریاں لے کر آتا ہی ہوگا۔“

ابھی میں نے ساری پوریاں کھائی بھی نہ تھیں کہ ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں بھی پیتل کی تھالی تھی اور تھالی میں گرم گرم پوریاں اور گرم بھجیا تھیں، اس نوجوان نے تھالی میرے سامنے رکھ دی اور اس پنڈت منہ شخص کی طرف دیکھا تو اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ ”اب تو واپس چلا جا۔“ وہ نوجوان ترنت واپس چلا گیا۔

میرے پاس جو بیٹھا تھا۔ مجھے کھانا ہوا بغور دیکھتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں، میں ساری پوریاں بھیجا

کے ساتھ کھا گیا۔ اور پھر گھرے میں سے ایک کٹورہ پانی بنا۔ آج کہتے ہیں کہ پیٹ میں روٹی جاتے ہی انسان میں اندرونی طور پر توانائی بھرنے لگتی ہے۔

پنڈت بولا۔ ”بالک واقعی تم بہت بھوکے تھے، زبردستی نہیں، اس مندر میں تمہارے ساتھ بیٹے ہوئے سارے کٹ ختم ہو جائیں، دیوی مانتا اپنے سیوکوں کا بہت خیال رکھتی ہے۔ اب تم آرام کرو اور ویسے بھی کافی بھوک کے بعد جب منہ کے پیٹ میں کھانا پڑتا ہے تو منہ کو نیند آنے لگتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری آنکھوں میں نیند بھر رہی ہے اور تم پر غنودگی چھا رہی ہے۔“

اب میں چلا ہوں، کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دینا، میں آ جاؤں گا، میرا نام رام لال ہے۔“ اور یہ بول کر پنڈت نے برتن اٹھا لیے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ بھوک کی وجہ سے میں نے کچھ زیادہ ہی کھالیا تھا۔ بھوک میں ہر چیز سوا دوا لی لگتی ہے۔ میں فوراً دروازے پر لیٹ گیا اور اپنے گھر کو یاد کرنے لگا۔ کہاں میں لاڈلیاں ہیں، اپنی پسند کا کھانے والا، نرم بستر پر سونے والا، کبھی کبھار کہیں اور جگہ اگر بستر سخت ہوتا تو آنکھوں سے نیند غائب ہو جاتی۔

میرے دماغ میں آیا۔ ”بھگوان میں کون سی ایسی غلطی کر بیٹھا کہ میں ان حالات سے دوچار ہوا، پھر نہ جانے اور کتنے دن اور اذیت ناک حالات کو بھگتنا پڑے گا۔ میرے گھر والے مجھے نہ پا کر کس تکلیف دہ حالات سے گزر رہے ہوں گے۔ میں کیسے اور کیوں کر اچانک اس جادوگری میں پھنس گیا تھا۔“

اور میں اچانک کس طرح اس نکل میں پہنچا اور پھر وہ جتنی کا ملنا اور اس کے بعد کئی جنموں کے حالات کو سامنے لا کر مجھے دکھاتا اور پھر اس جنگل میں پہنچنا اس کے بعد اس نادی کے پتا سادھو کا غضب ناک ہونا اور شراب کے ساتھ یہ کہنا کہ ہر پورن ماشی کی رات میں ایک منہ کی پٹی.....“ یہ تمام باتیں ایسی تھیں جو کہ میری سمجھ سے باہر تھیں۔

خیر محسن اور بھوک کی وجہ سے میں بے حال تھا،

بھوک مٹ گئی مگر ابھی تک میں محسن سے چور چور تھا۔ پھر میرے دماغ میں تاریکی چھائی چلی گئی اور میں نیند سے دوچار ہو گیا۔

انادس کی راتوں کا اندھیرا پورے علاقہ پر چھا چکا تھا۔ ارد گرد کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ میں بے یار و مددگار ایک طرف کو چلا جا رہا تھا۔ میں کہاں جا رہا تھا۔ یہ معلوم نہ تھا بس میں آگے ہی آگے چلا جا رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک جگہ ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل نیچے گر گیا۔ چوٹ کی درد سے میں بلبلاتا تھا، ابھی میں سننے اور اٹھنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک عجیب کان بھاڑ دینے والی کرخت آواز سنائی دی۔ ”لوئے بھاگ..... اٹھ جلدی کر..... اوئے دیر نہ کر..... یہ رات محسن تیرا خون پی لے گا..... جلدی اٹھ کر بھاگ۔“

اور پھر اس کے ساتھ کسی جانور کی زبردست غراہٹ سنائی دی۔ غراہٹ اتنی زبردست تھی کہ مجھ پر کچھ کی طاری ہو گئی، میں اندر سے سہم گیا مگر جان بچانی تھی اس رات محسن سے، میں جلدی سے اٹھا اور سامنے کی سمت بھاگنے لگا، پھر مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ واقعی کوئی عجیب الخلقت جانور تھا اور وہ مجھے بھی پکڑنے کے لئے میرے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

میرے دونوں ہاتھوں کی منھیاں پہنچی ہوئی تھیں اور میں اندھا وند بھاگ رہا تھا۔ وہ کوئی راستہ نہیں تھا جس پر میں بھاگ رہا تھا جبکہ میرے اندازے کے مطابق وہ کوئی پیتل میدان تھا، میں آگے اور وہ جانور میرے پیچھے بھاگتے بھاگتے میری ٹانگیں جواب دینے لگی تھیں، میرا برا حال تھا، میرا سانس اپنی رفتار سے کئی گنا زیادہ چل رہا تھا۔ میں اس قدر تیزی سے سانس لینے لگا تھا کہ اگر کوئی اور بھی میرے ساتھ دو تین فٹ کے فاصلے پر دوڑ رہا ہوتا تو اسے واضح طور پر دھوکئی کی طرح چلتے میرے سانسوں کی آواز سنائی دیتی۔

صرف اور صرف میرے دماغ میں ایک بات تھی کہ میرے پیچھے ایک رات محسن لگا ہوا ہے اور یہ میرا

خون پی جائے گا۔ ہر انسان کو اپنی جان بپاری ہوتی ہے اور اپنی جان سے بڑھ کر شاید ہی کوئی ایسی چیز ہو جو انسان کو بپاری ہو۔ بھاگتے بھاگتے مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا، بس صرف پیچھے لگے اس ہیبت ناک راہکش کی غراٹھیں سنائی دے رہی تھیں۔

شروع میں تو میری آنکھیں کھلی تھیں مگر اب تو میری آنکھیں خود بخود بند ہو چکی تھیں اور میں سر پٹ بھاگ رہا تھا، شاید میں مٹی میل بھاگ چکا تھا۔

پھر اچانک میں نے محسوس کیا کہ اب میرے قدم زمین چھوڑ چکے ہیں اور میں جیسے آسمان سے نیچے زمین پر گر رہا ہوں۔ میں نیچے ہی نیچے اٹھا ہ گہرائی میں گرنا چاہا تھا۔ میرا سر اوپر اور ٹانگیں نیچے کی طرف تھیں۔ میں گرتا رہا، مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ میں کتنی گہرائی میں نیچے گر رہا ہوں۔

اور پھر میں اچانک چاروں شانے جت نرم مٹی پر دھب سے گر پڑا۔ میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا، میری آنکھیں تو بند تھیں اور بند آنکھوں میں مزید اندھیرا چھا گیا، درو کی ایک کربناک ٹیس اٹھی اور میرے پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ میرا سانس سینے میں اٹکنے لگا۔ بڑی مشکل سے میں سانس لینے لگا تھا کہ ایک سخت دل دہلانے اور کان پھاڑنے والی پھٹکاری سنائی دیں تو میں دہل اٹھا اور پشپنا کر آنکھیں کھول دیں۔

اوہ! بھگوان! میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے سینے میں ایک ٹکیں۔ اور جیسے مجھ پر اچانک سحر پھونک دیا گیا ہو کہ میری آنکھیں پتھر اکڑ کر انیس جسم جیسے سن ہو کر رہ گیا۔ منظر ہی ایسا دلخراش اور ناقابل فراموش اور ناقابل یقین تھا، اگر میری جگہ کوئی پیلوان یا پھر بڑے سے بڑے دل گردہ والا اور موت کو سامنے دیکھ کر نہ گھبرانے والا بلکہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر موت کو بھی لرزادینے والا ہوتا تو وہ بھی کچپکا کر رہ جاتا کیونکہ میرے سامنے ہزاروں کی تعداد میں کالے اور سرخ رنگ کے ذہریلے سانپ پھین کاڑھے اور پھنکارتے ہوئے میری طرف قہر برساتی آنکھوں سے گھور رہے

تھے۔ کئی تو ایسے تھے کہ جن کے منہ سے شعلے نکل رہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ان سانپوں میں ایک زبردست ناقابل بیان حد تک ہلچل مچ گئی تھی۔

وہ ایک بہت ہی چوڑا گڑھا تھا جس میں، میں گرا تھا، میں ایک دو فٹ اونچے چوڑے پر گرا تھا، سارے سانپ اس چوڑے کے چاروں طرف پھنکا رہے تھے۔ وہ سب کے سب مجھ پر ٹوٹ پڑنا چاہتے تھے ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنا سارا زہر مجھ میں بھر دیں، ان کی بے چینی مزید بدھتی جا رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں قہر بھر گیا تھا اور میں چوڑے کے پتوں کا سہا ہوا بیٹھا تھا۔ اچانک ایک سانپ اپنی جگہ سے اچھڑا اور تیر کی مانند تیزی سے آ کر میری گردن سے لپٹ گیا اور زبردست طریقے سے میرے ماتھے پر اپنا ڈنک مار دیا۔ درو کی ناقابل فراموش ٹیس اٹھی۔

”بچاؤ..... بچاؤ..... بچاؤ.....“ میری ٹلک شگاف جھنجھٹیں قرب و جوار کو دہلانے لگیں۔

مجھے زبردست طریقے سے جھنجھوڑا جا رہا تھا کہ پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں مدھم مدھم موجودگی۔ کئی لوگ میرے گرد جمع تھے۔ میں تھر تھرا کا پ رہا تھا۔ سینے میں میرے سارے کپڑے شراپور تھے۔ میری کچکی ایسی تھی کہ جیسے پورے جسم پر لرز طاری ہو گیا ہو۔ پھر مجھے کچھ زیادہ ہی طاقت سے جھنجھوڑا گیا۔

اور پھر میں شانت ہو کر وہاں پر موجود لوگوں کو نگہ کر دیکھنے لگا۔ ”لگتا ہے بالک نے کوئی بھیا نک پشپنا کر لیا ہے۔“ یہ پنڈت کی آواز تھی۔ رام لال تم تھوڑا استہال کے پاس بیٹھے رہو، میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ پھر رام لال کی آواز سنائی دی۔ ”تم لوگ اب جاؤ، میں اس کے پاس بیٹھا ہوں۔“ رام لال کی آواز سننے ہی وہاں پر موجود سب کے سب چلے گئے، پھر رام لال نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ایک ہاتھ سے پانی کا کٹورا میرے منہ سے لگا دیا۔

کٹورا منہ سے لگتے ہی میں غنا غٹ کٹورا کے سارا پانی پی گیا۔ مجھ پر ابھی بھی ہلکی کچکی طاری تھی

میرے منہ سے نکلا۔ ”پنڈت جی۔“..... اور مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرا منہ بند کر دیا ہو کہ میں منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکال سکوں۔

رام لال نے پانی کا ایک اور کٹورا میرے ہاتھ میں تھادیا اور پھر میں کٹورے کا سارا پانی پی گیا۔ پانی پینے کے بعد میری طبیعت تھوڑی سنبھلی اور میں نے رام لال کو غور سے دیکھا۔ کمرے میں موجود، دیا اپنی روشنی پورے کمرے میں پھیلانے میں ناکام ہو رہا تھا۔

”بالک تم نے ایسا کون سا بھیا نک اور ڈراؤنا سینا دیکھا کہ تمہاری جھنجھٹیں مندر کے ارد گرد کو دہلانے لگیں اتنی زور دار جھنجھٹیں تھیں۔ بچاؤ..... بچاؤ کہ اپنے کمرے میں سوئے ہوئے سارے لوگ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور دوڑتے ہوئے اس کمرے میں آ گئے۔

یہی نہیں بلکہ بڑے پنڈت مہاراج بھی بھاگے بھاگے یہاں آ گئے۔ تمہاری حالت پانی سے باہر ترقی مچھلی سے بھی بدتر تھی۔ پہلے تو ہم نے سمجھا کہ شاید یہ تم پر مرگی کا درد تو نہیں پڑ گیا، مگر پنڈت مہاراج نے کہا کہ ”ایسا کچھ نہیں، یہ مرگی کا درد تو نہیں بلکہ بالک کوئی بہت خوفناک اور ڈراؤنا پشپنا کر حال سے بے حال ہو گیا ہے۔“

”بالک ابھی تک تم نے اپنا نام نہیں بتایا بلکہ ہم نے تم سے تمہارا نام پوچھا ہی نہیں۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”پنڈت جی میرا نام پرتاب سنگھ ہے۔“

”اچھا تو تم ٹھاکر برادر سے تعلق رکھتے ہو، تم گھبراؤ نہیں، پنڈت مہاراج بہت گیانی ہیں، وہ بول رہے تھے کہ بالک کا نام معلوم ہو جائے تو میں اپنے گیان سے معلوم کرتا ہوں کہ اصل میں اس کے حالات اسے کس دھارے پر لے کر جا رہے ہیں۔“

اب تم آرام سے سو جاؤ، کل پوچا جسے میں تمہیں لینے آؤں گا، تیار رہنا، صبح ہوتے ہی تمہیں جل پانی مل جائے گا، میں نے تمہارے لئے کپڑے کا ایک جوڑا بھی دے دیکھو سامنے رکھ دیا ہے، رامو کا تمہارے پاس آ جائیگا اور باقی باتیں وہ تمہیں سمجھا دیگا، اب میں چلتا ہوں، کسی قسم کی چٹانہ کرو، لوگ کہتے ہیں کہ اگر

منش اپنی بھوک سے زیادہ کھالے تو اس صورت میں بھی سینے نظر آتے ہیں، خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں، بھور سے میری تم سے ملاقات ہوگی۔“ اور پھر رام لال میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا، اور میں درو پر لیٹ کر حال اور ماضی کے تانے بانے ملانے لگا۔ اب نیند تو میری آنکھوں سے کوسوں بلکہ ہزاروں میل دور جا چکی تھی۔

میں لیٹ کر کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا اور پھر اسی طرح صبح کی سپیدی ہر طرف پھیلنے لگی۔ میں اٹھ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک بوڑھا آدمی میرے کمرے میں آیا اور بولا۔ ”رام لال جی نے بتایا ہے کہ تمہارا نام پرتاب ہے اور میرا نام رامو ہے۔ رام لال جی نے کہا ہے کہ میں تمہیں ضرورت کی ساری جگہیں دکھا دوں، اور پھر تم ضرورت سے فارغ ہو کر شان بھی کر لینا۔ چلو، میرے ساتھ آؤ۔“ رامو نے کہا۔

”جی رامو کا کا، چلیں۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر ان کے ساتھ چل پڑا۔ انہوں نے ساری جگہیں مجھ کو دکھا دیں۔ تھوڑی دیر میں، میں اشان سے بھی فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ گیا، پھر رامو کا کا ایک تھالی میں گرم گرم پوریاں اور مکس بھجیا لے کر آ گئے۔

میں نے ناشتہ کیا اور پھر ناشتہ کے بعد رامو کا کا مجھے لے کر اس احاطہ میں بنے مندر میں لے گئے۔ میں نے جبکہ کر دیوی ماما کو پر نام کیا۔ مندر میں اس وقت بہت سارے لوگ موجود تھے۔ پنڈت مہاراج اپنے کام میں مصروف تھے، لوگوں کا چڑھا دینے اور دیوی ماما کے چنوں میں رکھ دینے اور نقدی ایک بڑے بکس میں ڈال دینے۔ ایک طرف رام لال موجود تھے انہوں نے اشارہ کیا تو میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔

اگر تپ کی خوشبو پورے مندر کو مہک رہی تھی۔ پھر بھجن گانے کا سہ شروع ہوا، چار کنواری تاریاں بھجن گانے لگیں۔ میں نے ان ناریوں کو غور سے دیکھا۔ سب کی سب بہت صحت مند تھیں، ان کے نین نقش قابل تعریف تھے، سب کا لباس ایک جیسا تھا، گھگھرا اور کسی ہوئی چولی میں وہ بہت ہی زیادہ جاذب اور دلکش نظر آ رہی

تھیں۔ ان سب کا کسا کسا اور گد رلایا ہوا جسم، دل و دماغ کو مسوں رہا تھا۔ یہ سب وہ ناریاں تھیں جو کدویوں کی سی سوا کے لئے مندر کو وقف تھیں، ان کا کھانا دینا، اٹھانا بیٹھنا، رہنا سہنا سب کچھ ہر سے مندر میں ہی ہوتا تھا۔

دن کے دس بجے تک لوگوں کا مندر میں آنا جانا لگا رہا، دیوی ماں کے چرنوں میں چڑھاوے چڑھائے جاتے رہے، وہ چاروں ناریاں لہک لہک کر سارے کام کر رہی تھیں، تھوڑی تھوڑی دیر بعد دیوی کے چرنوں میں موجود چڑھاوے اٹھا کر اندر کہیں لے بھی جاتی رہیں۔ اچانک ان چاروں میں سے سامان اٹھاتے ہوئے ایک کے ہاتھ سے پیتل کی تھالی پھسل کر گر پڑی تو فوراً پنڈت مہاراج نے غضبناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا مگر فوراً اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے نرم لہجہ میں کہا۔ ”کاشی منیجکل کرو دیکھ بھال کرو۔“ میں نے محسوس کیا کہ پنڈت کا لہجہ اچانک یوں نرم پڑا تھا کہ ”اس وقت کئی لوگ مندر میں موجود تھے اور ان لوگوں میں گاؤں کے کھیاٹھا کر صاحب بھی موجود تھے۔“

اور بڑے پنڈت کو لوگوں اور ٹھاکر کے سامنے یہ تو دکھانا مقصود تھا کہ مندر کے پنڈتوں کی زبان بہت نرم ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے ان کے دل میں بہت نرم گوشہ ہوتا ہے۔

کاشی کے ہاتھ سے دراصل تھالی یوں پھسل گئی تھی کہ اس وقت اس نے اپنی نظر سں اور دھیان مجھ پر مرکوز کر دی تھیں۔ لیکن یہ سب اتنی جلدی میں ہوا تھا کہ کوئی اور اس بات کو سمجھ نہ سکا تھا۔

خیر ساڑھے دس بجے تک لوگوں کا مندر میں آنا بند ہو گیا۔ پنڈت مہاراج نے میرے ماتھے پر صندل کا تلک لگایا اور پرشاد دیا اور پھر کہا۔ ”پر تاب اب تم اپنے کمرے میں جاؤ، میں دوپہر میں تمہارے پاس آؤں گا۔ اور تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

مہاراج کی بات سن کر میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ جب میں اپنے کمرے میں آیا تو دیکھا کہ درزی پر ایک چادر بھی ہوئی ہے اور ایک نکیہ بھی موجود تھا۔

ایک کونے میں ایک چھوٹا کھڑا اور اس گھر سے پر ایک مٹی کا پیالہ بھی موجود تھا۔ میں کمرے میں تھوڑی دیر بیٹھا اپنے کمرے کے بارے میں سوچتا رہا، پھر میں لیٹ گیا اور پھر آنکھیں بند کر کے سوچوں کی اٹھا کر اپنی میں پہنچ گیا۔

ابھی مجھے لیٹے کوئی آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ کمرے میں آہٹ محسوس ہوئی، آنکھیں کھول کر دیکھا تو میرے سامنے رام لال جی کھڑے تھے اور ان کے سامنے وہی مندر والی لڑکی کاشی بھی موجود تھی۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تو رام لال جی میرے سامنے بیٹھ گئے پھر انہوں نے اشارہ کیا تو کاشی بھی ان کے برابر میں بیٹھ گئی اور اپنی گردن جھکا لی۔

رام لال بولے۔ ”پر تاب یہ کاشی ہے۔ یہ مندر کے سیوکوں میں سے ہے۔ یہ مندر کی دان کنیا ہے، بہت ہی من کی مندر اور کام آئیے کرتی ہے کہ جیسے اس کے پاؤں میں بجلی بھری رہتی ہے۔ بڑے مہاراج نے تمہارے کام کے لئے اسے بھیجا ہے، یہ تمہارے کھانے پینے کا پورا خیال رکھے گی۔“

مہاراج کا یہ بھی کہنا ہے کہ تم بہت دھمی اور کشش میں ہو، تم کوئی معمولی منشی نہیں ہو، تم کی جنموں میں بڑے بھاگوں رہے ہو، اور اس موجودہ جنم میں بھی تم بہت دیالو، دوسروں کا درد بانٹنے والے، اور منشی پر رعب، ویدہ اور حکومت کرنے والے ہو، مگر پچھلے جنم میں تم سے کچھ کام آئیے ہو گئے ہیں کہ اس کا خلیا زہ نہیں بھگتا ہے، اور کچھ عرصہ تک تمہیں اس مندر میں رہنے سے سکھ ملے گا، ایک آقا تمہارے پیچھے پڑ گئی ہے۔ وہ آقا تم سے بہت ناراض ہے اور اسی کارن انہی تک تم گھر سے بے گھر ہو رہے ہو، دولت تمہارے گھر کی باندی رہے گی، مگر شانتی کے لئے تم..... اور رام لال نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ”اب تم آرام کرو، اب میں تم سے کام ہو گا تو ملوں گا۔ اور یہ کاشی تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھے گی۔ ویسے بڑے مہاراج خود تم سے ملنے آئیں گے۔“

پر تاب سے سے گھبراتا بزدلی ہے اور جو لوگ ہمت نہیں ہارتے وہی کا سیاب ہوتے ہیں۔ اور ہاں

مندر سے کچھ دنوں تک باہر نکلتا تمہارے لئے ٹھیک نہیں، یہ بھی مہاراج کہہ رہے تھے۔ ٹھیک ہے میں چلتا ہوں، کاشی اب تو بھی جا اور وقت پر پر تاب کا کام کر دیا کرنا، کوئی شکایت نہ ہو۔“

”جی پنڈت جی آپ کو پر تاب بابو کو میری ذات سے ذرہ بھر بھی شکایت نہیں ہوگی۔“ اور یہ بول کر کاشی رام لال کے ساتھ ہی کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ اور میں لیٹ کر سوچوں کے گرداب میں تھیرے کھانے لگا۔ اور یہ سوچنے لگا کہ ”اب دیکھو سے کیا دکھلاتا ہے۔“ میں سوچوں میں گھرا تھا میری آنکھیں بند تھیں کہ کمرے میں آہٹ ہوئی اور آہٹ پر میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور ترنت اٹھ بیٹھا کیونکہ میرے سامنے بڑے پنڈت جی کھڑے تھے اور ان کے ساتھ رام لال بھی تھے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا تو پنڈت جی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا، اور بولے۔ ”پر تاب بیٹھو۔“

میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا، ساتھ ہی دونوں پنڈت مہاراج بھی بیٹھ گئے۔ پھر مہاراج نے کہا۔ ”پر تاب تمہارے حالات میرے سامنے آ گئے ہیں، میں نے اپنے گیان سے سب کچھ معلوم کر لیا ہے، تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں، تمہارا یہ رام لال کاشی جنموں سے چل رہا ہے، یہ سب کرموں کا پھل ہے، جس کے کرم میں جو لکھا جائے، ایشور کرم لکھ دیتا ہے مگر اس میں منشی کا اپنا اچھا بھی ہوتا ہے، منشی اپنے من کے مطابق اپنے کو حالات کے حصار میں ڈھال لیتا ہے۔“

یہ بھی منشی کا ہی کام ہے کہ وہ اپنے لئے نرک بنے یا پھر سورگ کے لئے کوشش کرے، ایشور نے کسی کو ظالم جابر، کرم کا کھوٹا، جنم جلا یا پھر پاپی نہیں پیدا کرتا، اب اسی کو دیکھ لو جب برسات ہوتی ہے تو اس سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں اور جب دھوپ نکلتی ہے تو دھوپ سب پر پڑتی ہے اب یہ منشی کا کام ہوتا ہے کہ وہ اس سے سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

ایک آقا جو تمہارے ساتھ ساتھ جنم لیتی رہی۔ تم دونوں سنسار میں آتے رہے، تم دونوں کا دیوہ نہ ہو سکا، تم

دونوں ہر جنم میں کسی نہ کسی بہانے ختم ہوتے رہے مگر اس جنم میں تم دونوں پھنچ گئے۔ اس کا خاتمہ ہو گیا اور تم جیوت ہو، اور اب وہ تمہارے لئے بھگ رہی ہے، تمہارے بنا اسے ایک جلی جلی چھین نہیں، وہ تمہیں ڈھونڈ رہی ہے اور دوسرا وہ ہے جس نے تمہیں جنگل میں چٹاؤنی دی ہے، تم نے اس کی پتری کے ساتھ اپنا لے لیا، وہ بہت غضبناک حالت میں ہے، اس نے جو بھی کہا ہے وہ کرا کے رہے گا، تمہارے حالات کو وہ ابسا کر دے گا کہ تم اس کی اچھا پوری کرنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکو گے، اب تم کچھ دنوں تک اس مندر میں رہو، اگر تم باہر گئے تو ہو سکتا ہے کہ تمہارا نقصان ہو جائے۔ میری باتوں پر دھیان دینا، میں بھی سوچتا ہوں کہ کوئی راستہ نکل آئے، ویسے بھی ہم گاؤں والے ان دنوں ایک خونی آقا سے پریشان ہیں۔ تم گھبراتا نہیں، آرام کرو، اب میں چلتا ہوں، یہاں پر تمہیں کوئی کشش نہیں ہو گا، کھاؤ پیو اور آرام سے رہو۔“ اور یہ بول کر پنڈت مہاراج کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

ساتھ ہی رام لال جی بھی اٹھے اور اپنے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ”اب مطمئن رہو، کسی بات کی چٹا نہ کرو۔“ اور وہ بھی پنڈت مہاراج کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گئے۔

”میں انہی سوچوں میں گم ہو گیا۔ اچانک میری سوچوں پر یلغار ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ میرے موجودہ جنم سے پچھلے جنم میں مجھ سے کون سی غلطی یا پھر میں نے کون سا پاپ کیا کہ اس کی سزا میں اس جنم میں بھگت رہا ہوں اور پھر آئندہ اس سے زیادہ اذیت ناک اور کشش سزا بھگتنا پڑے گا۔ بہر حال یہ میرے بس سے باہر تھا کہ میں اپنے پچھلے جنم کی غلطیوں اور پاپوں کے بارے میں جان سکوں، اور پھر یہ ایک انسان کے لئے کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے پچھلے جنم کے حالات کو جان سکے، میں سوائے سوچ کے اندھیرے میں ٹانگ ٹوٹیاں کرنے کے اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

پھر میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ آنے والے وقتوں میں میرا واسطہ کئی اذیت ناک حالات سے پڑے گا اور وہ کیا واقعات ہوں گے جنہیں میں جھیل

پاؤں گا۔ صرف ایک بات میرے سامنے تھی اور جس کی نشاندہی ابھی ابھی پنڈت مہاراج نے کی تھی اور اس سے پہلے جنگل میں سادھو نے دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ ”مجھے ہر پورن ماٹی کی رات میں ایک منٹ میرے حوالے کرنے ہیں تاکہ اس کی بلی دی جائے۔“ منٹ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ جوان ہو بلکہ وہ منٹ سن بلوغت کو نہ پہنچا ہو، چاہے وہ پرس ہو یا ناری۔ دونوں ہی قابل قبول تھے۔ یہ بھی کوئی قید نہ تھا کہ وہ غریبوں بلکہ میرے اپنے خونی رشتے دار یا قسبی لگاؤ والے بھی ہو سکتے ہیں۔

میں ان ہی تمام سوچوں میں غوطہ کھانے میں کسی کی آمد پر آہٹ ہوئی اور میں نے آنکھیں کھول دیں دیکھا تو سامنے کامنی کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ کامنی کے ہاتھ میں ایک بڑی پتیل کی تھالی تھی۔ اس نے وہ تھالی میرے سامنے رکھ دی اور پھر جھٹ کھڑے میں سے پیالے میں پانی بھرا اور وہ پیالہ بھی میرے سامنے رکھ دیا۔ ”باجو جی! آپ کھانا کھائیں، اس وقت کھانے کا سہ ہے، دن کے ڈیڑھ بج رہے ہیں۔“ میں اٹھا اور ہاتھ دھو کر کھانے کے لئے تیار ہو گیا۔ کامنی ابھی تک بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ تھالی میں چھوٹی چھوٹی دو دو ٹیائیاں تھوڑے سے چادل اور دال بھجیا تھی۔ ”کامنی تم بھی کھانا کھاؤ۔“ میں نے کہا تو وہ بولی۔ ”باجو جی! یہ آپ کا کھانا ہے، آپ کھائیں، میں بعد میں کھالوں گی۔“

بہر حال میں نے خد نہیں کی اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔ میں کھاتا رہا اور وہ مجھے یک تک دیکھتی رہی، جب میں کھا چکا تو اس نے برتن اٹھائے اور چپ چاپ مجھے دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ رات میں وہ پھر رات کا کھانے کے لئے آئی اور میرے سامنے کھانا رکھ کر خود ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے پھر اسے کھانے کے لئے پوچھا تو اس نے وہی جواب دیا جو کہ وہ پہر میں دے چکی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد میں بولا۔ ”کامنی اگر تم سے چند باتیں پوچھوں تو کیا تم جواب دو گی؟

تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔“

”نہیں باجو جی! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں۔“ وہ بولی۔ ”اچھا تو یہ بتاؤ کہ تم اس مندر میں کتنے سے ہو؟“

”باجو جی! میں اس مندر میں کوئی آٹھ سال سے ہوں۔“ وہ بولی۔

”کامنی اس وقت تمہاری عمر کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میری عمر سولہ سال ہے، آٹھ سال کی عمر میں میری ماما اور بہانے مجھے دیوی ماما کی سیوا کے لئے مندر میں دان کر دیا تھا۔ مجھے دان کرنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ میرے گھر والوں پر کوئی کشت نہ آئے، اور جو پریشانیات تھیں وہ ختم ہو جائیں۔“ اس نے ایک ایک لفظ کو جیسے چبا چبا کر بتایا۔

”کامنی کیا تم مندر میں اور اپنے حالات سے خوش ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

وہ بولی۔ ”باجو جی! کیا آج آپ اپنے حالات سے خوش ہیں؟“

میں کامنی کی بات سن کر چکر اکر رہ گیا، کیونکہ میں اپنی خوشی سے مندر میں موجود نہیں تھا بلکہ مجبور یوں اور پریشانیوں کا وہ ناقابل برداشت پہاڑ تھا جس کے نیچے دب کر میں مندر کے اوبیت ناک کمرے میں پڑا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ جب کوئی انسان حالات کی چکی میں پائے لگتا ہے تو وہ اپنی مجبور یوں سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔

”اچھا تم یہ بتاؤ کیا تمہارا من چاہتا ہے کہ تم اس زندگی سے چھٹکارا پاؤ اور مندر سے باہر کی دنیا دیکھو اور آزاد فضا میں سانس لو؟ کیا اس کے متعلق بھی تم نے سوچا ہے؟“

”باجو جی! میں ہی کیا بلکہ ہر مجبور انسان گھٹ گھٹ کر جینے سے بھاگنا چاہتا ہے، جب ایک پرندے کو بنجرہ میں قید کر دیا جاتا ہے تو اس پرندے پر کیا زور تیری ہوگی کوئی اس سے پوچھے۔ بنجرے میں وہ قید پرندہ کھانا پیتا ضرور ہے مگر یاس و محرومی کی نظر سے ہر وقت تکتا رہتا ہے اور

سوچتا ہے کہ شاید کسی دن بنجرے کا دروازہ کھل جائے۔ دن بھر وہ آس لگائے بنجرے میں چکر کاٹتا رہتا ہے اور جب اندھیرا پھیل جاتا ہے تو اپنی آنکھیں موند کر اپنا سر اپنے پردوں میں سو کر بے سدھ ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر اس آس میں آنے والا دن بھی کٹ جاتا ہے۔“ وہ بہت ہی سمجیر لہجے میں بولی۔

میں بے سدھ ہو کر اس کی باتوں کو سوچنے لگا، کیونکہ اس نے واضح الفاظ میں خود کو بنجرے میں قید پرندے سے تشبیہ دی تھی، میں اس پر اپنی نظریں جمائے دیکھتا رہا اور وہ مجھے دیکھتی رہی۔ اس کا اندازہ بتا رہا تھا کہ وہ مجھے سے سوال کر رہی ہے کہ ”باجو جی بولو، تمہارا رے پاس کیا جواب ہے؟“

پھر اس نے جھٹ کھانے کے برتن اٹھائے اور مجھے دیکھتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

کامنی کی معصومیت، بھولپن، درد میں ڈوبی باتیں، بے کسی کی زندگی اور پھر قید میں بے بلبل اور صیاد مسکرانے والی بچو کے لگائی لگا ہوں نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا، میں رات بھر سو نہیں سکا، پوری رات کروٹیں بدلتا رہا اور کب صبح کا اجالا پھیلا مجھے پتہ نہ چلا۔ لیکن پھر صبح ہونے کا پتہ اس دلت چلا جب کامنی میرے لئے صبح کا ناشتہ لے کر کمرے میں آئی، اور مجھ پر نظر پڑتے ہی تھک گئی اور بولی۔ ”باجو جی! میں آپ سے معافی مانگتی ہوں، آپ کو میری باتوں سے دکھ پہنچا، رات بھر آپ جاگتے رہے اس کا اندازہ مجھے ہے کیونکہ میں اپنی باتوں پر رات بھر پچھتاتی رہی ہوں اور آپ کی حالت اور آنکھیں بتا رہی ہیں کہ آپ بھی رات بھر سوئے نہیں۔ باجو جی! مجھے معاف کر دیں، درنہ میں خود کو معاف نہیں کر سکتی گی کیونکہ میں نے آپ کے من کو کشت دیا، اور کامنی اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے آگے دونوں ہو کر بیٹھ گئی۔

میں نے جھٹ کامنی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”کامنی ایسی بات نہیں۔ تم نے کوئی غلط بات نہیں کی، تم نے تمام باتیں صبح کی ہیں اور میں، بخوبی سمجھ سکتا ہوں کہ تم

واقعی بنجرے میں قید بیٹھی جیسی ہو، اندر دنی طور پر تمہارا من آزاد رہنے کو چاہتا ہے، لیکن تمہاری مجبور یوں نے تمہارے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں۔

اب تم مجھے ہی دیکھو، میرے گھر میں نوکر چاکر، میں سوئے اور چاندی کے چپچے سے دودھ پینے والا، میرے پتا گاؤں کے کھیا ہیں اور میں، مجبوری کے تحت بھول بھلیوں میں پڑ کر آج یہ دردناک زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ میں بھگوان کی کرپاسے مایوس نہیں ہوں۔ تم گھبراؤ نہیں، جہاں تک ہوسکا میں تمہاری مدد کروں گا اور قید کی زندگی سے نکال کر آزادی دلاؤں گا، اپنے من کو دیکھو نہ کرو، یہ میرا وعدہ ہے کہ ایک نایک دن بلکہ بہت جلد آزاد فضاؤں میں تم سانس لو گی، بس مجھے اپنے گھر پہنچنے کی دیر ہے۔“

میری باتیں سن کر کامنی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تو اسے دیکھ کر میرا من پھل اٹھا، میں نے اس کے آنسو صاف کئے اور اس کے گال تھپتھا کر اسے دلاسا دیا، اور بولا۔ ”چلو جلدی سے ایتھے بچوں کی طرح مسکراؤ۔“ اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اس کا سر جھایا اور گلابی چہرہ کھل اٹھا۔ ”باجو جی! آپ ناشتہ کریں، آپ کی باتوں سے مجھے بہت ڈھارس ہوئی ہے، میں دیوی ماں کی چرنوں میں اپنا ہاتھ لیک کر پارتھنا کروں گی کہ آپ کے سارے کشت درد ہو جائیں اور آپ کو اپنے مقصد میں بہت جلد کامیابی ملے تاکہ آپ بھی اپنی خوشی زندگی گزاریں۔“ کامنی بولی۔

خیر میں ناشتہ کرنے لگا، وہ میرے سامنے بیٹھی مجھے غور سے دیکھتی رہی کہ میں نے ایک نوالہ بنا کر اس کے منہ کی طرف بڑھا دیا تو مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے میرے ہاتھ کا نوالہ اپنے منہ میں رکھ کر بہت جذباتی انداز سے مسکرانے لگی۔ جب میں ناشتہ کر چکا تو اس نے برتن اٹھائے اور مسکراتی ہوئی کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ اور پھر میں خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔

اب مجھے مندر میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ روز کا معمول تھا کہ میں صبح ہی صبح اٹھتا اور



خوبصورت

راشد نذیر طاہر - کراچی

شام کا دھندلا کایا گرمی کی تمازت ہوتی ہی وہ مہ جیبیں اپنی چہت پر نظر آتی جسے دیکھ کر نوجوان اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آہیں بھرنے لگتا لیکن جب اسے یہ پتہ چلا کہ وہ گھر تو برسوں سے بند پڑا ہے۔۔۔۔۔

ایک ماورائی تعلق کی دلکش اور دلفریب دیدہ دلیری جو کہ بڑے والوں کو اچھے میں ڈال دے گی

ایک قدرتی بات ہے کہ انسان جس جگہ رہتا ہے جس علاقے میں رہتا ہے اور جن لوگوں میں رہتا ہے، ان سب چیزوں سے اسے انیسیت ہو جاتی ہے اور جب کسی موقع پر کسی مجبور سے نقل مکانی کرنی پڑے تو بہت کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مجید کو جب معلوم ہوا کہ اس کے والد کرم دین نے مکان چھوڑنے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے ہاتھ لیا۔

اندھیرا پھیلنے ہی تم کسی کام سے باہر نہ نکلنا اور خاص طور پر مندر کی چار دیواری سے تو نکلنا بھی نہیں۔ میری باتوں کو خوب یاد رکھنا۔ اور یہ بول کر وہ چلے گئے۔ میں ان کی باتوں پر غور کرنے لگا کہ مہاراج نے ایسا کیوں کہا۔ کیا اماں کی راتوں میں یہاں کوئی خطرہ ہوتا ہے، ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے ورنہ بڑے مہاراج اس طرح چٹا دنی نہ دیتے۔

رات میں جب کا منی کھانا لے کر آئی تو میں نے اس کا تذکرہ اس سے کیا اور پوچھا۔ ”کا منی آخر کیا بات ہے کہ بڑے مہاراج نے ایسا کہا ہے؟“ ”بابو جی! آپ کھانا کھائیں میں آپ کو بعد میں بتا دوں گی، لیکن بڑے مہاراج نے جو کچھ بھی کہا ہے آپ اس پر عمل کیجئے گا۔ اگر رات میں کوئی آپ کا نام لے کر بھی پکارے تب بھی آپ اپنے کمرے سے مت نکلے گا، ایسا کیوں ہے میں آپ کو بتا دوں گی، آپ فی الحال کھانا کھائیں اور خاموشی سے سو جائیں، ویسے فکر کی کوئی بات نہیں۔“

میں نے کھانا کھایا اور جلدی سے کا منی نے برتن اٹھائے اور کمرے سے چل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے لائٹیں بجھا دی اور لیٹ کر حالات کے متعلق سوچنے لگا کہ پھر مجھے نیند آگئی۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا، ہاتھ کو ہاتھ بھجانی نہیں دیتا تھا، اچانک میری آنکھ کھل گئی تو میرے کانوں میں آواز سنائی دی، گھوڑوں کے نہنہانے کی اور ساتھ ہی ایسا لگا کہ کسی بھی سڑک پر گھوڑے دوڑ رہے ہوں، وقت کے ساتھ ساتھ آواز واضح اور قریب ہونے لگی۔

اچانک میرے کمرے میں کوئی آیا، اس سے پہلے میں اپنی جگہ پر اٹھ بیٹھا تھا۔ آنے والا میرے بہت قریب بیٹھ گیا اور پھر اچانک وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں گھونچ لیا۔ پھر سرگوشی سنا دی۔ ”بابو جی! میں کا منی ہوں گھر واپس آئیں۔ آج وہ پھر آ گیا۔۔۔۔۔“ (جاری ہے)

ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتہ کرتا اور پھر مندر میں جا کر پوجا میں شامل ہوتا، بڑے مہاراج روزانہ میرے ماتھے پر تلک لگاتے اور پھر ایک مقررہ وقت پر میں وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ جاتا، دن میں دو پہر کے بعد دن میں ایک مرتبہ رام لال جی میرے کمرے میں ضرور آتے اور میری خیر خیریت دریافت کرتے اور چلے جاتے مگر جاتے جاتے یہ ضرور پوچھتے کہ ”کا منی تمہاری سیوا ٹھیک طرح کرتی ہے یا نہیں۔“

میں جواب دیتا۔ ”چنڈت جی، کا منی اپنی ذیوقی خوب اچھی طرح دے رہی ہے مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں، میں بہت خوش ہوں، آپ نے اور بڑے مہاراج نے مجھ پر جو کرپا کی ہے اس کی مثال نہیں ملتی اور میری دیوی ماں سے پراگھنا ہے کہ دیوی ماں آپ لوگوں پر کرپا کرے۔“

آٹھویں دن چنڈت رام لال جی! ایک لائٹن لائے اور بولے۔ ”پرتاب آج سے یہ لائٹن تمہارے کمرے میں رہے گا اور شام میں اسے جلا لیتا، ویسے تمہیں کشت کرنے کی ضرورت نہیں، کا منی اسے جلا دیا کرے گی۔“ اور یہ بول کر وہ چلے گئے۔

اب روزانہ شام میں کا منی لائٹن جلا دیا کرتی تھی، لائٹن میں مٹی کا تیل بھی وہ خود ہی ڈالا کرتی تھی اور میرا روز کا معمول تھا کہ کھانے سے فارغ ہو کر جب سوئے لگتا تو لائٹن بجھا دیا کرتا تھا۔ کیونکہ ویسے بھی مجھے اندھیرے میں سونے کی عادت ہے۔

اماں کی راتیں شروع ہو چکی تھیں، اب چاند کا آنسان پر نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جب یہ اماں کی راتیں شروع ہوں تو سر شام ہی پوری بستی پر سناٹا چھا جاتا، اندھیرا پھیلنے ہی گاؤں کے سارے لوگ اپنے اپنے گھروں میں دیک بڑتے تھے۔ اب تو رات میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔

ایک دن بڑے چنڈت مہاراج میرے کمرے میں آئے اور بولے۔ ”بابو! اماں کی راتیں شروع ہو چکی ہیں اور میں تمہیں چٹا دنی دیتا ہوں کہ شام کا

”یہ کیا ہے ماں.....؟“ وہ جھلا کر بولا۔
 ”ابو کو سمجھاؤ نا..... یہ گھر کیوں چھوڑ رہے ہیں.....؟“
 ”میں انہیں سمجھاؤں.....؟“ اس کی ماں سعیدہ نے آنکھیں نکال کر اسے گھورا۔ ”وہ 2 منٹ میں مجھے اور تجھے ہم دونوں کو سمجھا کر رکھ دیں گے۔“
 ”لیکن ماں..... یہ تو کوئی بات نہ ہوئی.....“ مجید کے لیے میں جھلا ہٹ گئی۔ ”میں تو اس محلے کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا..... اور ابو جان بھی اتنی دور گھر سے رہے ہیں کہ.....“
 ”وہاں کے بازار میں ان کا رو بار بہت اچھا جم گیا ہے.....“ سعیدہ نے اس کی بات کاٹی۔ ”اور یہ بات تجھے بھی معلوم ہے..... انہوں نے اپنی آسانی کے لئے گھر بھی وہیں دیکھ لیا ہے..... ان کا رو بار ہے تو سب کچھ ہو گا بیٹا.....“
 ”لیکن ماں..... میرا کیا ہو گا.....؟“
 ”تیری آوارگیاں اور بے سرو پا دوستیاں ختم ہو جائیں گی۔“ ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تیرے اٹنے سیدھے دوستوں کو دیکھنے سے میری بھی جان چھوٹے گی.....“
 ”ماں.....“ مجید نے منہ بسہ لیا۔ ”میں کہاں آوارہ پھرتا ہوں۔“
 ”ہاں..... ہاں.....“ ماں نے سر ملایا۔ ”دھوپ میں پھر کر تو میرا رنگ جل رہا ہے..... تمہارا تھوڑی.....“
 ”ماں مذاق مت کرو۔“ ابو کو سمجھاؤ نا کہ اپنا ارادہ بدل دیں۔“
 ”یہ میرے بس کی بات نہیں ہے.....“ ماں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”وہ جو فیصلہ کرتے ہیں۔ سوچ کچھ کر کرتے ہیں وہ خود کو زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ لیکن اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہاں رہتے ہوئے تمہاری پڑھائی میں بھی حرج ہو رہا ہے۔ جن لڑکوں سے تم نے دوستی کر رکھی ہے، وہ اچھے نہیں ہیں۔“
 ”میرے دوست تو ہر دور میں برے ہی ہوتے ہیں۔“ مجید ایک طویل سانس لئے بوڑھا۔ ”پتا نہیں

مجھے کب اچھے دوست نصیب ہوں گے.....!۔“
 کرم دین فرما بیٹھی کھلی کاٹھا، لیکن اس بازار میں اس نے دکان بے کر ذرا اچھے پیمانے پر اپنا کاروبار چلا لیا تھا۔
 ویسے بھی وہ کئی مہینوں سے اسی چکر میں تھا کہ رہنے کی جگہ بدل ڈالے، کیوں کہ اس علاقے کا ماحول قطعی ٹھیک نہیں تھا۔
 وہ خود تو زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا، لیکن اپنی اولاد کے لئے اس کی خواہش تھی کہ وہ کسی قابل ضرور رہے۔
 لیکن مجید نے جن گھروں سے میٹرنگ کلیئر کیا تھا، اس سے کرم دین قطعی مطمئن نہیں تھا۔
 وہ جاہل ضرور تھا، لیکن اپنے کاروبار میں ہونے والی ”پبلک ڈینگ“ سے اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔
 یہی وجہ تھی کہ اس نے جوان اولاد کو مارنے بیٹے سے گریز کیا اور فساد کی بڑکوبی اکھاڑنے کا فیصلہ کر لیا۔
 اور پھر یہ سب قدرتی ہوا تھا، چنانچہ موقع سے فائدہ اٹھا کر کرم دین نے فوراً ہی اپنی بیٹی کا رو باری جگہ کے عقب میں واقع محلے میں کرائے کا مکان ڈھونڈ نکالا۔
 اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہاں کا کرایہ تھوڑا گراں ضرور ہے۔ لیکن یہ علاقہ..... صاف سہرا اور..... اچھے لوگوں کا تھا۔
 مجید کی اب آخری کوشش یہ تھی کہ وہ باپ کے سامنے کھڑا ہو جائے۔
 اسے انیہا کرنے پر اس کے دوستوں نے اسکا بھانپا تھا۔ خاص طور پر سلیم تو کسی طرح تیار ہی نہ تھا کہ مجید ان لوگوں سے جدا ہو۔
 ”یار تمہارے ابو نے تو بہت ہی دور گھر لینے کا سوچ لیا ہے۔ کہاں یہ علاقہ..... کہاں وہ جو تم بتا رہے ہو۔“
 ”جب تمہاری ای کچھ بولنے کی ہمت نہیں کر رہی، تو تم خود ہی انہیں سمجھاؤ..... ہاں یار.....“
 دوسرے دوستوں نے بھی تائید کی۔ نتیجہ یہ کہ

جب اس کا باپ صبح فٹری سے تازہ مچھلیوں کا مال لے کر لوٹا تو مجید اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔
 کرم دین کی یہ روڑکی ڈیوٹی تھی صبح پونے سے قبل ہی وہ فٹری جاتا تھا، وہاں سے مال لاکر 3 گھنٹے آرام کرتا اور پھر اپنے نیچے پر چلا جاتا، وہاں سے رات محلے لوٹا تھا۔
 ”کیا ہوا.....؟“ کرم دین نے اسے غور سے دیکھا۔
 ”ابو..... وہ.....“ مجید کو الفاظ نہ ملے۔
 ”کہو بیٹا مجید..... کیا بات ہے.....؟“
 باپ کے نرم لہجے نے مجید کو ہمت دلائی اور اسے الفاظ کا خزانہ مل گیا۔
 ”ابو..... آپ کہیں اور مت جائیں..... میں یہ محلے نہیں چھوڑوں گا..... بس میں نے کہہ دیا ہے۔“
 ”کیوں.....؟“ کرم دین نے آنکھیں نکالیں۔ ”کیا ساری زندگی ایسے ہی گزارنی ہے۔“
 ”ابو..... کیا برائی ہے اس زندگی میں.....؟ اچھے خاصے تو رہ رہے ہیں ہم لوگ!“
 ”تم نے اپنے امتحان کا نتیجہ دیکھا ہے نا.....؟ تمہارے استادوں نے تم پر رحم کھا کر پاس کیا ہے۔ کیا میں تمہیں اسی دن کے لئے لکھا پڑھا رہا تھا.....؟“
 ”لیکن ابو..... امتحان کا رہنے والی جگہ سے کیا تعلق ہے.....؟“ اس نے اعتراض کیا۔
 ”بہت تعلق ہے..... نہ یہ علاقہ ٹھیک ہے اور نہ تمہاری دوستی یاریاں..... بس..... میرا فیصلہ اٹل ہے۔“
 ”میرے دوست اتنے برے تو نہیں ہیں ابو.....!“
 ”دیکھو بیٹا.....!“ کرم دین کا لہجہ نرم ہو گیا۔
 اس وقت تم جن لوگوں کی زبان بول رہے ہو۔ جن کے لئے میرے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے ہو، وہ تمہیں بربادی کے سوا کچھ نہیں دیں گے۔ تم نے اپنی زندگی خود گزارنی ہے اپنا پوچھ خود اٹھانا ہے۔ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں لیکن اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تعلیم کے

بغیر زندگی پوری نہیں ہوتی اور پوری رہ جاتی ہے.....“
 مجید اب سر جھکا کر خاموشی سے اپنے باپ کی بات سن رہا تھا۔
 اور پھر چند دن بعد کرم دین نے پرانے محلے کو خیر باد کہہ دیا۔
 نیا مکان..... نئی جگہ..... نئے لوگ..... لیکن یہ فرق تو صاف دکھائی دے رہا تھا کہ یہ علاقہ کافی صاف ستھرا اور اچھے رہائشی مکینوں سے آباد تھا۔
 کچھ دنوں تک تو مجید کا موڈ شدید آف ہی رہا تھا۔ پورا پورا دن گھر میں ہی گزارتا، کبھی چھت کا رخ کر لیتا، جہاں ایک تیار شدہ کمرہ بھی موجود تھا۔
 ماں سے بھی وہ منہ پھلائے ہوئے تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے دل میں رہنے والے دوست اس سے جدا ہو گئے تھے۔
 آج دوپہر کو اس نے اپنی ماں سے بات بھی کی تو اسی تعلق۔
 ”ای..... میں آج پرانے محلے چلا جاؤں.....؟“
 ”میں کیا بتاؤں.....؟“ ماں نے ہاتھ ہلائے۔
 ”اپنے باپ سے ہی پوچھ لیتا.....“
 ”وہ تو منع کر دیں گے.....“
 ”تو پھر..... بتاؤ..... میں کیا بول سکتی ہوں؟“ ماں نے نکسا جواب دے دیا۔
 ”تم تو کچھ بھی نہیں کر سکتیں میرے لئے.....!“ اس نے بھلا کر کہا اور جھکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔
 ماں اس کی شکل ہی دیکھتی رہ گئی اور وہ دھپ دھپ کرتا ہوا زینے چڑھ کر اوپر چلا آیا۔
 آج اسے سبیل اور رضا بہت یاد آ رہے تھے۔ وہ لوگ کیا سوچ رہے ہوں گے کہ مجید کس قدر بے وفا ہے..... چاروں گزر گئے اور شکل تک دکھانے نہیں آیا.....!
 اسے شدید احساس ہو رہا تھا کہ وہ لوگ اسے بہت مس کر رہے ہوں گے۔

بھلا اچھو بھائی کے کیرم کلب میں سارے دوست ہوں، اور عید نہ ہو تو کسی کو مزہ ہی نہیں آتا تھا۔ وہ تصور میں اپنے پرانے علاقے کی گلیوں میں گھوم رہا تھا، کھیل رہا تھا اور سوج سستی میں مصروف تھا۔ کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر وہ ان ہی سوچوں میں تھا کہ اچانک ہی گلی کے سامنے والے مکان کی چھت پر اس کی نظر پڑی اور آنکھوں میں گویا بجلی سی کود گئی۔

اف..... کتنی خوبصورت تھی وہ..... مجید نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ وہ مجید کی نظروں سے قطعی بے خبر ہو کر اپنے گیلے بالوں کو سکھا رہی تھی اس کے ہاتھ میں کھنکھی بھی تھی۔ شاید وہ نہا کر آئی تھی۔ اور ایسا لگتا ہوتا تھا جیسے کسی کھلتے ہوئے گلاب پر اس کی بوندیں پڑ گئی ہوں۔ مجید دم بہ خو تھا۔ دفعتاً لڑکی کی نظر بھی اس پر پڑ گئی۔ اور مردانہ لگا ہوں کا احساس ہوتے ہی اس نے اپنے آپ کو سمٹا لیا اور پھر وہاں کی نہیں تھی۔ اس کا رخ فوراً ہی سڑھیوں کی طرف ہو گیا۔ پھر وہ سڑھیوں سے اتری اور مجید کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

مجید کی نگاہیں..... شاید پھرا گئی تھیں۔ پہلی نظر میں جو محبت دل میں بیدار ہو جائے۔ وہ بہت پائیدار ہوتی ہے، اور اسے بھول جانا زندگی کا سب سے ٹھن مرتلہ ہو جاتا ہے۔ ابھی مجید کو یہ علم نہیں تھا کہ اسے اس بڑی دش سے محبت ہو چکی ہے، ابھی تو وہ اس حینہ کے پیکر کو اپنی آنکھوں میں ہی لئے بیٹھا تھا۔ اس نے کافی انتظار کیا لیکن وہ دوبارہ پلٹ کر نہیں آئی تھی۔

پھر ایک طویل سانس لے کر وہ اٹھ کھڑا ہوا، اور اسی چھت پر نظرس ڈالتا ہوا خود بھی نیچے اتر آیا۔ وہ کافی غصے میں اوپر آیا تھا لیکن اب اس ”حادثے“ نے اس کا موڈ ہی بدل ڈالا تھا۔

دیے اسے اتنا تو اندازہ تھا کہ لڑکی نے بھی اسے نظر بھر کر دیکھا ضرور ہے۔ لڑکی ذات تھی..... اس لئے فوراً ہی شرابا کر بھاگ کھڑی ہوئی مجید کے چہرے پر بے ساختہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور پھر تیسرے دن..... مجید کی دعا اور کوشش کو کامیابی نصیب ہوئی۔

وہ حینہ پھر چھت پہ آئی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی سامان تھا۔ جسے وہ چھت پر رکھنے کے لئے آئی تھی۔ پچھلے دو دن تو سوائے ناکا کی کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا، لیکن آج محنت رنگ لائی تھی۔ آج وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی، مجید بیک تک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ گویا ہلکیں جھپٹتا ہی بھول گیا تھا۔ لڑکی نے ایک کونے میں لایا ہوا سامان رکھا اور وہ جیسے ہی پلٹنے لگی تو اس کی نظریں مجید کی نظروں سے ٹکرائیں۔

مجید نے صاف دیکھا کہ وہ قتالہ عالم مسکرائی بھی تھی، ساتھ ہی اس نے اپنی نظر پھیری اور جلدی سے زبے کی طرف چل دی۔ مجید کے لئے فی الحال اس کی یہ نظر اور دل کش مسکراہٹ کسی قیمتی خزانے سے کم نہیں تھی۔ اس کا دل مسرت سے جھوم اٹھا، یہ پہلی کامیابی تھی جو اسے حاصل ہوئی تھی۔ پہلی محبت نے اس کی طرف پہلا قدم..... بڑھا دیا تھا۔

کرم دین اور اس کی بیوی ورطہ حیرت میں تھے کہ یہ کامیابی کیسے ہوئی۔ لیکن بہر حال یہ بہت خوش آئند بات تھی۔ مجید میں جو بدلاؤ آ رہا تھا وہ ان کے لئے کسی فن شدہ خزانے کے مل جانے سے کسی طور بھی کم نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اسے زیادہ کریدنا

اور خواہ مخواہ بال کی کھال اتارنا مناسب نہ سمجھا۔

مجید کا موڈ اب بے حد خوش گوادر بنے لگا تھا، اب وہ اپنے دوستوں کو یاد کر کے آنسو نہیں بہاتا تھا، اور نہ اپنی ماں سے بات کرتے ہوئے اس کی زبان میں کڑواہٹ اترتی تھی۔

نہ صرف ماں سے..... بلکہ اب توہ اپنے باپ سے بھی لگ کر باتیں کرنے لگا تھا۔

آج بھی دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد..... وہ کافی دیر تک اپنی ماں سے باتیں کرتا رہا۔ اور پھر جب ماں تھوڑی دیر کر سیدھی کرنے کے لئے لیٹی تو اس نے چھت کا رخ کیا۔

اسے امید تھی کہ وہ حینہ ضرور چھت پر آئے گی مجید نے نوٹ کیا تھا کہ وہ زیادہ تر دوپہر کے وقت ہی اپنی چھت کا رخ کرتی تھی۔

دل میں امید کی کرن لئے..... وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کا رخ کھڑکی کی جانب تھا۔

☆ ☆ ☆

کرم دین جب اپنا کام سمیٹ کر گھر لوٹا تھا تو مجید اور اس کی بیوی سو جایا کرتے تھے۔

لیکن کرم دین کے دروازہ کھٹکھٹانے پر بیوی کی آنکھ فوراً ہی کھل جایا کرتی تھی۔

آج بھی یہی ہوا، بیوی نے کھانا لگایا اور پھر دونوں بیٹھ کر دن کی باتیں کرنے لگے۔

یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ پھر باتوں باتوں میں مجید کا ذکر نکل آیا۔

”ارے ہاں..... بیوی چونک سی گئی۔“ میں آپ کو بتانا تو بھول ہی گئی..... آپ سن کر بہت خوش ہو گئے۔“

”اچھا..... بتاؤ پھر.....؟“ کرم دین نے بیوی کو ہنسا کر دیکھا۔

”مجید کہہ رہا تھا کہ وہ میٹرک دوبارہ کرے گا۔“ اس نے بتایا۔ ”تا کہ محنت اور لگن سے اچھے نمبروں سے پاس ہو جائے۔“

زہر

بج (ملزم سے) ”تم نے مقتول کو پانی میں زہر کیوں ملا کر دیا تھا؟“

”طرم۔“ جناب! انہوں نے خود یہ کہا تھا کہ ایسا پانی ہو کہ ٹھنڈا ہو جاؤں!“

سودا

راگبیر! ”ٹیکسی والے! بارغ جناح کا کیا لو گے؟“

ٹیکسی والا۔ ”بارغ جناح کیا میرے باپ کا ہے جو تم سے سودا کر لوں!“

(محمد جاوید علی رحمان)

”واہ زریںہ واہ.....“ کرم دین خوشی سے اچھل پڑا۔ ”یہ تو واقعی خوش خبری ہے۔“

”جی.....“ زریںہ نے سر ہلایا۔ ”وہ ٹیوشن کی بھی کہہ رہا تھا۔“

”بالکل..... بالکل.....“ کرم دین جلدی سے بولا۔ ”خرچہ کتنا بھی ہو۔ اگر مجید کسی قابل بن گیا تو یہی میری محنت کا پھل ہوگا۔“

”یہاں آ کر تو مجید بالکل ہی بدل گیا ہے۔“ زریںہ بولی۔ ”اب تو اپنے آدابہ دوستوں کا نام بھی نہیں لیتا۔“

”شکر ہے خدا کا.....“ کرم دین نے چھت کی طرف دیکھا۔ ”جو میں نے سوچا تھا..... وہ پورا ہو رہا ہے۔“ اسی کو کہتے ہیں کہ نیت صاف اور منزل آسان۔“

”ای..... مجھے کچھ کتابیں خرید کر لانی ہی.....!“

”ہاں..... ہاں..... بولو بیٹا..... کتنے پیسے

دوں.....؟

”500 روپے.....“ مجید نے کہا اور پھر سر کھجا کر بولا۔ ”ای..... ایک بات کہوں.....؟“
 ”ہاں ہاں..... کو.....“ زرینہ جلدی سے بولی۔

”ای.....“ وہ بولتے بولتے رکا، پھر اس سے ذرا توقف کے بعد دوبارہ سلسلہ جوڑا۔ ”ای..... آپ ذرا محلے والوں سے بھی جان پہچان بڑھائیں..... اچھی بات ہے..... ذرا آپ کا دل بھی بھلے گا..... اس طرح ہم لوگ کب تک اجنبی بنے رہیں گے.....“
 ”تم نے میرے دل کی بات کی ہے.....“
 زرینہ سر ہلا کر بولی۔ ”میں اس بارے میں سوچ ہی رہی تھی۔“

”تو پھر دیر کس بات کی ہے.....“ مجید جلدی سے بولا۔ ”میرے خیال سے..... سامنے والا جو گھر ہے.....“ اس میں رہنے والے لوگ کافی اچھے ہیں..... آپ ان ہی سے اپنی جان پہچان کی ابتداء کرو۔“

اور پھر دوسری صبح مجید کی والدہ سامنے والے گھر کے لئے نکل کھڑی ہوئیں۔
 مجید بڑی بے چینی سے اپنی ماں کی واپسی کا خطرہ تھا۔

زرینہ کو گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور مجید اپنے تصور میں سامنے والے گھر کا حال احوال دیکھ رہا تھا۔

وہ گھر کے اندر ہی ٹہل لگا رہا تھا وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں کر پا رہا تھا کہ گیٹ سے باہر نکل کر تاک جھانک ہی کر لے۔

وہ اپنے خیالات سے اس وقت چونکا جب دروازہ پر کھٹکا ہوا۔

وہ دوڑتا ہوا دروازے کی طرف لپکا، اسے کھولا تو ماں کی شکل دکھائی دی۔

اندر داخل ہو کر زرینہ نے برقعہ اتارا، اور ساتھ

ہی بولی۔

”واقعی..... بہت اچھے لوگ ہیں یہاں کے..... مجھے فوراً ہی چائے بسکٹ دیئے..... مجھ سے اچھی طرح ملیں۔ خوب باتیں کیں.....!“
 ”سچ..... ای.....؟“ مجید کے منہ سے نکلا۔

”ہاں بھئی.....“ زرینہ نے جلدی سے کہا۔ ”پھر چونک کر بولی۔“ لیکن تم نے مجھے جس گھر میں بھیجا تھا اس میں تو تالہ لگا ہوا تھا۔ کہیں گئے ہوں گے وہ لوگ..... میں تو اپنے برابر دانے گھر میں گئی تھی ان کی دو بیٹیاں ہیں..... 3 بیٹے ہیں.....“
 یہ سن کر مجید کی مسرت پر اوس پڑ گئی۔ وہ تو سمجھا تھا کہ اس کی ماں سامنے والے گھر والوں کی تعریف کر رہی ہے.....!

”تو..... سامنے والے گھر میں تالہ پڑا تھا.....؟“

”ہاں.....“ زرینہ نے جواب دیا۔
 پھر اس نے غور سے اپنے سینے کی طرف دیکھا۔
 ”کیا بات ہے؟ تم سامنے والے گھر پر زیادہ زور دے رہے ہو.....؟“

مجید شائیا گیا، پھر جلدی سے بولا۔
 ”ایسے ہی ای..... کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

”ہوں.....“ زرینہ نے سر ہلایا۔ ”مجھے تو برابر والے بہت پسند آئے۔ ان کی لڑکیاں بھی بہت خوب صورت اور ادب لحاظ والی ہیں۔ سب تربیت کی بات ہوتی ہے۔“ ہاں.....!“

وہ بولے جارہی تھیں اور مجید کا ذہن کہیں اور تھا۔

پھر دو دن بعد شام کے وقت وہ چمت پڑ آ گئی۔
 آج تو اشارے سے اس نے سلام بھی کیا تھا، مسکرائی بھی تھی۔ مجید کا حال اس پیاسے کی طرح تھا، جس کو سمندر مل جاتا ہے۔

دل خوشی کے مارے پھولے نہیں سارہا تھا، مجید نے اشاروں ہی اشاروں میں حال احوال کہنے کے بعد

اسے بتایا کہ وہ اپنی ان کو پہنچ رہا ہے۔

فنا حیدر اس کا مطلب سمجھ گئی، اور فوراً ہی شرما کر زینے کی طرف بھاگی۔

اس کے جاتے ہی مجید نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر فوراً ہی خود بھی نیچے کی طرف لپکا وہ چاہتا تھا کہ اس کی ماں ابھی اور اسی وقت سامنے والے گھر میں ہو کر آ جائے۔

وہ لوگ ابھی گھر ہی میں تھے۔ موقع اچھا تھا۔ تقریباً 1 گھنٹے بعد اس کی ماں زرینہ کی واپسی ہوئی۔

مجید کو اس وقت کا لمحہ کھٹکھٹن لگ رہا تھا، بل پل بھاری ہو رہا تھا۔

خدا خدا کر کے زرینہ واپس لوٹی، مجید نے دروازہ کھولا تو اس نے اپنی ماں کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے۔

”کیا ہوا ای.....؟ سب خبریت تو ہے نا.....؟“ بے ساختہ اس نے پوچھا تھا۔

”ہاں.....“ زرینہ نے سر ہلایا، پھر اندر آ کر اس نے مجید کی طرف غور سے دیکھا اور بولی۔

”تم نے مجھے کس گھر میں جانے کو کہا تھا.....؟“
 ”سامنے والے گھر میں..... کیوں کیا ہوا.....؟“

مجید الجھن میں پڑ گیا زرینہ کا لہجہ ہی ایسا تھا۔
 ”وہ گھر..... جس میں نیلے رنگ کا گیٹ لگا ہے..... وہی.....؟“

”جی..... جی..... ہاں.....“ مجید حیران تھا۔ ”آخر ہوا کیا ہے ای.....؟“

اس کی ماں تو جیسے پیلیاں بھجور رہی تھی۔

”میرے بچے..... میرے لال.....“ زرینہ نے اس کے ہاتھ تھام لئے۔ ”تم مجھے بار بار وہاں کیوں رہے ہو..... وہ گھر تو سالوں سے بند پڑا ہے..... خالی ہے وہ گھر..... اور..... وہاں اثر بھی ہے..... ہاں.....!“

یہ سن کر مجید کا تو ماغ ہی گویا جھک سے اڑ گیا۔

یہ..... یہ..... اس کی ماں کیا کہہ رہی تھی.....؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے..... تو پھر..... تو پھر..... وہ..... خوب صورت.....!!

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں بیٹا.....“ زرینہ دوبارہ بولی۔

مجید کے چہرے پہ بدلے ہوئے تاثرات اس نے بھانپ لئے تھے۔

”میں..... میں..... کیسے یقین کروں ای.....؟“ مجید نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

”تم مجھے بتاؤ..... بات کیا ہے.....؟“ زرینہ بولی۔

”میں پہلے بھی وہیں گئی تھی، پھر وہاں تالا دیکھ کر میں پڑوس میں چلی گئی، وہاں باتوں باتوں میں نے سامنے والے گھر کا ذکر کر دیا۔“

”پھر..... پھر انہوں نے کیا کہا..... ای.....؟“
 ”مجھے انہوں نے ہی بتایا ہے کہ سامنے والا گھر سالوں سے بے آباد ہے، اور اس میں اثرات ہیں..... اب..... اب تم اوپر نہیں جانا میرے بچے.....!“

زندگی میں جو بلاؤ آرہا تھا، اس کی روشنی کا ایک نئی مانند پڑ گئی تھی۔

مجید کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

اب اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا، اور غور سے مشاہدہ کیا تو یہ حقیقت اس پر کل گئی کہ سامنے والا گھر واقعی خالی تھا۔

اس کے ہنسنے میں چوٹیاں ہی رہ گئیں تھیں۔ اس کا دل کتنی گھرائیوں میں جا کر..... ڈوب گیا تھا۔

یہ سب کچھ معلوم ہو جانے کے بعد بھی جذبات کے ہاتھوں بھجور ہو کر اس نے چمت کارخ کیا۔

لیکن..... اس دن کے بعد سے اسے حسینہ کا ویدار دوبارہ نصیب نہ ہو سکا۔

سامنے والے مکان کی چمت..... اجاز پڑی



انوکھا کس

مدر بخاری - شہر سلطان

اچانک مترنم اور دل و دماغ میں رس گھولتی کھنکھناتی ہوئی آواز سنائی دی، میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں، تمہیں وعدہ کرنا ہڑے گا کہ تم مجھ سے شادی کرو گے، اور نہ کی صورت میں اور پھر ایک تھلک خیز منظر رونما ہوا۔

عشق و محبت میں شہر ایک ماورائی مخلوق کی عجیب و غریب اور دلکش روداد ایک شاہکار کہانی

سوموار کا دن تھا۔ آفس کا پہلا اور خاصا مصروف دن، سڑکے آف ہونے کی وجہ سے بہت سے کسیر آج میری ٹیکسٹ پر مبنی فائلز کی صورت میں میرا منہ چوم رہے تھے کہ اچانک فون کی ٹون بیل بج اٹھی! "ہیلو..... آپسٹر کا مران اسپیکنگ....." میں نے اپنے مخصوص انداز سے کہا.....! "جناب..... میں رحم شاہ بوائے اینڈ ایکوایفیا

کبھی سے بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف سے خاصی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا گیا۔ "جی فرمائیے..... ہماری خدمات ہر وقت حاضر ہیں۔"

"جناب.....! ہم لوگ کافی پریشان ہیں۔ پریشانی کی وجہ میرا اکوٹا بیٹا فرحان شاہ ہے۔ جسے گھر سے غائب ہوئے دو دن ہو چکے ہیں.....! اور ابھی تک

ای..... جی....."

"میں کہہ رہی ہوں یہ ہمارے پڑوسی ہیں۔"

"جی ہاں..... بہت اچھے ہیں ہمارے پڑوسی..... بہت اچھے ہیں۔ ایک بات کہوں ای.....؟"

"ہاں..... بولو۔"

"جس لڑکی نے..... آپ کوڑے دی ہے۔ وہ ہو بہو..... اسی چھت والی لڑکی کی طرح ہے..... بالکل وہی ہے.....!"

زرینہ کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی انہوں نے پیار سے اس کی کمر پر ایک دھپ مار لی اور بولیں۔

"بشری نام ہے اس کا..... تم پہلے اپنی پڑھائی پورا پورے مستقبل پر دھیان دو۔ میں تمہاری شادی بشری سے ہی کر اؤں گی۔ میں تو خود بھی یہی سوچ کر بیٹھی ہو..... چنگے.....!"

زندگی ایک بار پھر..... نئی ڈگر پر چل پڑی..... جو خواب چند لمحوں کے لئے ٹوٹا تھا اس کا سلسلہ پھر سے جڑ گیا۔

سامنے والے مکان کی چھت کا معرہ..... کبھی حل نہ ہو سکا..... عرصہ دراز سے خالی رہنے والا یہ مکان خالی ہی رہا۔

لیکن اس خالی مکان کی وجہ سے مجید کے دل میں بشری آکر بس گئی۔

کہتے ہیں کہ اچھی محبت اور اچھی صحبت انسان کو حقیقت میں انسان بنا دیتی ہے۔

مجید کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اور ہو سکتا ہے کہ جو کچھ ہوا تھا، اس میں تقدیر کی شمولیت ہو۔

سامنے والے مکان کی نچھت پر دکھائی دینے والی لڑکی کے روپ میں اب بشری اس کے سامنے تھی۔ اور..... اس سے شادی کرنے کے لئے اب مجید کو اپنا مستقبل بہتر بنانا تھا۔



تھی۔

جس دن سے مجید پر حقیقت کھلی تھی، اسی دن سے حسینہ غائب تھی۔

اپنی ماں سے آنکھ بچا کر اور موقع دیکھ کر مجید نے کئی بار چھت کا رخ کیا تھا، لیکن سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ لگا۔

اس دن اس کی یاں جائے نماز پر بیٹھی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

مجید ایک کتاب لئے بیٹھا تھا، اس نے کتاب رکھی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"کون ہے.....؟" اس نے پوچھا۔

"آئی میں.....؟" ایک زنانہ آواز آئی۔

اور پھر مجید نے جیسے ہی دروازہ کھولا، وہ حیرت کے مارے گرتے گرتے بھا۔

سامنے دو لڑکیاں کھڑی تھیں، ادران میں سے ایک ہو بہو چھت والی حسینہ تھی۔

"میں پوچھ رہی ہوں آنٹی ہیں....." یہ حسینہ کی ہی آواز تھی۔

اس کے ہاتھ میں کڑے سے دھکی ہوئی ٹرے تھی مجید ہونٹوں کی طرح اسے دیکھے جا رہا تھا۔

آئی دیر میں زرینہ خود ہی جائے نماز سے اٹھ کر ان کی طرف آ گئیں۔

اور جیسے ہی ان کی نظر لڑکیوں پر پڑی، وہ کھل اٹھیں۔

"ارے مجید..... یہ برابر والوں کی لڑکیاں ہیں۔ اسماء اور بشری!"

"یہ لیں آنٹی....." حسینہ نے ٹرے ان کی طرف بڑھا دی۔ "ای نے بریانی بھجوائی ہے۔"

زرینہ نے مسکراتے ہوئے ٹرے اس کے ہاتھ سے لے لی اور وہ دونوں چلی گئیں۔

"یہ ہیں ان کی لڑکیاں..... سن رہے ہو..... کہاں گم ہو.....؟"

"جی....." مجید جیسے نیند سے جاگا ہو..... جی

اس کا کوئی انتہہ نہیں.....!"

”محترم! دو دن سے آپ کا بیٹا گھر سے غائب ہے اور آپ نے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کروائی.....! ہو سکتا ہے وہ کسی رشتہ دار یا کسی دوست کے پاس گیا ہو.....!"

”ہم تمام رشتہ داروں اور دوستوں سے کفرم کر چکے ہیں لیکن کچھ پتہ نہیں.....! دوسری طرف سے کہا گیا....."

”جناب.....! آپ میرے آفس تشریف لے آئیں..... اور کھل کر بات بتائیں تاکہ جلد از جلد معاملے کی تہہ نیک پہنچا جاسکے....."

”جناب.....! اگر میں آسکا ہوتا تو آپ کو فون پر زحمت ہرگز نہ دیتا۔ پچھلے دو ہفتوں سے میری ٹانگیں فارغ زوہ ہو گئی ہیں۔ معذوری کی حالت میں یوں بھی نہیں جاتا۔ ہر طرف سے مکمل چھان بین کرنے کے بعد آپ سے رابطہ کیا.....!"

”اوکے.....! میں آپ کے پاس آ رہا ہوں.....! آپ مطمئن رہیں۔" میں نے کہا.....!

”ڈیننگ سر.....! ایکوینٹا کمپنی فلور نمبر 5، روم نمبر 4..... دوسری طرف سے سلیٹیٹ ایڈریس بتایا گیا....."

وہ ایک متاثر کن پرنسٹن کا کالک تھا۔ کمرہ خاصا کشادہ اور شاندار انداز میں سجا ہوا تھا۔ مجھے یہاں آنے میں کوئی دقت تو نہ ہوئی البتہ ایک انوکھا واقعہ ہوا جو مجھے یہاں بیان کرنا ہے۔

رہم نمبر 4 ایک الگ انداز کا کمرہ تھا۔ جس کی ڈیکوریشن اور تزئین و آرائش پر خاصا خرچ اٹھا ہوگا۔ ایک چیز جس نے مجھے خاصا پریشان کیا وہ یہاں کے لوگوں کا پراسرار رویہ اور ایک سرائی قسم کی بو.....! ایک ایسی گندی بو جس نے میرے دماغ کی شر باتیں تک بلا دیں.....! اور میں نے اس سے بچنے کے لئے سائیز جیب سے رد مال نکالنا چاہا لیکن حیرت انگیز طور پر رد مال موجود نہ تھا۔

اس کیس میں ایک اور بات بھی رد مال ہوئی جو خاصی مبہم رہی۔ مطلوبہ ایڈریس پر پہنچنے سے پہلے ایک

بزرگ جن کی داڑھی برف کی مانند سفید اور آنکھوں میں گہرائی موجزن تھی۔ مجھے ڈسمنٹ پرلے.....!

”تم بہت فرض شناس آفیسر ہو لو جوان۔ مگر ایک بات یاد رکھنا..... روحانی طاقتوں کا مقابلہ بدی کی اندھی سیاہ طاقت ہرگز نہیں کر سکتی۔ اگر کبھی بدی کی اندھی یلغار میں جکڑے جاؤ تو غریب خانے پر آ جانا.....!" اس کے بعد وہ بزرگ اللہ اللہ کرنے ہوئے باہر نکل گئے۔

ویسے وہ جگہ کمپنی کا آفس کم اور پراسرار زیادہ محسوس ہوتا تھا.....! میں جب سے اس آٹھ منزلہ عمارت میں داخل ہوا تھا میرا دماغ گھوم گیا تھا.....! میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ جس میں اتنی گندی بدبو کا سامنا کرنا پڑا تھا..... حیرت کی بات یہ کہ یہاں کے لوگ بھی خاصے پراسرار انداز میں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے..... ایک عجیب سا ماحول تھا..... خیر میں روم نمبر 4 میں پہنچ گیا.....!

رحم شاہ کی متاثر کن پرنسٹن میں صرف ٹانگوں کی معذوری کا داغ تھا ورنہ وہ بڑھاپے میں بھی خاصا اسارٹ اور پرکشش تھا.....!

”آئیے انکپٹر صاحب.....! تشریف رکھیے.....!"

رہی علیک سلیک اور صحت یابی کی دعا کے بعد وہ دعا بیان کرنے لگا.....!

”میرا ایک ہی بیٹا ہے فرحان شاہ..... سافٹ ویئر انجینئر فراہم ہارڈ ویئر سٹریٹ آف امریکہ.....! ٹاپ کلاس پروگرامیں ان آل کانسڈ آف سافٹ ویئر.....! لیکن پچھلے دو ماہ سے ایک ایسی بیماری کا شکار ہوا ہے کہ زندگی مردہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ہر چیز سے اجاٹ اور ذہن میں خلقت سراسیمہ ہو گیا ہے۔ راتوں کو لیٹ آتا.....!"

”لیکن جناب.....! وہ تو دو ہفتے سے غائب ہے۔" میں نے کہا.....!

”بالکل.....! میں اسی طرف آ رہا تھا.....!"

”جی.....! بتائیے.....!"

”اس کا ذہن ایک سوئی پر تک سا گیا تھا.....! وہ صرف ایک منہ کا مرکب ہوا تھا۔ ایک ایسا گناہ جو عزت تار تار کر دیتا ہے۔ حساس ہونے کے ناطے اس نے یہ بات اپنے دماغ میں بیٹھائی اور پھر.....! اور پھر.....! دوسرا انجینئر فیض فرار دے دیا گیا.....!"

مجھے بہت افسوس ہوا تھا اس باپ کی داستان غم سن کر..... لیکن وہ بھی تو بہت مبہمی باتیں کر رہا تھا.....!

”میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں..... کہ یہ واقعہ کیسے ہوا.....!" میں نے پوچھا.....!

”مجھے اس بارے میں قطعی علم نہیں..... میں بار بار پوچھا رہا مگر وہ صرف ایک ہی بات دہراتا تھا..... ڈیڈی میرا گناہ بہت بڑا ہے اور جس کی مجھے سزا ملی ہے.....!"

”اور کوئی ایسی بات جو اس کیس کے کچھاد میں مہری مد کرے.....!" میں نے پوچھا.....!

”ہاں..... ایک اہم بات.....! پھر اس نے ٹیکل تیل پریس کی.....!"

”کیس سر.....!"

”مشکور.....! چھوٹے صاحب کے کمرے سے جو خطا تھا وہ لے کر آؤ..... اور کنٹرول روم سے مسٹر ڈیوڈ کو اندر بھیج دو.....!"

اس خط میں بہت سی باتیں تھیں.....! لیکن خاص بات یہ کہ ایک لڑکی کا خون سے لکھا محبت نامہ تھا.....! لڑکی خاصی جذباتی قسم کی تھی جس نے فرحان شاہ کو مکمل طور پر اپنانے کا دعویٰ کیا تھا.....!

بہت سے تعریفی کلمات اور جھوٹی جی قسمیں بھی مواد کا حصہ تھیں.....! ایک اہم بات یہ تھی کہ رائٹنگ خاصی Poor تھی..... اتنی عام سی لکھائی والی لڑکی جس میں سادگی شامل تھی..... نہ کوئی بناوٹ نہ جدید دور کے مطالبات کوئی اسٹائلش Look.....!

نام درج نہیں تھا مگر مخصوص استاد کا نشان واضح تھا.....!

جب میں نے وہ خط پڑھ لیا تو رحم شاہ کی طرف دیکھ کر گویا ہوا..... "اس خط کو آپ کس معنی میں لیں

گے؟" میں نے پوچھا.....!

”انکپٹر صاحب.....! یہ لڑکی فرحان کی ایسی دوست محسوس ہوتی ہے جو کم از کم امریکہ سے نہیں ہے..... وگرنہ اس کی رائٹنگ اتنی بری نہ ہوتی.....!"

انہوں نے کہا.....!

”یہ مکمل پاکستانی رائٹنگ ہے.....!" میں نے ایک خیال کے تحت کہا.....!

”مجھے بھی یہی شک ہے.....!"

”شاہ صاحب.....! آپ کے بیٹے کی دوسری مصروفیات کیا تھیں.....?"

27 سال کی عمر میں بہت بڑا کام یہ کہ اس نے ملٹی ٹیکسٹ کمپنیز کی تمام سافٹ ویئر انسٹالیشن ترتیب دی..... گاؤں میں ہمارا کچھ رقبہ بھی ہے.....! مجھے یاد پڑتا ہے ایک بار فرحان گاؤں گیا تھا.....! سال 2011ء تھا..... لیکن پھر کبھی اس طرف نہیں گیا.....!"

کنٹرول روم سے ڈیوڈ کی آمد نے چونکا دیا.....! اس کے ہاتھ میں ایک ویڈیو ٹیپ تھی.....!

”جناب.....! یہ سی سی ٹی وی فوٹیج ہے۔ جس میں فرحان کی زندگی کے میٹ اور برے دونوں طرح کے ریکارڈ موجود ہیں.....! فرحان کی موجودہ تصویر اور اضافی معلومات بھی.....! آپ اسے دیکھ لیجئے گا.....!"

اس نے ٹیپ مجھے تھماتے ہوئے کہا.....!

”میری آپ سے ایک گزارش ہے.....!"

”جی فرمائیے.....!"

”اگر مجھے فرحان کے کمرے کا Visit کرادیں تو ہو سکتا ہے ہمیں کچھ مزید ایسا پوائنٹ مل جائے جو کیس حل کرنے میں مددگار ثابت ہو.....!"

میں نے کہا..... میں نے کہا.....!

”وائی ناٹ.....!"

پھر میں نے فرحان کے کمرے کا معائنہ کیا.....!

کچھ خاص نہ ملا مگر ایک سافٹ ویئر کی پروگریس سی ڈی ہاتھ لگی جو وہ ان دنوں تیار کر رہا تھا.....!

فوج میں وہ ایک خوب رو اسارٹ نو جوان نظر آیا۔

برغم سے آزاد اور نگر زندگی سے دور وہ نوجوان شہزادہ نظر آیا۔ لیکن پھر منظر بدلا۔ وہی شہزادہ۔ کٹی کا بھکاری نظر آنے لگا۔ یہ سب کیسے ہوا اس کا مجھے صرف ایک ہی سرا سمجھ میں آیا کہ لڑکی کی محبت۔ لڑکی کون تھی؟ اس کا فرحان سے کیا تعلق تھا؟ سائیکو پشید اور زندگی سے بیزار فرحان شاہ اس وقت کہاں تھا؟ کچھ سمجھ نہ آیا۔ لیکن پھر جب میں نے سافٹ ویئر کی ڈی پی لے کر کچھ الگ طرح کا نظارہ ملا۔

سافٹ ویئر کی ڈی میں انگش میوزک وقفے وقفے سے لے لے بیک میوزک کے طور پر اشارت ہو جاتا۔

پھر ڈبل ڈبل ہوتا اور ایک لڑکی کی شبیہ نظر آتی۔

آہستہ آہستہ اس لڑکی کی تصویر واضح ہو گئی۔ وہ فرحان شاہ سافٹ ویئر پر ڈش کی تیار کردہ سی ڈی تھی۔ ہیلو اینڈ گریٹنگ کارپوریشن کی جانب روانہ ہونے والی اس سی ڈی میں لڑکی کی تصویر ہم صورت حال تھی۔ میں نے ڈسک نکالی اور دوبارہ لے لی۔

مگر اب کی بار وہ لڑکی دوبارہ نظر نہ آئی۔ یہ خاصی عجیب صورت حال تھی۔

لڑکی خاصی خوب صورت اور دلکش عین نقش کی حامل تھی۔ ایک بات جو واضح نظر آئی کہ لڑکی کا تعلق گاؤں سے تھا۔ مخصوص قسم کا لباس اور چوڑیاں بندھے ہوئے بال اور گہری معصومیت کی حامل اس لڑکی کا تعلق قطعی شہر سے نہ تھا۔

میں نے رحم شاہ سے ہیلو اینڈ گریٹنگ کا نمبر لیا۔

چند منٹوں میں رابطہ قائم ہو گیا۔

”ہیلو۔ میں انسپٹر کامران بول رہا ہوں۔“

”ہیں سر۔“

”ہیلو گریٹنگ کے پیجر سے بات کرنی ہے۔“

”ہولڈ آن کریں سر۔ ابھی بات ہو جاتی ہے۔“

”ہے۔“

چند لمحوں بعد ایک بھاری آواز نے بات کی۔

رسی علیک سلیک کے بعد میں نے فرحان شاہ کیس کے بارے میں بتایا۔

”نسیم صاحب! آپ کے سافٹ ویئر میں کی لڑکی کی تصویر بھی شامل ہے۔“

”نو۔ بالکل نہیں۔“

پاس ہمارا Accountantry سافٹ ویئر تھا۔ اس نے بتایا۔

”اوکے۔ نسیم صاحب۔ بہت بہتر شکریہ۔“ میں نے فون رکھ دیا۔

حیرت انگیز بات تھی کہ سافٹ ویئر میں لڑکی کی تصویر کیوں شامل کی گئی۔ اور جب دوبارہ چلائی گئی تو لڑکی کی تصویر غائب تھی۔ آخر ایسا کس طرح ممکن ہے۔

پھر ایک دن ایک انجینی فون کال آئی۔

”ہیلو۔ انسپٹر کامران اسپیکنگ۔“

”آئی ایم مرتضیٰ حسین۔ سر! میں فرحان شاہ کیس کے سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔“

”ویکم۔ ضرور۔ آپ آفس تشریف لے آئیے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

30 سالہ مرتضیٰ حسین واجبی شکل و صورت کا حامل تھا۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک واضح نظر آئی۔

وہ خاصا ذہین نوجوان تھا۔

”سر! فرحان میرا گہرا دوست ہے۔ دوپٹے سے لاپٹاپ اور مجنوں صورت بنا رہی ہے۔ دوپٹے پہ اس سے میری بات ہوئی تھی۔ بہت مایوس اور ادا تھا۔ وہ مارکیٹ میں ایک جدید سافٹ ویئر لانچ کر چاہتا تھا۔ خاصا ذہین اور پر اعتماد تھا۔ کاش کہ وہ۔۔۔ اگر وہ گاؤں نہ گیا ہوتا تو آج ایسا نہ ہوتا۔“

”کیا مطلب۔۔۔ گاؤں کا فرحان کیس سے کیا تعلق ہے؟“ میں چونکا۔

”یہ پچھلے سال کی بات ہے۔“ جب ہم چار دوست فرحان کے گاؤں چمک منانے گئے تھے۔ وہاں ان کا ایک فارم ہاؤس بھی ہے۔ شاہ مراد ان کے ایک ملازم کا نام ہے جس کی بیٹی فائزہ۔ فرحان کے عشق میں مبتلا ہوئی۔

دونوں کی ملاقات ندی پر ہوئی تھی۔ جب فائزہ ندی میں جا گری تھی۔ ہم لوگ کرکٹ کھیل رہے تھے۔ فرحان پال لینے گیا تو اسی وقت فائزہ ندی میں جا گری۔ جب فرحان نے اسے ندی سے بحفاظت نکالا۔ سردیوں کی شام میں فائزہ تھر تھر کا پینے لگی۔ فرحان نے اپنا کوٹ اسے اوڑھا کر محبت کی ابتدا کی تھی۔

فائزہ خاصی خوب صورت اور باجیا تھی۔ لیکن فرحان کے عشق میں ایسی بڑی کی بر باد ہو کر رہ گئی۔

”کیا آپ فائزہ کو پہچان لیں گے۔؟“ میں نے پوچھا۔

”وائی ناٹ۔“

پھر میں نے سافٹ ویئر کی فرسٹ کاپی لے لی۔ جس میں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا۔

میں نے کاپی کرنی تھی۔ وگرنہ سینڈ ٹائم تو لڑکی نظر نہ آتی تھی۔

فرحان چونک پڑا تھا کیونکہ اس نے فائزہ کو پہچان لیا تھا۔

وہ لڑکی واقعی فائزہ ہی تھی۔ سافٹ ویئر میں اس کی تصویر کیونکر آئی تھی۔ کچھ سمجھ نہ آئی۔

”لیکن سر۔ فائزہ کی تصویر پرنس اکاؤنٹی کے سافٹ ویئر میں کیونکر؟“

”یہ بات غور طلب ہے۔ خیر یہ مسئلہ تو حل ہو گیا۔ کہ وہ لڑکی شاہ مراد نامی ملازم کی بیٹی تھی۔“

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ شاہ مراد کی بیٹی فائزہ نامی تھی۔

نام قیاس آرائی یہی تھی کہ فائزہ بھاگ گئی تھی۔

مراد کو اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ ایک ہی اولاد تھی۔ جو تارخان نکلی تھی۔

اس دوران اسے ایس آئی شہت نواز اور ایک کاشمیل میرے ہمراہ تھے۔ ہم نے فارم ہاؤس اور فرحان شاہ کا مکمل رقبہ راونڈ کیا۔

شاہ مراد ایک سختی آوی تھا۔ بیٹی کا غم الگ تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کی وحاشا بندھ گئی تھی۔ میں نے اسے مکمل تسلی دی۔

ایک واضح سراٹھ مجھے اس کے گھر کے کمرے میں محسوس ہوئی، یہ رحم شاہ کے آفس میں بھی موجود تھی اور ادھر شاہ مراد کے گھر میں بھی۔

لیکن میں نے اس کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

”سر۔۔۔ یہ معاملہ سیدھا سادہ سا ہے۔ دو بالغ مرد عورت پسند کی شادی کرنے کے لئے گھر سے بھاگ گئے۔ کورٹ میرج کر لیں گے۔ ہم کیوں مفت میں مارے مارے پھرتے رہیں۔“ حوالہ دے کر فرحان بولا۔

”خان جی۔۔۔ فرحان ایک دماغی مریض ہے اور دماغی مریض کچھ بھی کر سکتا ہے اور فرحان کا باپ اربوں کا مالک ہے۔

ہمارے ملک کی ایک بڑی کمپنی کا مالک۔ وہ جس سے چاہے اپنے بیٹے کی شادی کر سکتا ہے۔“

”سر۔۔۔ آپ کو مردہ بو محسوس ہوئی تھی جب ہم شاہ مراد کے گھر میں داخل ہوئے تھے۔“ شہت نواز بولا۔

”ہاں۔۔۔ یہی بوجھ رحم شاہ کے کمپنی آفس میں بھی محسوس ہوئی تھی۔ کیس کے ساتھ یہ بھی عجیب ہے۔“

”اور سر۔ شاہ مراد کی بیوی بہت کالی تھی۔ مجھے تو ڈر لگ گیا تھا۔ اور سرخ زبان۔ سوچی۔ کاشا نظر آتی تھی۔“

نذیر خان اپنے مخصوص انداز میں بولا اور میں ہنس پڑا۔

☆ ☆ ☆

ماہین رضا۔ میڈیا ڈیپارٹمنٹ کی ہیڈ چیف تھی۔ بہت ذہین اور تیز۔ کرمنٹو میں ایم فل اور

ہر مسئلہ کو جڑ سے نکال دیتے تھے۔ والی.....!

میں نے سارا گیس ماہرین رضا کو بتایا.....! چند لمحوں بعد اس کی آنکھوں میں چمک نظر آنے لگی.....!

”سر! آپ مجھے وہ خط دکھائیں گے جو فرحان شاہ کو لکھا گیا تھا.....!“ اس نے کہا۔ میں نے خط وراز سے نکال کر ماہرین کو دکھایا۔

وہ کافی دیر تک اس خط کو دیکھتی رہی۔

”سر یہ رائٹنگ انسانی نہیں!“ وہ بولی۔

میں حیرت سے اچھلا.....! ”لیکن وہ کیسے؟“

”سر.....! میں نے رائٹنگ میں ماسٹرز اور حتی الوسع ریسرچ کی ہے۔

دنیا کی ہر زبان ایک خاص دائرے میں گھومتی ہے۔ انگریزی، فرانسیسی، لاطینی، اروو، فارسی یہ ایسی زبانیں ہیں جو ایک خاص گولائی اور مخصوص انداز میں لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔

الفاظ کی مخصوص گولائی انسانی ہاتھ سے اس طرح ممکن نہیں.....! رائٹنگ خاصی کمزور ہے جبکہ اگر لکھنے والا چاہتا تو اسے مزید برا کر سکتا تھا۔ اسی طرح وہ اسے بہت اچھا بھی لکھ سکتا تھا.....!“

”ماہرین! آپ مکمل وثوق سے کہہ سکتی ہیں کہ انسانی ہاتھوں سے یہ خط نہیں لکھا گیا ہے۔“

”جی بالکل.....! مکمل اعتماد اور یقین کے ساتھ..... انگریزی رسم الخط انسانی ہاتھ سے اس طرح لکھنا ناممکن ترین ہے.....!“ وہ اعتماد سے بولی.....!

”اوکے..... مان لیتے ہیں..... کہ یہ انسانی لکھا ہی نہیں..... مگر پھر یہ خود بخود جو جو میں نہیں آئی..... اور فرحان کا نام بھی واضح ہے.....“ میں نے کہا۔

”غیر مرئی مخلوق بھی اسی کائنات کا حصہ ہے، کامران صاحب! مجھے تو یہ بتانی کھیل معلوم ہوتا ہے.....“

فضول باتوں کا وقت نہیں ہے ماہرین.....! ہمیں ان دونوں کا فریڈلکس ایریا ٹائٹل میں لانا ہے.....!

یہ بات فضول نہیں ہے سر.....! خیر یہ تو وقت ہی

ثابت کروے گا.....! آپ اس خون کا DNA کرالیں.....!

مجھے تو یہ انسانی خون معلوم نہیں ہوتا..... اس میں سے خاصی بو اور سرائی آ رہی ہے۔“ وہ بولی۔

ماہرین کی بات دل کو گتھی تھی۔ واقعی کوئی انسانی لکھا ہی معلوم نہ ہوتی تھی جبکہ نزدیک سے اس خون سے سرائی آ رہی تھی۔ خاصی عجیب اور مردہ سی.....!

”اوکے..... اسے ابھی بھجوا دیتے ہیں.....“

اور پھر دوسرے دن ٹیسٹ کا رزلٹ آ گیا۔

حیرت انگیز طور پر اس خون میں انسانی خون کی آمیزش شامل نہ تھی۔ وہ الگ قسم کا Blood تھا۔

ماہرین کی ریسرچ جاری تھی۔ مس ماہرین کا شک یقین میں بدل گیا تھا.....!

یہ ایک عجیب صورت حال تھی..... Blood کسی مردہ جانور کا بتایا گیا تھا.....! اسٹکفروم.....!

اور لکھا ہی بھی کسی غیر مرئی طاقت کی تھی۔

نا قابل یقین.....! خیر جیسے تیسے یقین کرنا پڑا.....!

ماہرین ایک بار پھر میرے سامنے تھی۔

”میرا کہنا سچ ثابت ہو گیا..... وہ طاقت کو ہے..... اس کا پتہ شاہ مراد اور اس کی بیوی سے ملے گا.....!“ وہ بولی۔

”وہ کیسے؟“

”مجھے یہ سارے کردار پر اسرار اور جتنا ہی ناگ لگ رہے ہیں! ہمیں اس کیس میں کسی بزرگ کی خدمات لینی چاہئیں.....“ وہ بولی۔

”مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آپ کس طرح کی بات کر رہی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ کائنات کا حصہ ہیں مگر انسان سب پر بھاری ہیں۔ وہ ہمیں نہ جان سے مار سکتے ہیں اور نہ ہی ہم سے زیادہ طاقتور ہیں.....“ میں بولا.....!

”انسان بھاری ہے تبھی تو کسی ایسی ہستی بات کر رہی ہوں۔ جو اس مخلوق کو مخصوص انداز سے کرے.....! قرآنی آیات مخصوص وظائف اس مخلوق

زمرہ کر سکتے ہیں.....!“

”لیکن.....! ابھی اس کا وقت نہیں آیا..... ہم بھی اور اسی وقت شاہ مراد کے ہاں چلتے ہیں شاید کچھ کھیل مل جائے.....!“ میں نے کہا۔ اور ہم شاہ مراد کے پاس پہنچ گئے۔

نا قابل یقین.....!

شاہ مراد اور اس کی بیوی کی قبریں ہمارا منہ چڑا رہی تھیں۔ میں نے فاتحہ خوانی کی.....!

”عزیز.....! معاملہ سلجھ گیا.....! پچھارے دونوں بات گئے.....!“

ایک بیٹی تھی اس کا غم الگ تھا.....! جو مر گیا غم سے آزاد.....!“ مذہب خان بولا.....!

”ایسا نہیں کہتے مذہب! کسی کے مرنے پر کوئی غم سے آزاد نہیں ہوتا.....!“

”ہمیں وہاں کچھ لوگ ملے.....! جن کے بیان حیرت انگیز تھے.....!“

”وہاں کے ایک رہائشی کا بیان تھا۔

”صاحب! شاہ مراد نامی شخص کی وفات پانچ برس پہلے ہوئی.....! اس کی بیوی دو سال بعد جل مری گئی۔ جبکہ اس کی بیٹی فاتحہ اپنے یار کے ساتھ بھاگ گئی تھی.....!“

حیرت انگیز.....! پانچ سال پہلے.....! جبکہ ایک ہفتہ پہلے ہم لوگ ان سے ملے تھے.....! ابھی خاصی باتیں ہوئی تھیں۔ معاملہ خاصا گھمبیر تھا.....!

پھر رہتے رہتے مجھے رحم شاہ کا خیال آیا.....!

میں نے ان کی زمینوں پر کام کرتے لوگوں سے پوچھا.....!

”رحم علی شاہ کے بارے میں کچھ بتاؤ.....!“

”وہ تو جی بہت سال پہلے فاتحہ زدہ ناگوں کے ساتھ اللہ کو پیارے ہو گئے تھے.....!“ ایک نے جواب دیا.....!

ماہرین کی باتیں سچ معلوم ہونے لگیں۔

یہاں تو معاملہ ہی اُلٹ گیا..... سارے کردار

اللہ کو پیارے ہو گئے تھے..... حشمت نواز خاصا سنجیدہ اور مذہب خان خاصا پریشان تھا.....!

وہاں سے واپسی پر دوسرے دن ہم لوگ ایکو فینا سکینی پیچھے مگر حیرت انگیز.....! وہاں ایک ریسٹورنٹ تعمیر کیا جا رہا تھا.....!

لوگوں کے مطابق کبھی یہاں سینما ہوا کرتا تھا جبکہ آج کل ایک ملکی کمپنی ریسٹورنٹ تیار کر رہی تھی.....! ایکو فینا کے نام سے کوئی کمپنی موجود ہی نہ تھی۔

ایک فل ٹائم مذاق ہوا تھا.....!

ہم لوگ بری طرح پھنس چکے تھے..... سارے لوگ ہماری لٹی کر رہے تھے..... میرا وارغ شدید ترین ڈپریشن میں تھا جبکہ کیس کے سارے کردار مٹی ہو گئے تھے سوائے فاتحہ اور فرحان کے.....!

نجانے وہ لوگ دنیا میں تھے بھی یا نہیں.....

پانچ سال پرانا کیس.....! اس طرح دوبارہ کیوں اسٹارٹ ہوا؟..... یہ چند سوالات تھے جو ہمیں ہر صورت چاہئے تھے۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک یادگار دن تھا۔ جب اس انوکھے کیس کو سلجھانے کا ایک سرا میرے ہاتھ لگا۔ اس دن خوب بارش ہوئی تھی۔ دھنک کے بعد آسمان گھبرا گیا تھا۔

میں آفس میں پہنچا ہی تھا کہ ایک دھان پان سا شخص ڈری آہی آنکھوں کا مالک آدھکا.....!

دائیں ہے اس شخص کی عمر 45 کے ارد گرد ہی ہوگی۔

”جی فرمائیے.....! میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا.....

”آپ کامران بخاری؟“ اس نے گویا سوالیہ انداز سے پوچھا۔ انداز خاصا دلکش اور پڑھا لکھا تھا.....!

”جی..... آپ نے ٹھیک کہا.....“ میں نے چہرے پر مسکراہٹ بجا کر کہا۔

”سر..... میرا کیس آپ کی دید کا خطرہ ہے.....!“ وہ پراسرار انداز میں بولا۔

”میرے پاس بہت سے کپس ہیں۔ آپ کس کپس کے متعلق بات کر رہے ہیں؟“ تعارف کرائیں۔ میں کسی نیچے پر پہنچوں۔“

”فرحان علی اور فائزہ کا کپس۔“ وہ بولا۔

”میں زوردار انداز سے جیسے اچھل پڑا۔ یہ کپس آج کل واقعی پراسرار اور ہیبت ناک تھا۔ جس طریقے سے تمام کردار مٹی ہو گئے تھے اور کوئی واضح حل نہیں سوچ رہا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہ سب دھوکہ تھا۔ ایک ایسا دھوکہ جو کسی غیر مری مخلوق کی طرف سے کھیلایا گیا ہو۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اس ہار کپس کے تمام کردار و دنیا میں موجود ہے تھے۔ وقت نے انہیں مٹی کر دیا لیکن ان میں سے وہ کردار ابھی زندہ تھے۔ جس میں سے پہلا کردار جو زندہ تھا میرے سامنے تھا۔“

”فرحان شاہ۔“ واقعی آپ کا کپس میری کھڑی میں ہے۔ خاصا جاندار اور زبردست واقعات سے بھرپور۔“ پھر میں نے اسے تمام حالات و واقعات سنائے۔ جسے وہ لکھ چکی تھی۔ سن رہا تھا۔

پھر وہ سبک پڑا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے، کچھ دیر بعد وہ سنبھل گیا تو میں نے غصہ امانی پلایا۔ گوکہ یہ میری کہانی کی ذمہ داری لیکن مقصد صرف اتنا ہے کہ محبت جو الگ رہی ہے۔ اس نے فائزہ سے محبت کی تھی۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے۔ سمندر کی نرم لہروں اور ریت کی نرمی جیسا پیار۔ وہ حساس شخص کی سال پرانی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا سب کچھ فنا کر بیٹھا۔“

”فرحان۔“ فائزہ کا جنازہ؟ اس وقت کہاں ہے وہ۔“ میں نے پوچھا۔

”بابا چراغ علی شاہ کے مطابق فائزہ اس دنیا میں ہے۔ لیکن ہماری اس تک رسائی صرف ایک صورت میں ممکن ہے جب میری دونوں آنکھیں ضائع ہو جائیں۔“

”لیکن فرحان۔“ آنکھوں کے ضائع ہونے سے بھلا فائزہ کا کیا تعلق ہے؟“

”میں آپ کو اپنی مکمل اسٹوری سناتا ہوں۔ وہ سن لیں۔ پھر بعد میں کوئی مکمل فیصلہ کیجیے گا۔“

”وہ ایک بہت پیارا دل تھا جب فائزہ مجھے پری۔ ہم لوگ گاؤں کی خستہ دادی میں کرکٹ کھیلتے تھے۔ جب فائزہ سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اس کی آنکھیں جمیل سے حسین اور چہرہ مانند حور فرات تھیں۔ کہ وہ مجھے بہت اچھی لگی۔“

اس سے پہلے میں نے متحدہ ہائے امریکہ سے سافٹ ویئر انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ بہت سی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ساتھ سافٹ ویئر کنٹرولنگ سائن ہوتے تھے۔ ایک لحاظ سے مارکیٹ میں آنے والے تمام جدید سافٹ ویئر پروڈکٹ کا راز پروڈکٹ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں زبردست ایروڈ سے کامیابی کی جانب رواں دواں تھا کہ پھر فائزہ کا غم مجھ پر سوار ہوتا گیا۔ میری سوچ میں فائزہ ہی فائزہ غم میں اسے سیل فون دے آیا تھا۔ ہم گھنٹوں باتیں کرتے۔ یہ عشق دو طرفہ تھا۔ پھر میں ایک دن گاؤں گیا۔

فائزہ میری باتوں کی زینت بنی۔ میرے بہت قریب آئی۔ شعور کی تمام حدیں کراس ہو گئیں۔ میں اسے واندار کر چکا تھا۔ پر اپنے اس گناہ پر تادم تھا۔ بہت شرمندہ بھی ہوا۔ بہت پشیمانی ہوئی۔ بہت سی معافیاں مانگیں۔ خدا کے حضور گڑ گڑایا۔ فائزہ کی طبیعت خراب ہونے لگی تھی۔ میں نے اسے غائب ہو گیا۔ پھر مجھے فائزہ کی نازل حالت کے لئے انتہائی تدم اٹھانا پڑا۔ میں نے اسے شہر میں ایک دوست کے پاس ٹھہرایا۔

لیکن ایک پوائنٹ۔ فائزہ اس دور مکمل طور پر خاموش رہی۔ نہ ہوش اور بے ہوش۔ وہ بیماری جس کرب سے گزر رہی تھی اسے بہتر جانتا ہوں۔

وہ ایک خوفناک رات تھی، اماؤں کی گھانٹاؤں رات کا سنا تھا۔ میں سادہ لباس میں ٹھہرتی رات سنانے میں لگی تھی۔ گزر رہا تھا۔ میں اس گھانٹاؤں

میں خاصا تیز چل رہا تھا۔ آج صبح ایک انجینی کی کال رہی ہوئی۔“

”ہیلو۔“ آواز میں مٹھاس اور شہرینی تھی۔

”ہیلو فرحان علی اسپیکنگ۔“

میں مس شہلا بات کر رہی ہوں۔ ڈاک بنگلہ ہے۔ آواز میں وہی حلاوت اور چاشنی۔

”جی فرمائیے۔“

”فرحان صاحب! فائزہ کی موت۔“ اور وہ خاموش ہو گئی۔

”میں کتنے میں آگیا تھا۔ فائزہ کی موت۔“

”کیا مطلب؟“ میں واقعی بے ہوش ہونے لگا تھا۔

”اگر آپ آج رات ڈاک بنگلہ میں نہ آئے تو فائزہ کی موت واقعی آپ کے لئے صدمے کا باعث ہوگی۔“

”فائزہ اس وقت کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے پاس ہے! آپ پلیز، میرے پاس آج رات تشریف لے آئیں۔“

”اوکے! لیکن مجھے فائزہ کی زندگی کی مکمل وضاحت چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”بے فکر رہو۔! اسے کچھ نہ ہوگا۔ آج رات میں تمہارا انتظار کروں گی۔“

رات کی گہرائی کا اندازہ لگانا خاصا مشکل تھا۔ اس دھڑکتے دل کے ساتھ ڈاک بنگلے کی طرف رواں دواں تھا۔ وہ کون تھی؟ کیا جاہلی تھی؟ فائزہ گھر سے غائب تھی۔ خامی عجیب سی چوٹیں تھیں۔

وہ ایک دیران جگہ تھی۔ ڈاک بنگلہ شہر کے مضائق سے کافی ہٹ کر تھا۔ رات کو اس طرف شاید ش کوئی آتا ہو۔ اندھیر اور الو کی آواز۔ میں خاصا ہانک رہا تھا۔ ایک ریو الو بھی میرے ساتھ تھا۔

فائزہ کا انواء اور پھر ڈاک بنگلے میں ملنے کے لئے اصرار کرتا۔ ضرور کچھ ایسا تھا جو پراسرار تھا۔

پھر کچھ عجیب سا ہوا۔ ایک ہیولہ میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اس کی شکل واضح تھی نہ کوئی آواز۔ بس میرے وجود میں سنسنی سی تھی۔ وہ میرا دم تھا یا ج میں کوئی ہیولہ۔

میں بھوت چڑیل ٹائپ چیزوں پر یقین کرنے والا نہیں تھا۔ لیکن بہت مضبوط ہونے کے باوجود آج خوف میری رگوں میں سرایت کر گیا۔

میں اپنی مخصوص رفتار سے ڈاک بنگلے کی جانب رواں دواں تھا۔ لیکن پھر میرے لائٹ بوٹ میرا ساتھ دینے سے انکار کرنے لگے۔ میرے پاؤں میں چیونٹیاں سی چلنے لگیں، پاؤں منوں بھاری ہونے لگے۔ جسم پسینہ پسینہ ہو گیا اور سانس دھرا ہونے لگا۔ ایک خوفناک ہیولہ میرے جسم کے اوپر گول واڑے میں گھونٹنے لگا۔ وہ خوفناک جسم کا ہیولہ میرے حواس پر چھانے لگا۔ قریب تھا کہ میں بے ہوش ہو جاتا لیکن پھر میرے دل میں ایمانی طاقت ابھرے گی۔ ایک نورانی سوچ ایک لمحہ کے لئے میرے دل میں اٹھی۔ اسم الہی کا دور و موثر ثابت ہوا۔ ہیولہ جس طرح ظاہر ہوا تھا ویسے ہی غائب ہو گیا۔

اچانک سیل فون کی گھنٹی پر انجینی نمبر ڈسپلے تھا۔ اس وقت میں ڈاک بنگلے کے باہر موجود تھا۔ ہو کا عالم اور ہر طرف خاموشی کا راج، تنہا آدمی اور ہیولہ جیسی خطرناک جسم کی مخلوق سے واسطہ پڑنے کے بعد میری حالت کافی پریشان تھی۔ لیکن میری محبت فائزہ ڈاک بنگلے کے اندر موجود تھی۔ اور میرے لئے یہ بات خامی تشویشناک تھی۔ مجھے جلد از جلد فائزہ کو مس شہلا کے چنگل سے چھڑانا تھا۔ مس شہلا کون تھی؟ کیا جاہلی تھی؟ اس بارے میں میری معلومات صفر ہی تھیں۔

میں نے فون اٹینڈ کیا۔

”ہیلو۔“ ایک مزنم میٹھی وکس آواز۔

جس کے لئے بہاروں جیسی اور سر میں کوئل کی آواز۔

میں اس کی آواز میں ڈوب سا گیا۔ ایک حسن تھا اس شیریں آواز میں..... مس شہلا کی آواز میں جادو تھا۔ اس کی آواز میرے اندر کے خوف کو آہستہ آہستہ مندل کرنے لگی۔ کیا تاؤں اس سر ملی آواز کے بارے میں..... وہ تو بس دائرہ تعریف سے باہر تھی.....

”ہیلو..... مس شہلا..... میں ڈاک بنگلے کے باہر موجود ہوں.....“ میں نے کہا.....

”اندرا جاتیے.....!“ میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں.....! وہ انداز دلربائی سے بولی۔

”جی اچھا.....!“ میں نے فون جاری رکھنا چاہا لیکن ڈسکنٹ ہو گیا.....

وہ ایک وسیع و عریض ہال کرا تھا۔ جس میں اندھیروں کا راج تھا۔ صرف ایک زبرد بلب اپنی محدود روشنی کے ساتھ میرے سر کے عین اوپر موجود تھا..... میں نے جو بھی ڈاک بنگلے میں داخل ہوا۔ وہی خوفناک ہولہ ایک بار پھر ظاہر ہوا۔ اب کی بار وہ خاصا خوفناک تھا۔ اس کی چار جہانہ انداز میں میری طرف پیش قدمی میری بے ہوشی کا سبب بنی۔

جب جتنوں سا میرے ذہن میں ابھرا تو میں نے اپنے آپ کو ای ڈاک بنگلے کے ہال میں موجود پایا۔ اتنا تو مجھے یقین رہا تھا کہ یہ ڈاک بنگلہ ہی ہے کیونکہ زبرد بلب کی روشنی میں، میں نے اندازہ کیا تھا کہ میں ڈاک بنگلے میں ہی موجود تھا.....

وہ لمحہ بہت ہی خوفناک تھا جب ایک چھتا کے دار آواز کانوں سے گزرائی۔ ہال کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ میں دھل گیا تھا۔ چاروں طرف ناقابل فراموش خوف پھیل گیا تھا۔

ہال روم کی تمام لائٹس آف ہو گئی تھیں۔ وہ ایک عام سا کمر..... چند ایک کرسیوں سے مزین..... میں بھی ایک کرسی پر موجود تھا لیکن لمبے لمبے سے قاصر..... حیرت انگیز بات یہ کہ میں بندھا ہوا نہ تھا لیکن کسی غیر مرئی طاقت نے مجھے اپنے شکنے میں جکڑ رکھا تھا۔ میں صرف بات کر سکتا تھا۔ وہ بھی لائن آن ہونے کے بعد..... ورنہ

ایک لمحہ کو تو مجھے اپنی زبان پر بھی دسترس نہ تھی.....! وہ خوب صورت ترین تھی۔ کالی گھٹا جیسی لم زلفوں اور سر زرد آنکھوں کی مالکہ وہ عورت دلکش اور حسین تھی۔

بلیک سوٹ میں ملیں وہ دلکش نقوش والی موج قیامت تھی۔ میں اپنے حواس کو بیٹھا تھا۔ دنیا میں ایسی حسن شاید ہی میں نے بھی دیکھا ہو.....

”کیسے ہو فرحان.....؟“ وہ بے تکلف سی ہوا بولی۔

میں اس کی آواز کے سحر میں ایک بار پھر ڈوب سا گیا..... کوئل کی سندری آواز..... کیا جادو تھا۔ میرا رگوں کے خون میں دوڑتی آواز.....

”ٹھیک.....! تم شہلا ہو.....؟“ میں بولنے لگا

”ٹھیک پہچانا.....!“

”تم فائزہ کو چھوڑ دو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا.....!“

”جان.....! اتنا غصہ کیوں کرتے ہو۔ فائزہ چھوڑ دوں گی لیکن پہلے ایک معاہدہ کرنا ہوگا۔“

”اگر تم مجھ سے شادی کی حامی بھرو.....!“

”Never..... یہ ناممکن ہے۔ تم خوب صورت ہو۔ دلکش ہو..... خوب صورت آواز کی حامل ہو۔ لیکن میری پہلی اور آخری محبت فائزہ ہی ہے۔“

”خاک محبت کرتے ہو فائزہ سے؟ ایک غریب لڑکی کی عزت تار تار کرنے کو محبت کا نام نہیں بلکہ ہوتے کہتے ہیں۔ تم نے اس کے ساتھ کس طرح کے سلوک کئے۔ اسے تم محبت نہیں نفرت کا نام دے سکتے ہو.....!“

”اس میں اس کی مرضی شامل تھی..... اور پھر ہمارا پرسنل معاملہ ہے۔ ہمیں ان معاملات میں ہونے کی ضرورت نہیں اور براے کریم فائزہ کو اپنے چنگل سے آزادی دے دو.....!“ میں برس پڑا۔

”او..... لیکن تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہوگی۔ ہر حال میں بس.....!“

”لیکن..... تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ اور خاص طور پر مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتی ہو؟“ میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”سنو پھر!..... میں شہنشاہ جنات کی اکلوتی بیٹی شہلا ہوں۔ جنات میں متفرق خوبی کی طرح میں بھی روپ بدل کر اپنی زندگی گزار سکتی ہوں۔ ہر قسم کا روپ بدلنا میری خاصیت ہے.....

دوسری بات یہ کہ تم مسلمان ہو..... اور مسلمان کو تنگ کرنا ہمارا طریقہ نہیں۔ لیکن اگر تم میں سے کوئی شخص نہیں تنگ کرے تب ہم اسے نہیں چھوڑتے.....!

تمہارا فائزہ کے ساتھ کاربش ہے.....؟ یہ میں سب جانتی ہوں۔ وہ دہرہ خاصی کڑی اور دردناک تھی جب تم نے فائزہ کی عزت تار تار کی تھی۔ وہ سب میرے سامنے ہوا تھا۔ کیونکہ اس جگہ پر ہمارا خاص بسیرا تھا..... ہم سب جنات عورتیں ایک دوسرے سے منہ چپا رہی تھیں..... وہ ایک شرمناک عمل تھا۔ میں چاہتی تو فائزہ کو تمہارے چنگل سے آزاد کر دیتی لیکن میں شہنشاہ جنات کے حکم کے آگے بے بس تھی.....!

آگے سنو..... تم اس وقت تک میرے منتر سے آزاد نہ رہو جب تک تم بے قصور اور معصوم نہ رہو۔ لیکن فائزہ سے اس قسم کے تعلقات کے بعد مجھے درمیان میں آنا پڑا.....!

راج تاؤں..... تو میں دلی طور پر تم سے محبت کرتی ہوں۔ فائزہ میری رقیب تھی..... اسے راستے سے ہٹانا میرا مقصد تھا اور تمہیں اپنا بنانا میری زندگی کا مقصد.....!

شہنشاہ جنات کی بیٹی ہونے کے ناطے مجھے اختیارات حاصل تھے کہ میں ایک انسان سے محبت کر سکتی ہوں۔

تم میری محبت ہو..... اگر تم مجھ سے شادی کرنے پر راضی ہو گئے تو فائزہ تمہارے حوالے درندہ شکار بنے ہوش رہے گی۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے

ہوش میں نہیں لاسکتی اور میں ہر جگہ موت بن کر تمہارے سر پر منڈلاتی رہوں گی۔ تمہارے ہر کام میں رکاوٹیں پڑیں گی.....!“

وہ بولتی رہی اور میں لرزتا رہا۔ دل چاہتا تھا اس جفٹی کو جان سے مار دوں..... لیکن میں بے بس تھا..... مجبور تھا۔

میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ کیونکہ اگر میں اس سے شادی نہ کرتا تو فائزہ ساری زندگی بے ہوش ہی رہتی.....!

انجینئر صاحب.....! وہ بہت ظالم نکلی..... اس نے میرے تمام پروجیکٹ ناکام کر ڈالے۔ اس وقت کی تمام ہائی کوالیفائیڈ برنس مارکیٹس میں میرا نام تھا۔

فرحان شاہ سافٹ ویئر کی تمام نیو پروڈکشن اپنے عروج پر تھی۔ بہت سے جدید سافٹ ویئر دنیا میں میرے ذریعے لاؤنچ ہوئے۔ مگر پھر شہلا درمیان میں آ چکی..... وہ میری کامیابی میں رکاوٹ بن گئی.....!

ہیلو اینڈریگنیو کی سافٹ ویئر تیاری کے دوران شہلا آ چکی..... فائزہ میرے دماغ سے نکل گئی تھی نہ جانے ایسا کیا جادو ہوا تھا کہ میں فائزہ کو بھول کر اپنی جدید پروڈکشن کی طرف لوٹ آیا تھا۔ ڈاک بنگلے میں ملاقات کے بعد شہلا پہلی بار میرے روم میں آدھمکی تھی۔

کمپیوٹر لیکچورج میں ماسٹرز اور جدید ترین آٹو فیشن کے باوجود میرا سسٹم جام ہو گیا..... میں ٹائپ کرتا لیکن ٹائپنگ کے دوران شہلا کی تصویر ڈپلے ہوئی..... میں چند منٹ تک ایسا کرتا رہا۔ لیکن شہلا نے میرا چھانہ چھوڑا.....!

وہ LCD سے بول پڑتی.....!

”فرحان شاہ..... مان جاؤ..... میں تمہیں دنیا کی ہر سہولت فراہم کروں گی۔ میری محبت کے آگے سر جھکا دو.....! اگر تم میری محبت نہ ہوتے تو زمین کے کپڑے کمزوروں کی خوراک بن چکے ہوتے.....!“

ایپیکر سے اس کی آواز خوفناک لیکن کوئی آتی.....!

”تم مجھے غلط قدم اٹھانے پر مجبور نہ کرو۔ تم جنت سے ہو اور میں انسان..... انسان اور جنت کا ہنسی میں کہیں بھی ملاپ نہیں ہوا..... اور تم ایسا ہو گا.....!“

”لیکن میں روپ بدل سکتی ہوں۔ میں ایک مکمل انسان بن کر تمہارے ساتھ زندگی بتاؤں گی.....!“

”ایسا ناممکن ہے.....! تم چاہے جو کچھ بھی کرو.....!“ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

پھر وہ غائب ہو گئی۔ لیکن پھر میرے تیار کردہ ہر سافٹ ویئر کی تیاری کے دوران فائزہ کی صورت ابھرنے لگی.....! وہ واقعی فائزہ ہی تھی..... جس کی تصویر سافٹ ویئر میں نظر آئی.....!

فائزہ کی تصویر نے میرا برنس چوٹ کر دیا..... میں جس کمپنی کا سافٹ ویئر تیار کرنے لگا تھا۔ فائزہ کی تصویر ہر ملک میں شامل ہو جاتی..... اور میں ہر ملک پر کڑھ جاتا.....

ان دنوں والد صاحب کو فاج ہو ا اور کمپنی کی ہر ذمہ داری میرے اوپر آن پڑی..... یہ ہماری کمپنی کا زوال کا وقت تھا۔ شہلا نے ہمارے مزدوروں کو ہراساں کرنا شروع کر دیا..... بواکر میں آگ لگنے کی خبر بھی شائع ہوئی.....!

ہمارے مزدور دن کی روشنی میں پریشان کئے جاتے۔ ایک مستقل ہیولہ فیکٹری میں دیکھا گیا.....! انہی دنوں ہمارے شیجر کی Death ہوئی..... ان کی لاش کی بدبو پوری فیکٹری میں پھیل گئی۔ پھر یکے بعد دیگرے بہت سی اموات ہوئیں لیکن ابابا کی قلعی علم نہ ہوا..... میں نے لو اٹھیں کو خاموش کر دیا تھا.....

لیکن ہیولہ مستقل پریشان کرتا رہا..... لوگ مرتے رہے..... اس زمانے میں اس تھانے کے انچارج حیرت خان تھے۔ انہوں نے معاملات سدھارنے کی حتی الوسع کوشش کی لیکن کچھ بھی بہتر نہ ہوا.....

حالات سنگین ہوتے گئے۔ میرا برنس برباد ہو گیا۔ ہر طرف سے لوگ طعنے کسے لگے۔ امریکن یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ سافٹ ویئر انجینئر اگر اپنے پیسے

میں ناکام ہو جائے تو معاشرہ جیسے ہی کہاں دن ہے؟.....

اور اب اپنے برنس کے ساتھ ساتھ ابابا کی برنس ڈوبتے دیکھا تو دل خون کے آنسو رو دیا..... میں ہر روز اپنے کسی کو لیک کی موت کا منتنا تو دل پھٹ سا جاتا.....

اور پھر ایک دن کمپنیز آرڈریٹس کی شق نمبر 15 کے تحت ایک کوٹھنیا کمپنی انجام کو پہنچ گئی.....

والد صاحب کی وفات نے مجھے پاگل کر دیا۔ میرا ان کے سوا کوئی نہ تھا۔ فائزہ بھی بدستور لاپتہ تھی۔ میری زندگی میں شہلا کی آمد منحوس تھی۔ شہلا اگر میری زندگی میں نہ آئی تو یہ بڑی کا تراشہ نہ دیکھا جاتا.....

پھر میں جانب کی غرض سے لٹکا تو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا.....!

سافٹ ویئر اور فینجک پروجیکٹ میں ماسٹرز ڈگری کے باوجود میں سرکوں پر بھیک مانگتا رہا۔

بھی مجھے اللہ یاد آیا..... میں اس دن بہت غمگین تھا جب میری ملاقات سید چراغ علی شاہ صاحب سے ہوئی.....!

”بیٹا.....! دنیا میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ اگر اندھیرا نہ ہو تو روشنی کیسے ہوگی؟ گناہ کی لذت نہ ہو تو لوگ اچھے اور برے میں فرق کس طرح کریں گے؟ اچھائی اور برائی تو فرق کے لئے لازمی ہیں۔ تمہارے حالات بہت دردناک ہیں۔ لیکن اگر صبر اور امید سے منزل کی جانب قدم بڑھاؤ تو حصول مقصد آسان رہتا ہے۔“

ان کی شفقت بھری باتوں میں روشنی اور امید کی اک دیار روشن تھا.....!

”شاہ صاحب.....! میں نے آج تک بہت گناہ کئے..... جن پر بہت شرمندہ ہوں..... توبہ کا دروازہ موت سے پہلے تک کھلا رہتا ہے..... میں آج سے خدا کے حضور گڑگڑ کر معافی مانگتا ہوں.....“

واقعی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے رورہا تھا۔

میں بہت دیر تک روتا رہا..... جب میں رورہا

تھک چکا تو انہوں نے میرے لئے کھانا منگوایا.....! اچھی طرح غسل کے بعد نماز ادا کی تو دل ایک روحانی خوشی سے جھوم اٹھا.....

پھر فائزہ کا ذکر چھڑا.....!

”فائزہ اسی دنیا میں موجود ہے لیکن شہلا کی ضد کی وجہ سے بے ہوش پڑی ہے۔ ڈاک ہنگامہ میں فائزہ کا کوئی وجود نہ تھا۔“

میں اسے ہر جگہ تلاش کرتا رہا لیکن اس کا کہیں وجود نہ ملا.....

فائزہ کہاں تھی؟ اس کا جواب فرحان شاہ نے کچھ یوں دیا..... ”فائزہ.....! بابا چراغ علی شاہ کے مطابق فائزہ زندہ تھی اور اس کا بے ہوش وجود ایک کتب میں موجود ہے۔ وہ پچھلے پانچ سال سے بغیر کچھ کھائے پئے زندہ سلامت تھی۔ لیکن شہلا کی حفاظتی تدابیر انسانی حیات کو تکلیف کے لئے کافی تھی۔“

شاہ صاحب کے مطابق اگر فرحان اپنی دونوں آنکھیں اس کتب میں موجود سانپ کے حوالے کر دے۔ تو فائزہ خود بخود ہوش میں آ جائے گی۔“

”لیکن..... میرا ایمان ان دقیقہ نوسی باتوں پر قطعی نہیں.....! میرے خیال میں قرآنی آیات اور اسم الہی ہی جنت کو قابو میں لانے کا واحد ذریعہ ہے۔“ میں بولا.....

”فرحان.....! یہ کیسے میری سمجھ سے کافی دور ہے۔ تم جس قسم کے حالات و واقعات بتا رہے ہو وہ کوئی بھی ذی شعور شخص قبول نہ کرے گا.....! ایکو اٹھیا کمپنی کا وجود بھی تھا اور نہ ہے۔ پانچ سال پرانے لوگ دوبارہ کیسے زندہ ہو گئے؟“

”میں اس بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ جہاں تک تعلق ہے ہماری کمپنی کا تو وہ آج سے پانچ سال پہلے ڈوب گئی تھی۔ تمام شیئرز ہولڈرز کی پے منٹ مکمل ہوئی تھی۔ بینک کا قرض سود سمیت لوٹا دیا گیا تھا۔“

آپ بے شک ریکارڈ چیک کر لیں.....!“

یقین سے بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں

اعتماد اور سچ تھا۔ اس کی باتوں میں جھول ضرور تھا لیکن حالات و واقعات کے تناظر میں صرف ایسا ہی ممکن تھا۔

”کیا آپ کا شہلا سے کوئی رابطہ ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں..... جب سے میں چراغ علی شاہ کے زیر سایہ آیا ہوں تب سے شہلا غائب ہے۔“

”اور جس کتب میں فائزہ بے ہوش ہے وہ کتوں کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کے بارے میں صرف شاہ صاحب ہی جانتے ہیں۔ میری استدعا ہے کہ آپ میرا ساتھ دیں تاکہ بہت جلد اس کیس کو انجام تک پہنچایا جائے.....!“ وہ بولا

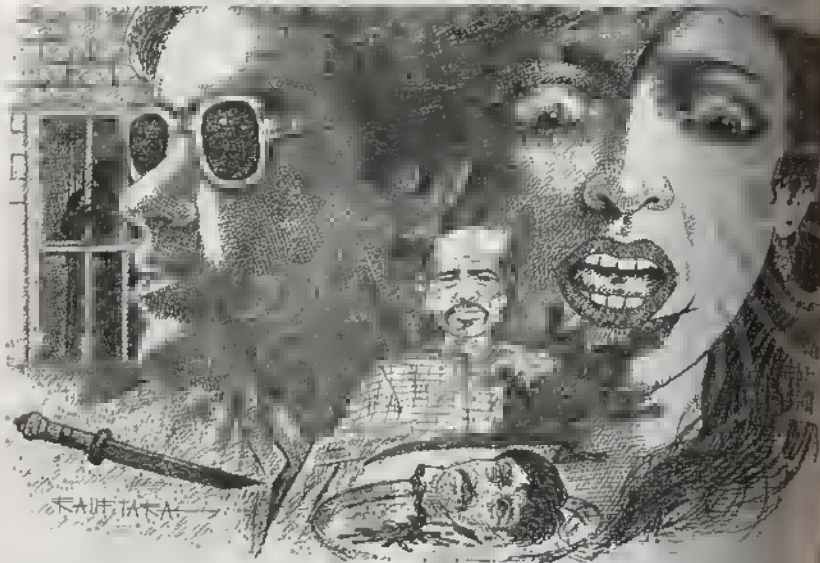
دوسرے دن ہم شاہ صاحب کے آستانے پر پہنچ گئے۔ مریدین کا وسیع حلقہ اس برگد کے وسیع و عریض درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں موجود تھا۔ لوگ عقیدت مندوں کی طرح آتے۔ روحانی و جسمانی مسائل بتاتے۔ کلام الہی کے چند وظائف عطا کرنے کے بعد شاہ صاحب نے ہماری طرف گویا نظر کی۔

”کامران صاحب.....! اللہ آپ کو ترقی عطا کرے۔ اس ملک کو آپ جیسے نوجوان لوگوں کی ضرورت ہے۔ آپ کی پراگرس جاندار ہے۔“ وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔

ان کو کسی جگہ میں نے دیکھا تھا۔ ذہن پر زور دینے کے بعد یاد آیا۔ ان کو ایکو اٹھیا کمپنی کی ڈسمنٹ میں دیکھا تھا۔ جب انہوں نے مجھے ملنے کی ہدایت اور ایک عمدہ نصیحت بھی کی تھی.....!

”جی شاہ صاحب! جب تک آپ جیسے اللہ انوں کی دعائیں ساتھ ہیں۔ اس وقت تک ہماری ذمہ داریاں بھی عروج پر ہیں گی۔“ میں نے سعادت مندی سے کہا۔

”بیٹا.....! روحانی معاملات کا توڑ صرف کلام الہی میں موجود ہے..... فرحان شاہ کا کیس خاصا پیچیدہ ہے۔ لیکن حل طلب بھی.....!“



خونی عمل

ایس حبیب خان - کراچی

اچانک چلتی مشین سے کیمیکل باہر کو اچھلا اور قریب کھڑے نوجوان کو بری طرح جھلسادیا، سارے لوگ حیران تھے کہ یہ ہوا تو آخر ہوا کیسے! کسی کی عقل کلام نہیں کر رہی تھی مگر جب ایک اللہ والے نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو.....

کیا یہ حقیقت ہے کہ جادو سچہ کر لیا ہے۔ اس حقیقت سے پردہ اٹھائی ایک انہونی کہانی

”وہ بس ذرا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

گہمت نے بات بتائی۔

زمین نے ہنسیا کو کپڑے سے پکڑ کر سائیڈ میں

رکھ دیا۔ ”بھابھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو آپ

آرام کر لیں میں دیکھ لیتی ہوں کچن کا کام۔“

”نہیں میں کر لوں گی۔“ گہمت نے کہا تو زمین

کچن سے چلی گئی۔ گہمت دوبارہ نیا سا لٹن چڑھانے لگی۔

ہندیا کو بھول کر گہمت کی سوچ میں گم تھی اور

بھابھی سے دھواں نکل کر کچن میں بھر رہا تھا۔ ”بھابھی!

زمین کے دوبارہ آوازیں دینے پر بھی گہمت کے

موت کوئی اثر نہ ہوا۔ زمین نے کھانے ہوئے چولہا بند کیا اور

گہمت کو بلا کر کہا۔ ”بھابھی سالن چل گیا! آپ کہاں گم

ہیں؟“ گہمت نے چونک کر ہندیا کو دیکھا جو کالی ہو چکی تھی

سینے کی جگہ پر بھونپ رہی تھی۔

میں اس میں شریک رہا۔ شہر کے مہنگے ترین ہوٹل کے بجائے یہ عام سی تقریب تھی۔ دو گواہ اور دو لہجہ دار.....

گواہان میں میرا نام بھی شامل تھا.....!

لیکن پھر کچھ عرصہ بعد..... میرے ایک عزیز کا

جنازہ اٹھا۔ میت کو آخری آرام گاہ کے لئے قبرستان

لے جایا گیا۔ واپسی پر میری نظر ایک قبر کے کتبے پر

پڑی..... فرحان علی شاہ ولد رحم علی شاہ..... سن وفات

اکتوبر 1997ء.....!

میں غور سے اس کتبے کو دیکھتا رہا۔ حیرت کے

اتھاہ سمندر میں ڈوبتا میرا دماغ..... جسم میں روکنے

کھڑے ہو گئے.....

ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند آ گیا۔

”ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی دوسرا شخص ہو۔ فرحان علی شاہ دنیا

میں بہت سے ہو سکتے ہیں.....“

وہ دل شکستہ آواز تھی۔ کرب میں ڈوبی ایک

دلخراش آواز..... محبت اور رنج دالم میں ڈوبی فائزہ کی

آواز زندگی ہوئی تھی.....

”ایکسپلر صاحب! ہم سب کا تعلق عالم جنات

سے تھا.....! آپ کے ساتھ کچھ کردار انسانی اور کچھ

جناتی رہے۔ فرحان علی شاہ کی موت 1997ء میں

ہوئی تھی..... میں بد نصیب اس کی محبوبہ..... آج بھی

اس کے انتظار میں سرگرداں ہوں.....!

کیس اختتام کو پہنچا..... اپنی نوعیت کا انوکھا

کیس مگر میرے اندر ایک زبردست قسم کا خوف چھوڑ

گیا.....!

میں جنات کے ساتھ رہا اور محسوس تک نہ

ہوا.....! قدر و ان کہتے ہیں کہ یہ تو کوری چھوڑ کر کوئی

اچھا سا کاروبار کر لوں..... لیکن یقین جانیے.....

آگے آنے والے کمزور..... مزید حیران کن اور دلچسپ

رہے کہ عقل حیران اور زندگی میں ان چیزوں کی

عادت سی ہو گئی۔

فائزہ اس وقت بھی زندہ سلامت ہے۔ اس کی بے ہوشی کا عرصہ پانچ سال پر محیط ہے۔ لیکن ایک کڑی شرط بھی ہے۔ وہ نہ فرحان علی فائزہ کو حاصل نہ کر سکے گا۔

”وہ بڑی محبت اور مشقت بھرے انداز میں بولے۔

”لیکن شاہ صاحب! آنکھوں کو خفاقتی حصار کی

جانب کسی زہریلے سانپ کو دے دینا۔ ایک ظلم ہے۔“

میں بولا.....!

”لیکن اس کے بٹا کوئی دوسرا حل نہیں۔“ وہ

بولے.....

”کیا فرحان راضی ہے؟“ میں نے پوچھا.....

”میں راضی ہوں..... اگر میری وجہ سے کسی کی

زندگی نصیب ہوتی ہے تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی.....“

”لیکن.....“ میں نے پوچھا.....

☆.....☆.....☆

یہ اس انوکھی کہانی کا ٹریک پوائنٹ تھا۔ فائزہ

واقعی کنوئیں میں بے ہوش پڑی لیکن شاہ صاحب نے

چند مخصوص عمل کے ذریعے شہلا کو قید کر دیا تھا۔ شہلا کی

قید کے بعد باقی مسائل خود بخود حل ہو گئے تھے۔

اتفاق سے فرحان کی آنکھیں بھی ضائع ہونے

سے بچ گئیں۔ وہ شاہ صاحب کی کڑی محنت تھی کہ شہلا

جیسی بد ذات پولس میں قید ہو گئی.....!

فائزہ کو بہت زیادہ محنت کے بعد باہر نکالا گیا

تھا۔ وہ زندہ تھی۔ لیکن سوکھ کر کاٹا۔ فائزہ کی خوب صورتی

ماند پڑ گئی تھی.....

چند قرآنی آیات کے ورد اور پانی کے چھینٹوں

سے فائزہ آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگی..... نقاہت

اور کمزوری کی وجہ سے وہ بول نہ سکی..... البتہ پانچ سال

بعد بھی وہ فرحان کو پہچان گئی تھی دونوں کالی ورت تک ایک

دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اسی دوران شاہ صاحب کہیں

غائب ہو گئے تھے..... کہانی انجام کو پہنچ چکی تھی..... دو

محبت کرنے والے ایک دوسرے کو مل گئے تھے.....!

لیکن ٹھہریے.....!

ایک سینکڑ.....! پھر ان دونوں نے شادی کی اور

گہمت کی شادی کو پانچ سال ہو چکے تھے اس کا اس دنیا میں ماں کے علاوہ کوئی نہ تھا وہ اپنی ماں کی اکلوتی اولاد تھی۔ سسرال میں سسرکا انتقال ہو چکا تھا۔ ساس اور شوہر کے علاوہ دیور، دیورانی اور سب سے چھوٹی تند زمین تھی۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ انگلینڈ میں رہتی تھی اور سال میں دو مہینے کیلئے اپنے میکے آتی تھی۔

گہمت اور اس کی ماں جیلہ انتہائی گندی فطرت کی عورت تھیں۔ جھوٹ کی تو دونوں ماں بیٹی جیتی جانتی تصویر تھیں۔ حسد، کینا، بغض، لالچ غرض ایسی کوئی برائی تھی جو ماں بیٹی میں نہ تھی۔

جیلہ کے شوہر کا اس کے باپ کی زمین میں جو حصہ بنا تھا وہ جیلہ کے سسرال والے ہر ماہ ایمانداری سے بھیج دیتے تھے باقی جیلہ محلے کے کپڑے ہی کر گزارہ کر لیتی۔ محلے کی ایک عورت نے ایک بہت امیر خاتون کے کپڑے جیلہ کو سینے کیلئے لا کر دیئے تو جیلہ نے اس سے ان کے بارے میں کر لیتا شروع کر دیا اور پھر مظلومیت اور بے چارگی کا اعلیٰ نقشہ کھینچ کر اس خاتون کو اپنے جال میں پھاس لیا۔ دراصل گہمت اور اس کی ماں کی آنکھیں ان لوگوں کی حیثیت دیکھ کر پھٹ گئی تھیں۔ اس خاتون نے جیلہ کو بے سہارا غریب بیوہ دیکھ کر بغیر چھان بین کئے گہمت کی شادی اپنے بڑے بیٹے سے ملے کر دی۔

وہ لوگ امیر ہونے کے ساتھ ساتھ شریف اور نیک بھی تھے۔ اتنا سب اچھا ہونے کے باوجود بھی دونوں ماں بیٹی کو شرافت، سکون و چین کی زندگی اس نہ آئی۔ وہ کہتے ہیں ناں انسان اپنی اصل سے کیسے پیچھے ہٹ سکتا ہے گہمت اور اس کی ماں کو ان کے ساتھ کی گئی نیکی ہضم نہ ہوئی۔

سب سے پہلے سسرال پہنچے ہی گہمت نے آہستہ آہستہ اپنے شوہر کے پیسے اپنی ماں کو پہنچانے شروع کر دیئے۔ سسرال کی معمولی بات وہ اپنی ماں کے کان میں ڈالتی۔ اپنے سسرال کی کمزوریاں، ساس کی برائیاں اور شوہر کی باتیں ماں کو پہنچاتا گہمت کا اولین

فرض تھا جو وہ بخوبی ادا کر رہی تھی۔ اس نے شرافت کے لبادے میں رہتے ہوئے اپنی دیورانی کو ہر جگہ ڈھک کر دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی دیورانی صبا کے سر سے کئے ہوئے کام کا خاموشی سے بگاڑ دیتی اور باقی صبا کو سختی بڑھتی اور خود صبا کے پاس جا کر اس کی دلجوئی کرنے کے بہانے اسے ساس کے خلاف بھڑکانی اور منافقت سے گھر کے اندر گھناؤنا کھیل کھیل رہی تھی۔ جھوٹ کی تو وہ دیوی تھی، شوہر کے کہنے کے باوجود وہ کو وہ اپنی ماں سے باتوں کے چکر میں لاپرواہی سے اڑا دیتی اور کامیابی سے جھوٹ بول کر بات بنادیتی۔ جھوٹ وہ اتنی کامیابی سے بولتی کے شوہر بے چارہ اس کا یقین کر لیتا کیونکہ وہ بالکل صاف ستھرا، شریف اور بولنے والا تھا۔ اس کے وہم و گمان تک میں نہیں تھا کہ گہمت کس قدر جھوٹی اور مکار عورت ہے۔

گہمت کی ماں اسے مسلسل پٹیاں بڑھاتی کہ سب کا پتہ صاف کر کے ہر چیز پر اپنا قبضہ جماؤ مگر اس سے بھی پہلے تجھے اپنے قدم مضبوط کرنے ہونگے اور وہ ہوتے ”اولاد“ سے اور بھی دونوں کی سب سے بڑی پریشانی تھی کیونکہ پانچ سال گزر جانے کے باوجود بھی گہمت کی کوئی اولاد نہ تھی۔ گہمت اور اس کی ماں کو یہ دھڑکائی لگا رہتا تھا کہ انہیں اولاد کے لئے اس کا شوہر دوسری شادی نہ کر لے۔ گہمت اپنی غلیظ حرکتوں میں لگی رہی اور دوسری طرف اس نے اس کی دیورانی صبا کو ایک بیٹے سے نوازا دیا۔

اب تو صبا کو نئے کی طرح گہمت کی آنکھوں میں کلکے لگی۔ گہمت اور اس کی ماں نے سوچا چھوٹے موٹے ہتھکنڈوں سے کچھ نہ ہوگا کوئی بڑا دھماکہ کرنا پڑے گا اور پھر دونوں بے شرع عورتوں نے انتہائی غلیظ حرکت کا فیصلہ کیا۔ ایک شام جب گہمت کا شوہر خالد گھر واپس آیا گہمت گھر پر نہ تھی۔ اس نے گھر میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ اپنی ماں کے گھر گئی ہے۔ خالد نے خاص توجہ نہ دی کیونکہ ہفتے کے سات دنوں میں سے پانچ دن تو گہمت اپنی ماں سے ملنے جاتی اور باقی کسرفوں پر نکال لیتی۔ یہ تھوڑی دیر بعد خالد کے پاس گہمت کا فون آیا وہ اسے

آجائے۔ خالد اسے لینے چلا گیا۔ جب وہ اندر گیا تو اس نے دیکھا گہمت صحن میں تخت پر بیٹھی رو رہی تھی۔ ”کیا ہوا گہمت؟“ خالد نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ ”نہیں وہ بس ایسے ہی“ گہمت نے مکاری سے ہنسوا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا ایسے ہی؟ تم رو کیوں رہی ہو، کوئی وجہ بھی تو ہوگی؟“ خالد نے تنجیدگی سے کہا۔

”میں بتاتی ہوں“ جیلہ نے کہا اور بولی: ”دیکھو بیٹا! ہم غریب ہیں مگر عزت دار ہیں، میری بیٹی کی عزت اس گھر میں محفوظ رکھیں۔ تمہارے بھائی خالد نے میری بیٹی کو“۔ ”بس چپ ہو جائیے!“ خالد یکدم غصے سے اٹھ کر کمرہ ہو گیا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ماں رہنے دیں یہ میرا یقین نہیں کریں گے“۔ خالد وہاں سے آدھمی کی طرح باہر نکل گیا اور گہمت کو لئے بغیر گھر چلا گیا۔ اگلے روز گہمت کی ماں اسے لے کر خود اس کے سسرال پہنچ گئی اور اس نے کھرام برپا کر دیا۔ سب نے دونوں ماں بیٹی کی بات سن کر دانتوں سے انگلیاں دبا لیں۔

خالد انتہائی شریف اور مذہبی انسان تھا اس کی بیوی صبا بھی بہت اچھی عورت تھی اور وہ اپنے شوہر کو بخوبی جانتی تھی۔ وہ غصے سے کہہ رہی تھی۔ ”بھائی اللہ کا خوف کرو! اتنا جھوٹا اور انتہائی غلیظ الزام تم میرے بے گناہ شوہر پر لگا رہی ہو۔ تمہیں مگر اللہ کو کیا نہ نہیں دکھانا؟“ گہمت جواب دینے کے بجائے مظلومیت کی تصویر بنی اٹھاں ماں سے لگی آنسو بہائے جا رہی تھی۔ خالد کی ماں یعنی گہمت کی ساس نے صبا کو خاموشی سے لے لیا کہ خالد کو خالد کا مطلب کیا جو کہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ”خالد تمہیں کچھ کہنا ہے؟“

خالد نے سراسر اٹھا کر کہا: ”مجھے نہیں معلوم گہمت بھائی کی جھوٹ کیوں بول رہی ہیں، انہیں میں بہن کا درجہ دے رہا ہوں۔ میرے لئے زمین اور گہمت بھائی میں کوئی

فرق نہیں۔ چاہے کسی کو یقین آئے یا نہیں۔ میں اپنے اللہ کو اپنے ہر عمل کا جواب دہ ہوں میرا دل اور ضمیر دونوں مطمئن ہیں۔“ ”ہاں میں اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑتا ہوں۔“ خالد کے لہجے کی مضبوطی اس کے کردار کے بارے میں گواہی دے رہی تھی جس کو گہمت اور اس کی ماں سمیت سب نے محسوس کر لیا تھا۔

”ٹھیک ہے، مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے خالد! مگر میں نہیں جانتی کہ آگے جا کر کوئی مسئلہ بنے اس لئے اب تم اور صبا بچے نہیں رہو گے۔ جتنی جلدی ہو تم دونوں لوہری منزل پر شغف ہو جاؤ اور ہاں صبا تم اپنا کچن بھی الگ کرلو“ خالد کی ماں نے فیصلہ کر دیا اور سب وہاں سے چلے گئے۔

خالد خاموشی سے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ گہمت نے اپنی ماں کو رخصت کیا اور کمرے میں آ گئی۔ گہمت کے کمرے میں آتے ہی خالد نے جان بوجھ کر آنکھیں موند لیں۔ اس کا دل درد ہا تھا۔ خالد کو اپنے بھائی کے کردار پر ایک فیصد بھی شک نہ تھا مگر کیا گہمت جھوٹ بول رہی ہے؟ یہ سب سوچ سوچ کر خالد کا دماغ چمٹا جا رہا تھا۔ اگلے روز گہمت نے اپنی ماں کو فون کیا اور دونوں ماں بیٹی نے خوب اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ ”کم بخت بڑھیا بھی بہت جالاک ہے۔ بجائے خالد کو گھر سے نکالنے کے اسے اوپر بھیج کر اور خود مختار کر دیا“۔ جیلہ بولی ”اور صبا آرام سے اپنی مرضی سے رہے گی اور یہ منحوس بڑھیا ہر وقت میرے سر پر سوار رہے گی۔“

”چل کوئی بات نہیں، گھر میں دراڑ تو ڈال دی ناں ہم نے۔“ جیلہ بولی۔ ”اچھا چھوڑو کل تجھے میرے ساتھ ایک جگہ چلنا ہے اور ہاں بونی رقم ضرور ساتھ رکھ لیتا۔“ جیلہ نے گہمت کو پٹی دی۔

پروگرام کے مطابق گہمت اپنی ماں کے گھر اگلے روز پہنچ گئی۔ جیلہ اور گہمت رکشے میں بیٹھ کر ایک سنان علاقے میں پہنچ گئیں۔ پھر ایک طرف رکشہ رکوا کر جیلہ آگے چلے گئی اور ایک گھر کے سامنے آ کر اس پر دستک دی۔ ”چلی آ!“ اندر سے آواز آئی تو دونوں دروازہ کھول

حال میں اسے پورا کرنا ہوگا یعنی سات ماہ تک سات بچوں کے خون سے غسل کرنا ہوگا۔ ورنہ اس کا اتنا بھائی تک انجام ہو سکتا ہے جو تو سوچ بھی نہیں سکتی اگر ہمت ہے تو شروع کرنا ورنہ ابھی بھی موقع ہے۔“ عامل نے تفصیل سے بتایا۔

گھٹت ہوئی۔ ”مجھے ہر حال میں اولاد چاہئے جو اس تمام جائیداد کی وارث ہوگی۔ اس کے لئے میں مشکل سے مشکل عمل بھی کر لوں گی مگر ہم بچے لائیں گے کہاں سے؟“

”اس کا بندوبست ہو جانے کا مگر اس کے الگ سے پیسے ہونگے۔ کبھی جسم بچل سکتا ہے یا پھر کبھی بچے کا خون، دونوں صورتوں میں تیرا کام ہو جائے گا۔“

جس پر دونوں ماں بیٹی جھٹ سے راضی ہو گئیں۔ گھٹت اپنے شوہر کی حق حلال کی کمائی کس ہے۔ وردی سے ناپاک کاموں میں اڑا رہی تھی اس کا اندازہ خالد کو بالکل نہ تھا، ہوتا بھی کیسے وہ بے چارہ تو خود اس کے حصار میں تھا۔

قبر میں تعویذ دبانے کے اگلے روز سے ہی گھٹت کی ساس کی حالت بگڑنے لگی۔ انہیں اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا گیا جہاں ایک روز انہوں نے دونوں بیٹوں کو بلا کر ان کے باپ کی وصیت انہیں تھما دی۔ ”بیٹا! یہ وصیت تمہارے باپ نے اپنی زندگی میں ہی کر دی تھی اور اس کے مطابق اب صرف تم دونوں ہی تمام جائیداد کے برابر برابر کے مالک ہو، اگر تمہاری بہن زینب زندہ.....“ اتنا کہہ کر وہ روئے لگیں۔ دونوں بیٹے ماں سے لپٹ گئے اور انہیں تسلی دینے لگے۔

گھٹت کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ ناگن کی طرح پھونکارنے لگی۔

”منہوں بڑھے تو نے میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ میں بھی ایسا ہونے نہیں دوں گی۔ تیری بیوی کی غذای میں کروں اور حصہ دوسروں کو ملے، نہیں ایک ڈھیلا نہیں دوں گی کسی کو، پوری جائیداد پر میرا اور میری ہونے والی اولاد کا حق ہے۔ جس طرح ایک کا پتہ کاٹا ہے ویسا

ہی دوسرے کے ساتھ ہوگا۔“

خالد اور حامد کے حصے میں ایک ایک فیکٹری آئی اور مکان میں دونوں اوپر نیچے رہ رہے تھے۔ گھٹت کی ساس کا اگلے روز ہی انتقال ہو گیا اور اس نے جس عورت نے اس موقع پر بھی صباہ اور حامد کو نیچے قدم نہ رکھنے دیا۔ دونوں نے باہر جا کر ماں کو آخری بار دیکھا گھر میں کیا ہو رہا تھا اس سے گھٹت کو کوئی فرق نہیں پڑا وہ اپنی ماں کے گھر جا کر اپنا اٹل اپنے وقت پر کر کے آئی۔

دوسرے دن حامد جیسے ہی اپنی فیکٹری پہنچا وہاں اسے لوگوں کا جھوم دکھا جو اس کی اپنی فیکٹری کے ہی لوگ تھے گاڑی سے اتر کر وہ فیکٹری کے گیٹ پر آیا تو وہاں اسے ”خون میں تھڑی بکرے کی سری رکھی ہوئی ملی، جس کا خون آس پاس پھیل چکا تھا۔“ یہ سب کیا ہے؟“ حامد نے سوال کیا۔

”سرم خور حیران ہیں، پتہ نہیں یہ کون لایا!“ ورکرز نے کہا۔

”اپنی دیز، جلدی سے صفائی کروادو“ اور حامد ہدایت دیتا ہوا اندر چلا گیا۔ خون اس کے جوتوں میں بھی لگ چکا تھا۔

ادھر گھر میں صباہ اپنے وصلے ہوئے کپڑے رکھ رہی تھی کہ اسے اپنی شلوار کے نیچے میں کچھ لال، لال سا لگا، اس نے غور سے دیکھا تو پھل گئی وہ گاڑھا گاڑھا خون تھا۔ صباہ نے شلوار دور پھینک دی، اس نے پھر دوسری شلوار اٹھائی وہ بھی ایسی تھی۔ صباہ پریشان ہو گئی۔ حامد جب گھر آیا تو اس نے صباہ کو پریشان دیکھا۔ صباہ نے اسے بتایا تو حامد نے اس کو بہلا یا ارے لگ گیا ہونا کچھ شاید بری گندی ہو؟“

”ہاں ہو سکتا ہے۔“ صباہ نے کہا اور کھانا لگنے لگی۔ اگلے روز حامد صبح آس جا رہا تھا تو صباہ نے کہا کہ ”راشد کو میں نے بیڑ پر کھڑا کیا تو وہ زور سے رونے لگا۔“ راشد صباہ کا تین سالہ بیٹا تھا۔

”اچھا تم اسے ڈاکٹر کاٹھ کو دکھا دینا، میں انہیں فون کروں گا۔“ اور چلا گیا۔

ڈاکٹر نے راشد کو چیک کیا وہ بالکل ٹھیک تھا وہ کمرہ ہونے میں اب بھی رو رہا تھا۔ راشد کو ڈاکٹر نے وہاں وہیں مگر اس کی ٹانگیں سوکھ کر اتنی پتلی ہو گئیں کہ وہ بیٹھ بھی نہ پاتا۔ صباہ اور حامد بہت پریشان تھے۔ کون سا ڈاکٹر تھا جسے انہوں نے نہ دکھایا ہو؟ فیکٹری میں حامد گھر کے پردے میں ہی سوچتا رہتا۔

انتساب کرنے پر بھی گھٹت کی بس نہ ہوئی۔

حامد اپنی فیکٹری میں کام کا معاوضہ کر رہا تھا کہ وہاں تک مشین میں ڈالا ہوا ٹیمپیکل ایک دھماکے سے باہر آ گیا اور آس پاس کی چیزوں میں آگ لگ گئی حامد کا پورا ہاتھ جل گیا۔ ٹیمپیکل اس پر بھی آیا تھا۔ تمام لوگوں کو فیکٹری سے باہر نکال دیا گیا۔ آگ تھی کہ پھیلتی ہوئی پوری فیکٹری میں پھیل گئی۔ فائر ریگڈ کی گاڑیاں آگ بجھانے لگیں۔ آگ پر تو قابو پایا گیا مگر حامد کا کروڑوں کا مال جل کر خاک ہو گیا۔ حامد کو تشویشناک حالت میں اسپتال لے جایا گیا، وہاں اس کا ایک ہاتھ کاٹ دیا گیا کیونکہ وہ بالکل ختم ہو گیا تھا ٹیمپیکل کے ٹکٹے سے۔

حامد گھر آ گیا وہ ابھی بستر پر تھا، بچہ الگ بیمار تھا، ابے میں صباہ نے بہت ہمت کا مظاہرہ کیا، حامد بالکل خالی ہاتھ ہو گیا تھا کچھ دنوں بعد حامد نے اپنے بھائی خالد سے کہا کہ ”وہ اسے اس کے حصے کے مکان کے پیسے دے دے وہ مکان خالی کر رہا ہے۔“

خالد نے خاموشی سے پیسے دے کر مکان حامد سے خرید لیا۔ اگر وہ گھٹت کے زیر اثر نہ ہوتا تو اپنا مناسب کچھ اپنے بھائی کو دے چکا ہوتا۔ صباہ اور حامد ایک چھوٹے سے مکان میں آ گئے۔ کچھ دنوں بعد حامد نے نیک میں ڈال دیئے تھے۔

صباہ کی ایک دوست نے اسے ایک عالم دین کا بعد دیکھا کہ وہ ان سے ضرور ملے۔ صباہ اپنے شوہر کے ساتھ اللہ کے اس نیک بندے کے پاس گئی۔ انہوں نے غور سے ان کی بات سنی اور دو روز بعد بلایا۔ انہوں نے پڑھائی کی اور ساری حقیقت معلوم کر لی۔ جب صباہ اور حامد دوبارہ ان کے پاس آئے تو انہوں نے بتایا کہ ”کوئی قریبی چہ جس نے تم لوگوں کو برباد کرنے کیلئے کندہ عمل کروایا

ہے ہم کاروبار سے ہاتھ دھو بیٹھو گے مہمت سے جاؤ گے اور آخر میں زندگی.....“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ مگر حضرت میری تو کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ جہاں تک بات ہے قریبی کی تو آپ مجھے اس کا نام تو بتائیں، میں اسے نہیں چھوڑوں گا، میرے منصوبہ بننے کے پاؤں بے کار کر دیئے، مجھے ایک ہاتھ سے معذور کر دیا اور میرے باپ کی اتنی محنت سے بنائی فیکٹری کو جلا کر رکھ دیا۔“ حامد نے غصے سے کہا۔

”کیونچا! جو ہو گیا اسے بھول جاؤ اور آگے بڑھو، میں تمہاری پریشانی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ختم کرنے کی کوشش کرتا ہوں، رہا سوال نام کا تو اللہ تعالیٰ اسے خود سمجھ لے گا۔“ حضرت نے کہا پھر انہوں نے حامد کی فیکٹری جا کر وہاں کاٹ کی اور اس جگہ کو پاک کر دیا اور قرآن خوانی کروائی، حامد کو انہوں نے پڑھا ہوا پانی پینے کیلئے دیا، حامد اور صباہ کو کئی دیناں کیلئے بتائیں اور نماز کی پابندی کی تاکید کی۔ پھر کچھ دنوں بعد حامد نے حضرت کے کہنے پر چنک میں رکھے پیسوں سے دوبارہ اپنا کام شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حامد کا ہاتھ پکڑا اور اس نے دوبارہ اپنی فیکٹری اسٹارٹ کر لی۔ وہ دن رات محنت کر رہا تھا اور اس کے کاروباری لوگوں نے بھی اس کا پھر پور ساتھ دیا۔

بات اڑتے اڑتے گھٹت تک بھی پہنچ گئی کہ حامد نے نیا بیگ اور گاڑی لی ہے۔ گھٹت میں انکارے دیکھنے لگے وہ حامل کے پاس گئی اور بولی۔ ”میں نے منہ مانگی رقم دی پھر بھی میرے دشمن عیش کر رہے ہیں کہاں گیا وہ عمل جو آپ نے انہیں تباہ کرنے کیلئے کیا تھا۔“

”عمل بالکل ٹھیک ہوا ہے کسی نے کاٹ کر دی ہے اس عمل کی۔“ عامل نے معلوم کر کے بتایا، ”خیر تو فکر نہ کر یہ مٹی لے اور اس جگہ نکھیر دے جہاں تیرے دشمن کے قدم پڑتے ہوں، اس بار نہیں بچے گا وہ تباہ ہونے سے۔“ عامل نے گھٹت اور حیلہ کو مٹی دیتے ہوئے کہا۔

دو تین روز تک گھٹت نے حامد کا روٹین معلوم کیا اور ایک بندے کو پیسے دے کر مٹی نکھیرنے کا کام ملے کر لیا۔ وہ آدمی مٹی لے کر حامد کے آنے کا انتظار کرنے لگا

مگر کہتے ہیں ناں جب اللہ تعالیٰ ڈھیل سی کھینچتا ہے تو پھر کوئی مہلت نہیں ملتی۔ ایسا وقت گھٹ کا بھی آگیا تھا اس نے اچھی صاف ستھری زندگی کے بجائے نگاہ کے راستے کا خود انتخاب کیا تھا۔ جب وہ آدی مٹی لے کر حامد کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

اس روز اتفاق سے خالد کی گاڑی خراب ہو گئی تھی وہ ٹیکسی لینے روڑ پر آیا تو حامد نے اپنی گاڑی اسے دیکھ کر روک لی اور باہر نکل کر جمائی سے گلے ملا اور اسے اپنی گاڑی لے جانے کا کہا۔ خالد نے مسکراتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے مگر تم بھی ساتھ بیٹھو میں تمہیں چھوڑ کر گاڑی لے جاؤں گا۔ بعد میں ڈرائیور دے جائے گا۔“ اور یوں خالد اپنے بھائی کی جگہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اوسر وہ آدی انتظار میں تھا جب حامد کی گاڑی دور سے آتی نظر آئی تو اس نے گاڑی پارک کرنے کی جگہ مٹی بکسیر دی حامد گاڑی پارک کرنا، گیٹ کھولنا اور مٹی پر سے گزر جانا مگر اس آدی کو کیا پتہ گاڑی خالد ڈرائیور کر رہا تھا خالد نے گاڑی پارک کی اور حامد کے کہنے پر ٹیکسری میں نیا کام دیکھنے کیلئے گاڑی سے اترا اور مٹی پر سے گزر رہا ہوا چلا گیا اور ٹیکسری کا کام دیکھنے کے بعد دوبارہ اسی مٹی پر قدم رکھ کر گاڑی میں بیٹھ گیا اور اپنی ٹیکسری چلا گیا گاڑی اس نے فوراً ہی ڈرائیور کے ہاتھ واپس بھجوا دی۔ خالد کو اپنے آفس میں بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس کو اچانک گھبراہٹ ہونے لگی اسے پسینہ آ رہا تھا اور طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا سوا بھل نکالنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی بے ہوش ہو گیا۔ خالد کا سیکریریٹری اندر آیا تھا تو اس نے جلدی سے ایبویٹنس منگوائی۔ خالد اسپتال میں تھا اس کا بلڈ پریشر ایک دم اتنا ہائی ہوا تھا کہ اس کے دماغ کی رگ پھٹنے سے قریب بھی وہ بہت تشویش کا حالت میں آئی۔ سی یو میں تھا۔

حامد کو بھی خبر ہوئی تو وہ بھاگ بھاگ چلا آیا۔ گھٹ اور جیلہ بھی پہنچ چکی تھیں۔ حامد کو دیکھتے ہی دونوں نے دوسری طرف منہ پھیر لئے۔ صبح سے شام ہو گئی۔ جیلہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے گھٹ کو، شوکارا اور اسے یاد دلایا

کہ آج کی رات اسے عمل کرنا ہے۔ گھٹ نے جلدی سے سر ہلایا اور اسپتال سے دونوں نکل گئیں وہ سیدی عامل کے پاس گئیں اس سے پچھلایا اور گھر آگئیں رات ہوئے ہی مقررہ وقت پر جیلہ نے سفاکی سے ننھے بچے کو وزن کرا اور گھٹ نے بچے کا خون پائٹی میں جمع کرنا شروع کر دیا۔ دونوں کے اس عمل پر آسان تک لرز اٹھا ہوا مگر ان دونوں ماں بیٹی کے دل سیاہ ہو چکے تھے۔ جیلہ تو اندر چلی گئی جبکہ گھٹ کچھ منجھ منجھ میں پائٹی مار کر بیٹھ گئی اور ڈوٹے سے خون بھر کر کمرے اور اندر لیتی اور ساتھ اس کے ہونٹ عامل کا ہٹایا ہوئے گل پر پڑتے مل رہے تھے وہ بے خون سے اپنا عمل جاری رکھے ہوئے تھی اور سورج نکلنے سے پہلے اس نے اپنا عمل ختم کر لیا۔

گھٹ اپنی جگہ سے اٹھی وہ سر سے پیر تک خون میں تھری ہوئی تھی، کافی خون سوکھ کر جم چکا تھا اس کے اندر سے انتہائی غلیظ بو آرہی تھی اور اس کے چہرے پر خفاش بھری مسکراہٹ رقصاں تھی۔ گھٹ نے سارا منہ دھو یا پچے کی لاش شاہر میں ڈالی اور نہانے چلی گئی۔ نہا کر جب وہ اندر آئی تو اس کی ماں جیلہ خراٹے لے کر مڑے سے سو رہی تھی۔ گھٹ بھی بستر پر لیٹ کر سو گئی اسے اتنا بھی احساس نہ تھا کہ شوہر زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔

جب دن نکل آیا تو جیلہ ناشہ کر کے اسپتال جانے لگی۔ اس نے گھٹ کو بلایا اور کہا کہ وہ جاری ہے گھٹ اچھا کہہ کر چادر منہ تک تان کر دوبارہ سو گئی۔ خالد کی گاڑی تو خراب تھی جسے تو وہ حامد کی گاڑی لے کر گیا تھا۔

دوسرے دن جیلہ نے اسپتال جانے کیلئے ٹیکسی روکی اور اس میں سوار ہوئی ٹیکسی ابھی تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ پیچھے سے آتے ایک بے قابو ٹرانز نے ٹیکسی کو ہٹ کیا ٹیکسی چلتی ہوئی دوڑ جاگری لوگوں کا جھوم لگ گیا۔ ڈرائیور تو موقع پر ہی دم توڑ گیا جبکہ جیلہ کو لوگوں نے اسپتال پہنچا دیا۔ دن چڑھے جب گھٹ اسپتال خالد کے پاس جانے کیلئے تیار ہو رہی تھی تو اس کے موبائل کی بیل بجی کوئی ان نوں نمبر تھا گھٹ نے ریو کیا۔ دوسری طرف سے کوئی آدی تھا اس نے بتایا کہ وہ انسپکٹر سمیل

”جیلہ خاتون سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“
”جی وہ میری والدہ ہیں۔“

”آپ کی والدہ کا ایکسینٹ ہو گیا ہے ان کے فون سے آپ کا نمبر ملا ہے۔ آپ جلدی آجائیں۔“ اور پھر اس نے اسپتال کا ایڈریس گھٹ کو بتایا گھٹ جلدی سے نکلی اور اپنی ماں کے پاس جانے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ خالد کے پاس حامد کو ہونا چاہیے خروہ کس مرض کی دوا ہے۔۔۔

جیلہ بہت بری طرح ڈنچی تھی اس کی دونوں ٹانگیں چور چور ہوئی تھیں وہ اپنا بچ ہو چکی تھی۔ دوسری طرف حامد کا رور کر رہا حال تھا اس پوری دنیا میں صرف ایک نگاہائی ہی تو بچا تھا اس نے خود ہی نکت کو فون کیا تو گھٹ بولی۔ ”میر ی ماں کا ایکسینٹ ہو گیا ہے میں اسپتال میں ہوں۔“

”بھابھی آپ فکر نہ کریں ہم بھائی کا خیال رکھیں گے۔“ اور گھٹ نے فون کی لائن ڈس کنکٹ کر دی۔

حامد جب گھر پہنچا تو صبا نے حامد کو مشورہ دیا کہ ہمیں حضرت سے خالد بھائی کیلئے دوا کر دانی چاہیے۔ ڈاکٹر تو اپنا کام کرتے رہیں مگر شفاء دینے والی ذات تو اللہ کی ہے۔“

صبا کی بات نے حامد میں نئی روح چھوٹ دی وہ دوڑا ہوا حضرت کے پاس گیا۔

حضرت نے کہا ”ہم خود چلیں گے“ اور حامد کے ساتھ اسپتال آگئے، خالد کو دیکھ کر انہوں نے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا پھر آنکھیں کھول کر بولے: ”وار کی اور کیلئے تھا یہ بے چارہ بیچ میں آگیا۔ لاؤ پانی دو ہمیں! خالد نے جلدی سے پانی کی بوتل اٹھا کر انہیں دے دی حضرت کے ہونٹ حرکت کرتے رہے پھر کافی دیر بعد انہوں نے پانی پر چھوٹ ماری اور بوتل خالد کے منہ سے نکلی تھوڑا بہت پانی خالد کے حلق سے نیچے چلا گیا۔ پھر وہ خالد کے سر پرانے کھڑے ہو گئے اور اپنا سیدھا ہاتھ خالد کے سر پر رکھ کر کلام الہی کا زور زور سے دہر کرنے لگے۔

حامد نے تھوڑی دیر بعد خالد کے پوٹوں پر ہاتھ رکھ دیے دیکھی اور خالد نے تھوڑی دیر میں سر کھول دیا۔ حامد کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اور

اس نے بے احتیاء حضرت کے ہاتھ چوم لئے وہ رور ہاتھا۔ ”میں آپ کا شکر یہ کیسے ادا کروں!“

”نہیں بیٹا! میرا نہیں صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور ہاں تم لوگوں سے مجھے ضروری بات کرنی ہے کل عشاء کے بعد ملاقات ہوگی۔“

”جیسا آپ کہیں حضرت“ حامد نے ادب سے کہا۔ اگلے روز عشاء کے بعد حامد حضرت کو لے کر آگیا۔ انہوں نے خالد اور حامد سے مخاطب ہو کر کہا ”حامد جب میرے پاس علاج کیلئے آیا تھا تو میں نے اس کو بتایا تھا کہ تمہارا کوئی قریبی ہے جو تمہیں نقصان پہنچا رہا ہے اور اس بار بھی یہ وار حامد کیلئے تھا مگر بیچ میں خالد آگیا۔“

”مگر حضرت ایسا کون ہے۔“ خالد نے آہستہ سے کہا۔

”خصل سے سنو! اس سب کے پیچھے خالد کی بیوی ہے۔“ اور پھر انہوں نے ساری بات خالد اور حامد کو بتائی۔ ”بیٹا بات اگر صرف نقصان پہنچانے کی ہوتی تو اس کی سزا مل جائے گی مگر وہ جوشیطان عمل کر رہی ہے اسے روکنا بے حد ضروری ہے کیونکہ اس غلیظ ذریعے سے حاصل کی گئی اولاد مسلمان نہیں شیطان ہوگی۔ ایمان سے تو وہ عورت خارج ہو ہی چکی ہے۔ اب تمہاری نسل کو گندا کرنے پر تلی ہے۔ ابھی جب تک اس کے عمل کا دن نہ آئے اسے خبر نہ ہونے دینا کہ تم سب جان چکے ہو اور اسے اس عمل سے روکنا ہوگا۔“

خالد کا خون کھول رہا تھا۔ ”اس غلیظ عورت نے اس کی پوری زندگی خراب کر دی ماں کو مارا، بہن کی بیٹی کو بھیبت چڑھایا، بہن صدمے سے مر گئی، بھائی ہاتھ سے محروم ہو گیا اور اب میری نسل کو گندا کر رہی ہے۔“ حامد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

آج پورے چاند کی رات تھی گھٹ اپنی ماں کے گھر آگئی تھی، وہ عامل سے تنہا سا چلائی گئی جو اس نے اپنی چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ آج وہ اکیلی ہی تھی کیوں کہ ماں تو اپنا بچ ہو کر بستر پر پڑی تھی۔ بارہ بج رہے تھے۔ گھٹ نے گھر پہنچ کر بچے کو تخت پر لٹایا اور جلدی سے چھری اور پائٹی لے آئی



خونی اسپتال

ثاقب بشیر-لاہور

رات کا گھنٹا شوپ اندھیرا ہر سو مسلط تھا، کائنات پر بیٹھی
خوبرو حسینہ اونگھ رہی تھی کہ اچانک ایک کھٹکا ہوا تو اس نے
اپنی آنکھیں کھول دیں اور پھر اس کا سانس سینے میں اٹک گیا
کیونکہ.....

خوفناک دہشت ناک اور دل کو دبلا دینے والی رات کے اندر میرے میں جنم لیتی کہانی

طوفانی بارش کی تیزیزوں سے بے نیاز
عائشہ اور اقبال کی کارروڈ پر تیز رفتار سے آگے بڑھتی
جاری تھی کیونکہ اقبال کو اپنی ذرا نیوٹنگ پر پورا اعتماد تھا۔
”چلو جی ہو گیا پورا“ عائشہ ستانے والے
انداز میں اقبال کی طرف دیکھ کر بولی۔
”کیا پورا ہو گیا؟“
اقبال حیران ہو کر پوچھنے لگا۔
ایک ہفتہ قبل ان دونوں کی شادی ہوئی تھی
اور دونوں ہی اپنے اپنے گھر کی اکلوتی اولاد تھے۔ شادی
گو کہ رائج تھی مگر ایک ہفتے میں اقبال نے عائشہ کو
اتنا پیار دیا تھا کہ لگا ہی نہیں تھا کہ ایک ہفتہ پہلے تک
انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں تھا کیونکہ اپنی
اپنی جگہ دونوں کا موقف یہی تھا کہ ”شادی کی محبت ہی
نہی محبت ہوتی ہے۔“

وہ بچے کی طرف بڑھی تھی کہ کسی نے دروازہ بجایا۔ اس
نے سوچا اس وقت کون آ سکتا ہے۔ نگہت نے دروازہ کھولا تو
اس کے بیروں تلے سے زمین نکل گئی سامنے خالد کھڑا تھا اور
اس کے ساتھ حامد بھی تھا۔ تخت پر لیٹے بچے نے روننا شروع
کر دیا۔ ”جی یہ پردن کا بچہ ہے اسے کہیں.....“ نگہت کا
جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ خالد کا ایک ذرا دروازہ پر اس کے منہ
پر پڑا تو نگہت کی قدم لڑکھڑا گئی۔ ”غلط عورت! اتنا گھٹا وٹا
تھکیل رہا جاتا تو نے، مٹھانے کس دن تجھ سے کہا تھا کہ مجھے
اولاد چاہیے، جب میرے رب کی رضا ہوتی تو مجھے اولاد مل
جاتی مگر تو؟ اس حد تک گر گئی کہ میری ہی بہن کی بچی کی
بھیٹ دے دی۔ ملعون تو ایمان سے خارج ہو چکی ہے۔
میں چاہوں تو تجھے ابھی پولیس کے حوالے کر سکتا ہوں مگر
میں تیرا حساب اللہ پر چھوڑتا ہوں۔ ہاں ایک چیز جو میرے
کرنے کی ہے وہ میں ضرور کروں گا۔“ میں تجھے طلاق دیتا
ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔“ دین سے خارج
عورت کی میری زندگی میں کوئی جگہ نہیں۔ حامد نے آگے
بڑھ کر بچے کو اٹھایا اور دونوں باہر نکل گئے۔ نگہت اپنی جگہ ہکا
بکا کھڑی رہ گئی۔ نکل کا وقت آدھا گزر چکا تھا اس کا ہوش
نگہت کو نہ رہا اور نکل بچ میں رہ کر مکمل نہ ہوا۔ خالد نے اگلے
روز ہی نگہت کو ہر کی رقم بھجوا دی۔

نگہت کو مکمل اور حوا چھوڑنے کی سزا ملی اگلے روز
سے اس کے جسم پر آبلے پڑنے لگے جو پھول کر مومٹے
ہو جاتے اور پھٹ جاتے اگلے روز پھر نکلے پھول جاتے
اور پھٹ جاتے نگہت اس عامل کے پاس گئی۔ اس نے
مزید رقم مانگی۔ نگہت نے اپنے مہر کی رقم اس کے حوالے
کر کے اپنی جان چھڑائی۔

وقت پر لگا کر آگیا۔ خالد نے دوسری شادی کر لی
اس کی بیوی بہت نیک اور پرہیزگار عورت تھی۔ خالد کے شین
بچے تھے۔ وہ انہوآء کیا گیا پھر جو نگہت کے پاس تھا خالد نے
اسے پولیس کے ذریعہ واپس کر دیا تھا اور پچاپنے والے بدین کو
پکچ چکا تھا۔ اللہ نے اس کو دولت سے نوازا تھا۔ جس میں
سودہ دل کھول کر اللہ کی راہ میں خرچ کرتا تھا۔
اس کے بھائی حامد نے ایک خیراتی اسپتال بنایا



”ارے جناب! ایک ہی تو خواب تھا میرا جو پورے کا پورا کباڑا ہو گیا۔“ عائشہ نے شرارتی انداز میں کہا۔

”ارے بھی خواب تو بتا دو۔“ اقبال اس کی شرارت سے انجان ہی تھا۔

”میں تو شادی سے پہلے سوچا کرتی تھی کہ ایک خوبصورت ہم سفر کے ساتھ مختلف شہروں کی رونقیں دیکھوں گی مگر میرے ہم سفر تو مجھے میرے چھوٹے سے شہر سے نکال کر مزید دیرانوں کی طرف لئے جا رہے ہیں۔“ عائشہ کی آنکھوں میں بدستور شرارت تھی۔

اب اقبال کے ہونٹوں پر ممتی خیز مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ”چلو جی آدھی خواہش تو پوری ہو گئی کہ خوبصورت ہم سفر کے ساتھ سفر جاری ہے اور رہی بات رونقوں کی تو لاہور کے دھومیں میں سانس لینے کے بجائے میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ شادی کے بعد کئی مہینوں کسی خوبصورت گاؤں میں جا کر مناؤں گا۔“

”اللہ..... اللہ..... یہ خوش فہمیاں میرے پتی دیو کی۔“ عائشہ ایک جذباتی قہقہہ لگا کر بولی تو اقبال بھی اس کے چھینرنے پر مسکرا دیا۔

زندگی اور خوشی سے بھرپور ان لمحوں میں کسی اور کو بھی ان پر مسکراہٹ آگئی تھی اور وہ تھی ان کی ”بدقسمتی۔“

انہیں گھر سے نکلے ہوئے چار گھنٹے ہو رہے تھے اور آبادی سے ہٹ کر ٹوٹی پھوٹی سڑک شاہ کوٹ کی طرف جارہی تھی۔

”اچھا۔ اب میری طرف دیکھنے کی بجائے سامنے دیکھو گے تو پتہ چلے گا کہ آگے ایک پل بھی آ رہا ہے۔“ عائشہ اقبال کو اپنی طرف مسلسل دیکھتے رہنے پر شینکار بولی تو اقبال مسکرایا۔

اب ان کی کار پل پر سے گزر رہی تھی کہ اچانک پل پر کچھ ترخنے کی آواز سنائی دی اور ٹھیک ان کی کار کے نیچے سے کچھ ایشیں کھسک کر گر گئیں اور اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھ پاتے، اینٹوں اور سیمنٹ

سے بنایا گیا پل ٹوٹ گیا اور ان کی کار 50 فٹ کی بلندی سے نیچے کھائی میں گر گئی پٹی گئی۔

اقبال کی آنکھوں میں جو آخری عکس ابھرا، عائشہ کا وحشت زدہ چہرہ تھا۔

کچھ دیر پہلے جن آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی اب ان میں صرف زندگی کھودینے کا خوف تھا اور اس کے بعد کیا ہوا اقبال کو کچھ یاد نہیں رہا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر فیصل بھی عجیب ہی ہیں ایک تو اس دیرانے میں اسپتال کھلو کر بیٹھے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں اپنے گھروالوں سے دور رہنا پڑ رہا ہے۔“ سسر عمارہ خاصی بیزار آجکی تھی۔ دو سال ہو گئے تھے اسے اس خاموش اور دیرانے سے اسپتال میں کام کرنے ہوئے اسپتال شہر سے خاصا دور تھا مگر چونکہ خواہ اجنبی تھی اور مہینے بعد گھروالوں سے ملوانے کے لئے پک اپٹر ڈراپ کی سہولت بھی موجود تھی اس لئے وہ یہ سب برداشت کرنے پر مجبور تھی گھر کی مجبوری انسان کو اپنے گھر سے ہزاروں میل دور پر بھی لے جاتی ہے۔

اسپتال کے کل اسٹاف میں ایک وارڈ بوائے تیمور، دو نرسیں شہلا اور عمارہ تھیں اس کے علاوہ ٹیلی فون آپریٹر انیشا تھی اور اسپتال کا مالک ڈاکٹر فیصل۔

”بھئی تم جانتی ہو ناں کہ، ڈاکٹر فیصل کے یہ اسپتال بنانے کے پیچھے دو وجوہات کارفرما ہیں ایک وجہ تو یہ ہے کہ بہترین ٹیم تشکیل دینا مثلاً وہ ملک کے سب سے مایہ ناز ڈاکٹر ہیں اور ہم دونوں بھی اپنے اپنے

اسپتال میں بہترین نرسوں کا ٹائٹل لے چکی ہیں۔ وارڈ بوائے اور ٹیلی فون آپریٹر پر بھی اپنے اپنے خیر میں لکھا ہیں وارڈ بوائے کو کیڈر ایس ہے اور انیشا کی ذمہ داری بھی بخوبی سمجھتا ہے ٹیلی فون پر آپریٹر انیشا کی لچھے دار باتوں سے یہاں فون کرنے والے ہر شخص کا پھنسا لازی ہوتا ہے اور یہاں ایڈمنٹ بھی انہی ارب پتی مرلینوں کو کیا جاتا ہے جو لاکھوں کی فیس با آسانی ادا کر دیں دوسرے لفٹوں میں بیٹھ سکیں۔

دوسری وجہ دولت کی ہوس ہے، وہ دولت جو ڈاکٹر صاحب کو کہیں اور میسر نہیں آ سکتی یہاں سکون بھی اور مرضی کا لاکھوں روپیہ اور یہ بھی ڈاکٹر فیصل کا ہنر ہے کہ کچھ دوا اسٹاف کے ساتھ شاید ملک کا سب سے مہنگا اسپتال چلا رہے ہیں۔ اسٹاف نرس شہلا نے تعصیلاً بتایا تو عمارہ سر ہلا کر رہ گئی۔

دور یعنی ٹیلی فون آپریٹر انیشا بھی یہ سب کچھ سن رہی تھی مگر خاموش رہی دیے بھی اسے صرف تب ہی بولنے شایا تھا جب وہ فون اٹھاتی تھی۔

ڈاکٹر فیصل اپنے کمرے میں بیٹھا وارڈ بوائے کو آپریشن کے لئے ضروری ادویات لانے کی ہدایات دے رہا تھا۔ آج ایک اور وی آئی پی شخصیت کا بانی پاس ہوتا تھا اور ڈاکٹر فیصل اسپتال کے منہ مانگی اخراجات سے مطمئن تھا۔

☆.....☆.....☆

برستی بارش بہت زیادہ عذاب ثابت ہوئی اور جس نے اچھے بھلے پل کو توڑ دیا تھا۔

مسلسل برستی بارش کی بوندیں اقبال کو ہوش میں لے آئیں تھی۔ اقبال کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے پھر بھی اس نے اپنی آنکھوں کو زیادہ زور سے مسلا، لہذا اس کے سر سے بہتا ہوا اس کی آنکھوں سے ہوتا ہوا چہرے پر بھی آ رہا تھا، دروازہ شاید تھا کہ وہ تو بھول ہی چکا تھا اس حادثے کو۔

لیکن پھر اچانک ایک جھماکے سے اسے سب کچھ یاد آ گیا وہ اس وقت اپنی چکی ہوئی گاڑی میں ڈھکی پڑا تھا گاڑی کا اسٹیرنگ اس کی ٹانگوں میں پھنسا ہوا تھا، سر پٹ چپکا کر اہ کی آواز سن کر اس نے سرگھما کر دوسری طرف دیکھا تو عائشہ ساکت سی پڑی دکھائی دی۔

”عائشہ“ اس نے چلا تا چا یا مگر بڑا کر رہ گیا عائشہ شدید زخمی تھی وینڈ اسکرین کا شیشہ ٹوٹ کر اس کی گردن اور پیٹ میں گھس چکا تھا اور مسلسل خون شے جا رہا تھا۔

”عائشہ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا کچھ نہیں ہوگا تمہیں، نہیں جینا ہے بہت سال تک ایک ساتھ۔“ بے اختیار بے بسی کے آنسوؤں نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا تھا۔

”مجھے کچھ کرنا ہوگا۔“ اس نے خود سے کہا اور ہمت کر کے گاڑی سے نکلنے کی کوشش شروع کر دی، دروازہ بری طرح سے چپک چکا تھا در رینگتے ہوئے کھڑکی کے شیشے سے باہر نکلا اور زمین پر گر گیا پھر لڑکھٹا رہا ہوا اٹھا ابھی تو بہت مسافت طے کرنا تھی اسے، اپنی عائشہ کو بچانا تھا۔

عائشہ کی طرف کا دروازہ بہتر حالت میں تھا اسے کھول کر عائشہ کو کھینٹ کر باہر نکالا اور زخموں سے چور چور ہوتے جسم کے ساتھ پل کے کناروں کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ پندرہ منٹ میں وہ پل کے دوسری طرف تھا اور پوری طاقت صرف کر کے سیدھا دوڑنے کی کوشش کرنے لگا جہاں شاید کہیں اسے عائشہ کے لئے مدد مل سکے۔

پھر اچانک امید کی کرن چمکی۔ ”فیصل اسپتال کا پورڈ لگا تھا اور دائیں طرف تیر کا نشان بنا ہوا تھا وہ اس عمارت کی طرف لپکا۔ صبح سے بارش ہو رہی تھی نرس عمارہ اسپتال کے مین ڈور کی طرف دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ ”اماں ٹھیک ہی کہتی ہے جمراٹ کی بارش ہفتہ تک رہتی ہے۔“

اچانک وہ چونک بڑی سامنے منظر ہی کچھ ایسا تھا ایک زخمی جوان کسی زخمی جوان لڑکی کو اٹھائے لڑکھٹاتا ہوا اسپتال میں داخل ہو رہا تھا۔

یاس و آس میں گھرے اس جوڑے کا منظر اتنا درونگ تھا کہ کم گو اور حس فطرت کی عمارہ برداشت نہ کر سکی اور بھاگ کر انہیں سہارا دینے کے لئے پہنچی، عمارہ کو اس طرح باہر کی طرف بھاگتا ہوا دیکھ کر انیشا اور شہلا بھی باہر چلی گئیں۔

”ڈاکٹر، ڈاکٹر کو بلا میں پلیز۔۔۔۔۔!“ اقبال ہلتی لچھے میں بڑبڑانے لگا۔

خوشخبری

طلمسائی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورہ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یعنی، عقیق، پیکراج، لاجورد، نیلم، زمرہ، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلمسائی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاشری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مال، نا فرمان اولاد، نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مردو عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو زامی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورہ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826-021-2446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سیسٹر

بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

سے انھوں نے اس طرح عاشر کو اٹھا کر ہسپتال سے باہر نکل گیا جس طرح وہ لڑکھڑاتا ہوا دہاں تک آیا ہوا تھا۔ عمارہ نے بھاگ کر زوردار پیسے واپس اقبال کی جیب میں ڈال دیئے صرف ایک دھڑک کارڈ سنہال لپٹا مارا واپس آ کر کرسی پر ڈھے ہی گئی اس کے دماغ میں سچوں کی آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

اقبال ہسپتال سے باہر نکلا تو اچانک اسے ہسپتال کی بیرونی دیوار کے ساتھ ایک پیچڑا ہوا دکھائی دیا اس نے عاشر کو زمین پر لٹایا اور دیوار کے پاس موجود پیچڑا ہوا اور ہسپتال سے تھوڑا ہٹ کر زمین کھودنی شروع کر دی۔ وہ عاشر کو دہن دہن کرنا چاہتا تھا۔ عاشر کو دہاں دفن کردہ انجان راستوں کی طرف نکل گیا۔ دھیرے کا آپریشن کامیاب رہا، کپاؤنڈر کسی کام سے باہر نکلا تو اس جگہ تازہ کھدی ہوئی قبر دیکھ کر چونک گیا اور سارا ماجرہ سمجھ گیا اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر اقبال غائب تھا۔

اس نے اندر جا کر ڈاکٹر فیصل کو ساری بات بتائی تو ڈاکٹر نے یوں کندھے اچکا دیا جیسے کوئی بات نہ ہو۔ قبریں اور مردے اب اس کے لئے نئے نہیں رہے تھے ہر شخص اپنی جگہ مطمئن اور خوش تھا مگر عمارہ کا دل ابھی بھی نہیں سنہلے تھا۔ اس واقعہ کو دیکھتے گزر چکے تھے دیر انداز دست بوکرواپس جا چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس رات سارا الشاف اپنے اپنے کمرے میں تھا ہسپتال کا شیشے کا دروازہ بند تھا اور کھنڈی لگی ہوئی تھی ٹیلی فون آپریٹر انیلا کی ڈیوٹی تھی انیلا اگتھ رہی تھی کہ اچانک ٹیلی فون پر دنگ پر چونک گئی شیشے کے دروازے پر اچانک جو منظر انیلا نے دیکھا اس نے اس کے ہوش اڑا دیئے، عاشر ایک ہاتھ سے اپنے گلے کا شیشہ اڑا رہا دوسرے ہاتھ سے پیٹ میں چھپا شیشہ لئے کھڑی تھی اور اسے گھور رہی تھی۔

بے انتہا سرد اور سپاٹ چہرہ لئے انیلا اپنی کرسی

لئے نہیں کھول رکھا ہے جو تمہاری بیوی کی حالت ہے، تم نا امید ہی ہو جاؤ۔“

”پلیز!“ ڈاکٹر صاحب، میری بات سن لیں میں بعد میں سارا خرچ دے دوں گا فی الحال آپ پر رکن لیں۔“ پانگوں کی طرح اس نے عاشر کے کتھن اور چیمبر اتارے اور اپنی جیبوں میں موجود پیسے لٹکے لگا صرف چند ہزار۔

عجب بے کسی کا عالم تھا یہ نہیں ڈاکٹر فیصل کے لبوں پر ایک طنزیسی کراہٹ نمودار ہوئی۔

اتنی دیر میں کپاؤنڈر اور دھیرے دونوں ساتھ ساتھ دہاں پہنچ گئے۔ ”میں اپنے کپاؤنڈر سے کہہ دیتا ہوں وہ تمہاری ڈریسنگ کمرے کا اس سے زیادہ فی الحال میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔“ ڈاکٹر نے دھیرے کو ساتھ لیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

عمارہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی۔ اقبال واپس کھڑا سوچتا رہا کہ بدولت کے بچاری آج پھر دولت کے لئے ایک انسان کی جلی دیں گے، اور بلک بلک کے روتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد عاشر نے آخری ٹیکہ لی اور اس کی روح نفس غصری سے پرواز کر گئی۔

تقریباً سب ہی مطمئن تھے کہ چلو کام کا بوجھ ایک دن میں ڈھل نہیں ہوا اقبال کے علاوہ اگر وہاں کسی کا دل بلک رہا تھا تو وہ بھی سسر عمارہ، عمارہ ہی کے پاؤں دلانے پر کپاؤنڈر نے ساکت بیٹھے حامد کی مرہم پٹی کر دی۔

”سر میں نے کپاؤنڈر سے بول کر شہر تک آپ دونوں کی واپسی کا انتظام کر دیا ہے۔“

اقبال نے پھٹی پھٹی نگاہوں کے ساتھ عمارہ کو دیکھا اتنا کرب چھپا تھا ان آنکھوں میں کہ عمارہ ڈر گئی ایسی آنکھیں کسی عاشق کی ہو سکتی ہیں یا پھر کسی قاتل کی اقبال اور عاشر کی بے بسی عمارہ کی آنکھوں میں بھی صاف نظر آ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اچانک اقبال عاشر کے پاس

عمارہ نے انیلا کی مدد سے عاشر کو اسٹریچر پر لٹا دیا اور اقبال کو پیٹھنے کے لئے کرسی دی مگر وہ عاشر کی طرف دیکھ کر بس بڑبڑائے جا رہا تھا۔ ”ڈاکٹر کو بلاؤ۔ میری عاشر کو بچاؤ۔“

انیلا ڈاکٹر کے کمرے کی طرف چلی گئی اور راستے میں سوچ رہی تھی کہ ”چلو جی۔ آج تو بڑے صاحب کا آپریشن بھی ہے اور اس کے ساتھ اب آئے مریض کی ڈوٹیاں بھی بھٹکانی پڑیں گی۔“ اس کی نفاق سوچ میں کسی کی زندگی یا موت کو لے کر کوئی ہمدردی کا ایک حرف نہیں تھا۔ دوسری طرف عمارہ جو کہ ڈاکٹر فیصل کی لاپچی طبیعت سے بخوبی واقف تھی یہ سوچ رہی تھی کہ ”کیا ایک خالی ہاتھ جوڑے کو ترجیح دی جائے گی اس ہسپتال میں ایک بڑے امیر رئیس کے آپریشن پر۔“

عمارہ کا ذہن مسلسل جواب دینے جا رہا تھا کہ ”ہرگز نہیں۔“ ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اسے شہلا کے ساتھ ڈاکٹر آتا ہوا دکھائی دیا۔

اقبال ڈاکٹر کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا۔ ”پلیز! میری بیوی کو بچائیں ڈاکٹر صاحب زندگی بھر کے سفر میں ساتھ رہنے کا وعدہ کرنے والی مجھے تنہا چھوڑ کر جا رہی ہے۔ پلیز! ڈاکٹر صاحب۔“ عاشر جان بکنی کے عالم میں بچکیاں لے رہی تھی۔

”دیکھو! بروخوردار! میں اس چھوٹے سے ہسپتال کا اکوٹا ڈاکٹر ہوں اور میں سیدھی بات کرنا جانتا ہوں بات یہ ہے کہ آج بائی پاس کے آپریشن کے لئے دھیرے صاحب نے ٹائم لے رکھا ہے جو کہ بس پہنچنے والے ہیں اور تمہاری بیوی کی حالت ایسی ہے کہ فوری طور پر اسے میجر سرجری کی ضرورت ہے، پیٹ میں چھپنے والے شیشے نے گہرے اندرونی گھاؤ بنائے ہیں اور گردن میں شہ رگ کو بھی نقصان ہوا ہے جس کے لئے سرجری تو ہونی ہی ہے مگر میں ایک ساتھ دو کیس ہینڈل نہیں کرنا چاہتا دیکھو بھی میں نے یہ ہسپتال مفت کی سرجری کرنے کے

سے انہی اور اندر کی طرف بھاگے گی۔

ایک جھماکے سے دروازے کا شیشہ ٹوٹا اور آواز سن کر ایٹلا کی ہمت جواب دے گئی وہ زمین پر ڈھسے گئی۔

عائشہ کی روح اس کی طرف بڑھتی جا رہی تھی اور ایٹلا کا رنگ زرد ہو چکا تھا موت کی سفیدی اس کے چہرے پر قہقہہ تھی۔

عائشہ نے اچانک ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ میں موجود شیشہ اوپر کواٹھایا اور ایٹلا کے سر میں گھونپ دیا۔

اگلا دن اسپتال کے لئے بڑا ہی گم خیز تھا وارڈ ہوائے نے ایٹلا کی لاش سب سے پہلے دیکھی تھی اور چیخ چیخ کر سب کو اکٹھا کر لیا تھا، سب ہی انکشت بدناس تھے اس وحشت ناک منظر پر، ہر ایک اپنی اپنی رائے دے رہا تھا۔

آخر میں ڈاکٹر فیصل بولا۔ ”مجھے یہ کسی چور کی واردات لگتی ہے۔ ایٹلا نے اسے پکڑنے کی کوشش کی ہوگی اور بے چاری اسی چکر میں اپنی جان سے گئی۔“

وارڈ بوائے اور دونوں نرسوں کو دل ہی دل میں اس بات سے اختلاف تھا کہ ”اتنی خاموشی سے یہ سب کیسے ہو گیا؟ کیا وہ سب بہرے ہو گئے تھے؟“ ڈاکٹر فیصل کے علاوہ بھی ڈر چکے تھے۔

سسٹر شہلا کا تو خوف سے برا حال تھا۔ ”تم ایسا کرو کہ ایٹلا کی لاش کو اس کے گھر پہنچاؤ اور سارا ماجرہ بھی بتا دینا، اب کسی اور اچھی ٹیلی فون آپریٹر کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔“ ڈاکٹر فیصل بولا۔

”بہتر سر۔“ وارڈ بوائے نے سر ہلایا جیسے وہ یہ ذمہ داری قبول کر رہا ہو۔

”کیا ہمیں کچھ دن کی چھٹی مل سکتی ہے؟“ عمارہ نے ڈرتے ڈرتے ڈاکٹر سے پوچھا۔ وہ صبح میں ڈر گئی تھی پہلی مرتبہ ایسا حادثہ اس کے سامنے ہوا تھا۔

”ہمیں اب ہم اپنا اسپتال تو بند نہیں کر سکتے ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی سرجری تو کرنی ہوتی ہے مجھے۔“ ڈاکٹر بولا۔

”لیکن سر! ایٹلا کی موت کوئی عام سی بات تو۔“ شہلا نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔

”بس میں نے کہہ دیا تھا نہیں۔“ ڈاکٹر فیصل غرایا۔ ”اگر میں ٹیلی فون آپریٹر کا انتظام کر سکتا ہوں تو اسٹاف بھی نیا لاسکتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا اور باقی لوگ بھی اپنی اپنی ذمہ داریوں میں مصروف ہو گئے۔

نئی ٹیلی فون آپریٹر کا بندوبست ابھی تک نہیں ہو سکا تھا عمارہ اور شہلا کو باری باری ٹیلی فون کا دست پر بیٹھنا اور اوگھنا پڑنا تھا، کالز تو بہت کم آتی تھیں اسپتال میں مگر ڈاکٹر فیصل کا کہنا تھا کہ ”ایک فرد کو لازمی ریسپشن پر رہنا چاہیے۔“

ٹیلی فون ڈیک پر اس رات باری سسٹر شہلا کی تھی وہ اپنی ہی سوچوں میں مست اونگھ رہی تھی کہ اچانک اسے بند کٹ کے نیچے سے چالی والی ایک چھوٹی سی کھلونا کار چلتی ہوئی نظر آئی جو سیدھی اس کی طرف بڑھ رہی تھی یہ ضرور عمارہ کی شرارت ہوگی وہ بڑبڑاتی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

اچانک اسے اپنے ہوش دحواس معطل ہوتے ہوئے نظر آئے کار کا سائز بڑھ رہا تھا، جوں جوں وہ کار اس کے قریب آتی جا رہی تھی اس کا سائز بڑھ رہا تھا جب وہ کار کاؤنٹر تک پہنچی تو وہ ایک پوری کار کا روپ دھار چکی تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر وہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جو کچھ دن پہلے اسی اسپتال میں تڑپ تڑپ کر مر چکی تھی۔

”اور سسٹر شہلا کا خیال تھا کہ اسے مری جانا چاہیے۔“ ٹھیک اسی لمحے عمارہ بھی شہلا کی طرف آتی نظر آئی جب اس نے وہ خوف ناک منظر دیکھا جس میں اسپتال کے کاؤنٹر پر کھڑی کار نے شہلا کو چل دیا، کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر عائشہ تھی اس کے بعد عمارہ کو کوئی ہوش نہ رہا۔

اگلے دن صبح جب شہلا کی لاش لی

ڈیکمپنڈر اسی وقت اسپتال چھوڑ کر بھاگ گیا اور عمارہ نے بھی پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ اس اسپتال میں آج اس کی بھی آخری رات ہوگی پھر وہ اپنا سانس پیک کرنے لگی۔

اس رات ڈاکٹر فیصل اپنے کمرے میں پریشان بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ”شاید اس کا اسپتال آسیب زدہ ہو گیا ہے خیر میں کچھ دن بعد شہر میں ہی شفٹ ہو جاؤں گا اب تک اتنا تو جمع کر ہی چکا ہوں کہ میری سات لیلیں کھا سکتی ہیں مگر دولت پھر بھی ختم نہ ہوگی۔“

اچانک اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا باہر کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں درخت پر کوئی لڑکی بیٹھی تھی جس کی ٹانگیں اتنی لمبی تھیں کہ زمین کو چھو رہی تھیں اسے دیکھ کر ڈاکٹر فیصل بہت خوف زدہ ہو گیا۔

”کیا میں باہل ہو رہا ہوں؟ نہیں بالکل نہیں۔“ اچانک وہ لڑکی اسے اپنے کمرے میں چلنے کے ساتھ جھولا جھولتی نظر آئی یہ تو وہی لڑکی تھی جس کا علاج کرنے سے وہ انکار کر چکا تھا۔

”تم..... تم تو مر چکی ہو پھر تم۔“

اس کے پیٹ اور گلے میں سے خون کے قطرے بہہ کر پورے کمرے میں پھیل رہے تھے۔ ”ہمیں یہ نہیں ہو سکا۔“ ڈاکٹر دیوانوں کی طرح چلائے لگا۔

”تم زندہ نہیں ہو سکتی۔“

”ہا..... ہا..... بول اپنی دولت کو کہہ تیوے لئے زندگی خرید لے۔ بہت اتر رہا تھا ناں تو۔“ عائشہ کی روح کے گلے سے خرخراتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔

”مم..... مجھے معاف کر دو، میں نے بہت غلط کیا تمہارے ساتھ، دولت کی ہوس میں، میں اندھا ہو چکا تھا اور سوچو یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تم سرجری کے بعد بھی مر جاتی، پلیز مجھے معاف کر دو۔“

”اگر سرجری کے بعد مرنے تو ایک منیسا کے ہاتھوں دم نکلتا، دولت وہوس کے اس پجاری کے ہاتھوں میں مرنے، ہونے کو تو ڈرے کا آپریشن بھی ناکام ہو سکتا تھا ڈاکٹر تو نے تو میری عمر پر بھی ترس نہ کھایا میں اپنا وفا اور محبت اپنے شوہر کے لئے سمہال سنبھال

کر رکھتی رہی اور جب اپنی خوشیوں کی ڈولی لے کر نکلی تو لالچوں نے ڈولی کو ماتم کدے میں بدل دیا تو بچ نہیں سکتا ڈاکٹر اب میں تیرے دولت کے اس ہوس کدے کو بھی ماتم کدہ بنا دوں گی۔“

چھوٹے چھوٹے تیز نوکیلے شیشے اڑتے ہوئے آئے اور ہزاروں کی تعداد میں ڈاکٹر فیصل کے جسم میں چبھ گئے، وہ تڑپا اور نیچے کر کر ہوش دحواس سے بیگانہ ہو گیا۔

اگلی صبح عمارہ بھی ڈاکٹر فیصل سے ملے بغیر اپنا سامان اٹھا کر واپس جا چکی تھی یہ جانے بغیر کہ ڈاکٹر کس حالت میں ہے۔

ای دن رات کا آخری پہر تھا جب ڈاکٹر فیصل کی آنکھ کھلی ورنہ کی ٹیمیں جسم سے اٹھ رہی تھیں اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر دروازے کے پاس جاتا۔ لیٹے لیٹے ہی وہ اپنے جسم سے شیشوں کے ٹکڑے کھینچنے لگا۔

”آہ۔ میری مدد کرو پلیز!“ صرف ایک شیشہ کھینچنے پر کراہ کر رہ گیا۔ اذیت نے اس کے دماغ کی چولیس ہلا کر رکھ دی تھیں۔ جسم میں اتنے شیشے پیوست تھے کہ وہ بل بھی نہ سکتا تھا، نہ جی رہا تھا اور نہ مر رہا تھا۔

”کاش مجھے موت ہی آجائے کاش میں مرکز اس اذیت سے چھٹکارا پاسکوں۔“ وہ بڑبڑایا۔

”اتنی بھی جلدی کیا ہے، اب تو ہرزور میں تجھے ایک نئی موت ماروں گی، روز ایک نئی اذیت دوں گی، تو ترے گا ہی طرح مرنے کو مگر میں پائے گا۔“ عائشہ قبقرعہ لگا کر مٹی اور غائب ہو گئی۔ باہر سے کمرے کی کڑی خود بخود دنگ گئی اور ڈاکٹر فیصل عقیدہ ہو کر رہ گیا۔

”ٹرن..... ٹرن..... ٹرن“ اسپتال کی فون کی صفائی مسلسل چلائے جا رہی تھی شاید کوئی تھا جو ڈاکٹر فیصل سے بات کرنا چاہتا تھا۔

اچانک فون اٹھایا گیا ایک نسوانی خرخراتی ہوائی آواز سنائی دی ”کون؟“

میں ہاشم خان بول رہا ہوں مجھے ڈاکٹر فیصل سے بات کرنی ہے۔۔۔۔۔ ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اچانک اس کا سانس رکنے لگا، ایسا لگ رہا تھا کوئی اس کا گلہ دار ہے۔ پھر وہ نیچے گرنا اور وہیں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

اسی طرح جو بھی وہاں فون کرتا اس کا سانس رک جاتا۔ دو انجانے ہاتھ اس کا گلہ بوجھ لیتے اور اسے تپ ہی آزادی ملتی جب اس کی روح پرواز کر چکی ہوتی۔

اس طرح کے کئی حادثات ہوئے تو پورے شہر میں یہ بات پھیل گئی۔ ہر اخبار، ٹی وی پراسی خطرناک فون نمبر کا رچرچل رہا تھا۔ پولیس ٹیم بھیجی گئی کہ جا کر اسپتال کا معائنہ کرنے مگر انہیں کچھ بھی سراغ نہ مل سکا۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر فیصل بھی انہیں اپنے کمرے میں نہ نظر آیا۔

اس سارے حادثے سے اگر کوئی باخبر تھا تو وہ تھی نرس عمارہ۔ جس کے ضمیر کی آواز نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ ڈینٹک کارڈ پر موجود اس پتے پر پہنچ جائے جو اقبال کی جیب سے گرا تھا اور اس کے جانے کے بعد عمارہ نے اپنے پرس میں منجھال کر رکھ لیا تھا۔

”تڑپ رہا ہے ناں درد سے، میں بھی تڑپ رہی تھی مگر تو نے مجھے مرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اچھا چل، ظہر میں مددوا کرنی ہوں تیرے دغوں کا، میں نکلتی ہوں تیرے جسم سے شیشے۔“ عمارہ کے لبوں پر لہان وجود نے کمرہ ہنسی ہنسنے ہوئے کہا اور ڈاکٹر فیصل کے جسم میں چبھے ہوئے شیشے نکالنے لگی ڈاکٹر کی جینیں پورے اسپتال میں گونج رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

عمارہ جانتی نہیں تھی کہ اقبال اسے گھر پر لے گا بھی یا نہیں مگر وہ چلتی رہی اور بالآخر اس پتے پر پہنچ گئی جو کارڈ پر لکھا ہوا تھا چھوٹا سا خوبصورت گھر جو کینوں کی نقاست کا منہ بولتا ثبوت تھا، عمارہ نے دروازہ بجایا تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور اسے اقبال نظر آیا مگر یہ کیا

یہ شخص تو محض اس اقبال کی پرچھائی تھا جو اسے اسپتال میں نظر آیا تھا۔ بکھرے بال اور ابھی ہوئی داڑھی مچھ نہیں کب سے نہیں بنوائی تھی۔

”آجائیں محترمہ! میں جانتا تھا اسپتال کی وہ کہانی جس کا ایک ہمدرد کردار آپ بھی تھیں، اور لوگوں کی موت آپ کو مجھے ڈھونڈنے پر مجبور کر دے گی۔ مگر معاف کیجئے گا، مجترمہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔“

”دیکھو اقبال معاملہ ان بے گناہوں کا ہے جو عمارہ کے ناجائز انتقام کا حصہ بن رہے ہیں مجھے پتہ ہے تم کوئی عامل نہیں ہو مگر پھر بھی تمہارے پاس طاقت ہے محبت کی طاقت۔“

مجھے یقین ہے عمارہ تمہاری بات ضرور مانے گی؟

”مگر میں کیوں جاؤں۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیوں نہ عمارہ کو انتقام لینے دوں۔ اس ظالم معاشرے سے، جہاں دولت کے انبار زندگی لے لے بھی سکتے ہیں اور زندگی دے بھی سکتے ہیں۔ معلوم نہیں اس طرح کے کتنے ڈاکٹر معصوم زندہ گیوں پر خدا بن بیٹھے ہیں، کتنی اصوات کے ذمہ دار ہیں، ان کا مرجانا ہی بہتر ہے۔“

”اور تم کیا کہتے ہو ان لوگوں کے بارے میں جو مریض ہیں اور شفا کی غرض سے ڈاکٹر فیصل کے اسپتال فون کرتے ہیں، تم کیا سمجھتے ہو ان کی موت عمارہ کی روح کو سکون دے رہی ہوگی۔ ہرگز نہیں! مگر وقت کے ساتھ اس کا سکون مزید غارت ہوگا، اس کی روح کرب میں مبتلا ہو چکی ہے۔“ عمارہ بولی۔

”شاید تم ٹھیک کہتی ہو، ہمیں وہاں چلنا چاہیے جہاں عمارہ ڈن ہے۔“ اقبال بولا اور باہر کی جانب چل پڑا۔

”رکو! میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔“ عمارہ بولی۔

دن اور رات مل رہے تھے جب وہ وہاں پہنچے عمارہ اقبال کو لے کر سیدھا ڈاکٹر کے روم کی

طرف بڑھی، وہ سوچ رہی تھی کہ کمرہ خالی ہوگا مگر شاید کوئی سراغ مل جائے۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے تو دونوں بھونچکا رہ گئے ایک زبردست بدلو کے ہتھکے نے ان کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر فیصل اس حالت میں زمین پر پڑا تھا کہ اس کے پورے جسم پر زخم تھے اور دونوں ہاتھوں میں کیل تھکے ہوئے تھے وہ حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا وہ زندہ تھا اگر سانس لینے کا نام زندگی ہے تو۔

”ڈاکٹر فیصل۔“ عمارہ بے اختیار آگے بڑھی۔ ”چلی جاؤ، خدا را چلی جاؤ، ورنہ وہ ظالم تمہیں بھی مار دے گی۔“ ڈاکٹر فیصل کراہا۔

”ظالم کون تھا؟ وہ جو اسی اسپتال میں اڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی، مگر اس کا آپریشن اس وجہ سے نہیں ہو سکا کہ اس وقت ہمارے پاس پیسے نہیں تھے، تم نے ایک امیر کے آپریشن کے لئے پیسے لئے تھے جو کہ بعد میں بھی ہو سکتا تھا۔“ اقبال بے ساختہ ہٹ پڑا۔

”جوان ان چند دنوں میں، میں اذیت کی حدود کو کھینچ دیکھ کر کچھ گیا ہوں کہ درد میں تڑپنا کسے کہتے ہیں دم، مجھے معاف کر دو۔“

”مجھے سے معافی مانگنے کا کیا فائدہ معافی مانگنی ہے تو اس معصوم سے مانگو جس کے دامن میں ہزاروں خوشیاں تھیں، جب وہ گھر سے نکلی زندگی نے دردناک موت کے علاوہ کچھ نہ دیا۔“ اقبال نے کہا۔

عمارہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ ”اقبال ڈیڑھ گھنٹہ عمارہ کی قبر پر لے چلو۔ شاید عمارہ کی روح کو سکون مل سکے، اپنے مجرم کی معافی سے۔“

”پلیز! میں ایک بار معافی مانگتا چاہتا ہوں عمارہ سے!“ ڈاکٹر بولا۔

دونوں نے اوزاروں میں سے پلاس ڈھونڈ کر نکالا اور ڈاکٹر کی تھیلیوں میں چبھے ہوئے کیل کھینچ کر نکال دیئے۔ پھر اقبال اور عمارہ نے اسے اٹھایا اور باہر کی طرف بڑھے وہ دروازے کے پاس پہنچے تھے

کہ کہیں سے ایک زبردست چھکارا ہوا سانپ نکلا اور ڈاکٹر فیصل کے سسکتے ہوئے وجود کو ڈس کر غائب ہو گیا۔

”شاید قدرت اسے اتنی بھی مہلت نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ عمارہ کی قبر پر جا کر معافی مانگ سکتا۔“ اقبال بولا۔

اقبال عمارہ کے ساتھ عمارہ کی قبر کے پاس گیا۔ قبر اتنی ہی تازہ لگ رہی تھی جیسے ابھی کھودی گئی ہو۔

وہ دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور اپنا سر قبر کے سرہانے اس طرح رکھ دیا جیسے عمارہ کے سر کے ساتھ اپنا سر لگا دیا ہو اور دھیرے دھیرے کہنے لگا ”پیسے کی ہوس بہت بڑی بلا ہے کسی کو بھی لا لچی بنا سکتی ہے، عمارہ میں جانتا ہوں تم مجھے سن رہی ہو! عمارہ محبت کو نفرت پر غالب مت آنے دو! میں سکون لے گا، تمہیں بھی اور شاید مجھے بھی۔“

”اقبال کی دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اٹھ آیا۔ اس کے آنسو گرے رہے اور قبر کی مٹی میں جذب ہوتے رہے اقبال بے سدھ ہو کر اپنا سر قبر پر رکھے ہوئے تھا اور قریب بیٹھی عمارہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

اچانک اقبال نے اپنے سر پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا وہ ہاتھ بہت ہی نرم و نازک تھا، اس ہاتھ نے کئی مرتبہ اقبال کے سر پر ہتھکی دی اور پھر جیسے اقبال کو ہوش آ گیا اب اس کا دل بہت مطمئن تھا۔

آج شہر کی آبادی پھلتے پھلتے وہاں تک پہنچ چکی ہے مگر اب وہاں کسی بھی روح کا وجود نہیں ہے۔ اسپتال کو اسکول میں تبدیل کر دیا گیا ہے مگر وہ قبر آج بھی وہیں موجود ہے۔ بچے پوچھتے ہیں تو بائیں ان کو مطمئن کرنے کے لئے طرح طرح کی کہانیاں اس قبر کے متعلق سنا دیتی ہیں۔



خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے مثلاًشی لوگوں کے لئے اچھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تحریر انگیز کہانی

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے نہ جانے کیوں میرے ذہن سے ایک لہری گزرتی، مجھے ایک لمحے کے لئے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ تلواروں کی کلنگ، انسانوں کے شور کی آوازیں، ناقابل فہم نعرے، ناقابل فہم کام۔

”جی صوفی کی آواز ابھری۔“ نشاء جان۔

”جی۔۔۔۔۔“ میں چونک پڑی، اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی عسکری ہمارے پاس پہنچ گیا۔

”ہیلو خواتین۔ آپ کو خوش دیکھ کر مجھے خوش ہو رہی ہے۔“

”آپ کو خوش نہیں ہے؟“

”مجھے۔۔۔۔۔“ عسکری نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور خاموش ہو گیا میرے دل میں نفرت کی ایک لہر اٹھی تھی اس کا انداز مجھے سخت ناگوار گزرا۔ پہلے یہ مشکل سے ہی اس سے گفتگو کرتا ہوگا ادا کر کہیں کا۔ صوفی نے صورت حال سنہال لی شاید اسے میری کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

”کوئی خاص خبر مسٹر عسکری۔“

”ابھی کوئی نہیں۔“

”میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔“

میرے اچانک الفاظ اور سنجیدگی نے نہ صرف عسکری بلکہ صوفی کو بھی چونکا دیا۔ اس نے مجھے دیکھا پھر جلدی سے بولی۔

”اوہ تم بات کرو۔“ اس نے کہا اور وہاں سے دوڑ چلی گئی۔ عسکری کسی قدر تعجب سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

پھر اس نے حلق صاف کر کے کہا۔

”جی مس نشاء۔“

”مسٹر واثاق نے آپ کو مجھ سے ملاقات کے بارے میں بتایا۔“

”ملاقات۔۔۔۔۔؟ یہاں۔۔۔۔۔ جہاز پر؟“

”اس کا مطلب ہے کہ نہیں۔“

”خدا کی قسم بالکل نہیں۔ لیکن کب۔۔۔۔۔ کہاں؟“

میں نے اسے اس ملاقات کے بارے میں تفصیل بتائی۔ احمد چندی اور عدنان ثانی کے بارے میں سن کر وہ دنگ رہ گیا۔ کچھ دیر تک وہ حیرت میں ڈوبا رہا، پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر ٹھہرا۔

”تم مجھ پر یقین کر سکو گی نشاء۔“

”ہولو۔“

”مجھے بالکل نہیں معلوم، لیکن کچھ نئے خیالات۔“

میرے ذہن میں آرہے ہیں یعنی احمد چندی اتنا کمزور

نہیں ہے بس وہ اتفاق کا شکار ہو گیا تھا اگر روشاں نے سچ بولا ہے تو اس سے زیادہ خوفناک بات اور کوئی نہیں ہے۔

”کیا مطلب؟“

”اُسے کے ہمدانی کا جو حشر ہوا۔ میرے خدا۔“

”روشاں نے آپ کو کچھ بھی نہیں بتایا۔“

”اب میں تم سے جھوٹ نہیں بولتا۔“

”اب۔۔۔ میرا بچہ خود بخود وطن پر ہو گیا۔“

”ہاں۔۔۔ اسے۔۔۔ عسکری تلخ لہجے میں بولا۔“

”پچھلی رات کے بعد سے ملے ہو اس سے۔“

”نہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔ اس نے کبھی مجھ سے احرجینی کا تذکرہ نہیں کیا۔ ویسے نشاء۔ میرے ساتھ بہت برا ہوا ہے اسے کہتے ہیں کہ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔“

”مطلب؟“ میں نے طنزیہ کہا۔

”تمہاری نفرت بجا ہے لیکن ایک درخواست ضرور کروں گا۔ اس نفرت کے باوجود تم مجھے ہر کام کے لئے استعمال کر سکتی ہو۔“

”میں گہری سانسیں لیتی رہی پھر میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔ ”پہلے بتاؤ۔۔۔ اب میں کیا کرو۔“

”کس سلسلے میں؟“ وہ بولا۔

”کیا میں روشاں سے ملوں؟“

”مسٹر ڈیزل سے مشورہ کیا۔“

”نہیں۔۔۔ روشاں نے منع کیا تھا۔“

”تم نے مجھے اس بارے میں کیوں بتایا۔“

”خوش فہمی کا شکار نہ ہو۔ بتاؤ کیا کروں۔“

”میرا خیال ہے اس سے رابطہ رکھو۔ اتنا میں ماننا ہوں کہ وہ مجھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا۔

مارشل پرسکون تھا، سرشام پانچ بجے میں روشاں کے کیمین کی طرف چل پڑی، پہلی بار اس پر اسرار ترین شخصیت کے پاس خود چل کر جا رہی تھی۔ ہزاروں دوسرے بے شمار پریشان کن خیالات ہمسفر تھے لیکن کچھ امیدیں بھی تھیں۔ شاید کچھ اور انکشافات ہوں۔ شاید مجھے میرے تارک یک وجود کا کچھ پتہ چلے۔

روشاں کا کیمین سامنے آیا تو دل کی دھڑکن ہو گئی۔ بمشکل تم کیمین کے دروازے پر دستک دی چڑھو لٹھوں کے بعد دروازہ کھلا اور روشاں کا سر وہ چہرہ نظر آیا مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں پیدا ہوا۔

”نہ سناٹ لہجے میں کہا۔ ”آؤ۔“ اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔

میں دروازے سے اندر داخل ہوئی تو اس نے کہا۔ ”دروازہ بند کر دو۔“ میں نے خاموشی سے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔

وہ آگے بڑھ کر بستر پر جا بیٹھا۔ پھر ایک دم کوئی چیز بستر کے بڑے ٹکے کے پیچھے سے نمودار ہوئی اور ایک چھلانگ مار کر اس کے کھلے ہوئے روشندان پر چڑھ کر مڑ گئی۔ میں نے اس خوفناک قاتل بلی کو دیکھ لیا تھا۔ لیکن روشاں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

”بٹھو۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”شکریہ۔“ ایک دم میرا بچہ بھی خشک ہو گیا۔

”بہت غور کیا تم نے مجھ سے ملاقات کے سلسلے میں۔“

”ہاں۔ کیوں نہیں۔“

”مشورے بھی کئے ہوں گے کسی سے۔“

”یہ آپ کو بتانا ضروری ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”ہاں۔ میں نے منع کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نے بھی وعدہ کیا تھا۔“

”یعنی۔“

”کسی کو نہ بتانے کا۔“

”اوہ۔ شکریہ۔ میں نے یہ بھی کہا تھا تم سے کہ اگر تمہاری عقل میری سچائی قبول کرے تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

میں نے ایک گہری نگاہ روشاں پر ڈالی۔ اس شخصیت کی ایک تاریخ تھی میں نہیں جانتی تھی کہ مائیکل جون اور امیر انکسناں سے اس کا تعلق کہاں ہے ہوا تھا، البتہ یہ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ ان کا تینوں کا سفر

ایک کی پہاڑیوں کی تلاش میں تھا جہاں ایک خزانہ دفن تھا اور جس کا تعلق ایک پراسرار تہذیب سے تھا جہاں۔ بعد کے خواب بھی میرے ذہن میں تھے جن میں ایک انوکھی داستان پوشیدہ تھی، نزائندہ کی داستان اور نزائندہ۔۔۔۔۔۔ یہاں آکر میں حیرتزدہ ہو جاتی تھی میرے ذہن ہواؤں میں اڑنے لگتا تھا۔

پھر ایک دم ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ روشاں پر نگاہ پڑی۔ وہ بڑے عجیب سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

میں مستفصل گئی۔ میری آنکھوں میں نفرت ابھرائی۔ میں نے بیزارانی سے کہا۔ ”اگر آپ کا خیال ہے سر روشاں کہ میں آپ کو دنیا کا سچا انسان سمجھ کر آپ کے پاس آئی ہوں تو میں یہ جھوٹ نہیں بولوں گی۔“

”ہوں۔“ آگے بولا۔ اس نے سکون سے کہا۔

”میں جن حالات سے گزر رہی ہوں۔ ان میں ذہن مجھے کسی پر اعتماد ہے نہ میں کسی سے مدد کی توقع رکھتی ہوں۔ لیکن میں تنکے کا سہارا تلاش کر رہی ہوں۔ جہاں سے بھی میری مشکل کا حل مل جائے۔“

”پاکل ٹھیک۔ سبھی ہوئی بات ہے۔ مجھے پسند آئی۔“ روشاں بولا۔

”مسٹر سکون ڈیزل بھی مجھ سے تعاون کر رہے ہیں۔ لازمی بات ہے کہ انہوں نے بھی مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ سب کا ایک ہی رویہ ہے۔ کوئی میری مدد پر آمادہ نہیں ہے۔“ میری آواز رندھ گئی۔

”احرجیدی سے ملیں۔“

”نہیں۔“

”ڈیزل کو میرے بارے میں بتایا۔“

”نہیں۔“ میں نے بے اختیار کہا۔

”انہی ساتھی لوگوں کو۔“

”کسی کو بھی نہیں۔۔۔۔۔۔ اور اگر تم چاہو مسٹر روشاں اس کی بجائے پوچھ سکتے ہو۔“

”بتاؤ۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”بس ایک امید ہے ایک آس ہے اس خیال کی کہ شاید آپ میرے لئے کارآمد ثابت ہو سکیں، اگر میری

مشکل کا حل آپ کے پاس سے مل جائے تو آپ سے زیادہ عزیز مجھے اور کوئی نہیں ہو سکتا، ورنہ سب ایک ہی جیسے ہیں میرے لئے سب ایک ہی جیسے ہیں۔“

روشاں پر خیال انداز میں میری آنکھوں میں دیکھا رہا، لیکن اس وقت ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی تھی مجھے یہ ان الفاظ کو یاد کرتے ہوئے شاید ان میں سچائی بھی تھی وہ میری آنکھوں سے میرے ذہن کا جائزہ نہیں لے سکا اور بولا۔

”خیر میں تمہاری باتوں سے مطمئن ہوں اور اب تمہیں میرے چند سوالات کے جواب دینا ہوں گے۔“

”اور میرے سوالات کے جوابات؟“ میں نے حیکمے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد میں تمہارے سوالات کے جواب دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”مجھے اپنے بچپن کی تفصیل بتاؤ۔“ وہ بولا

”اوں میرے ذہن کے خانے کھل گئے، میں نے کہا۔

”ایک خوبصورت کوشی میں زندگی گزاری جسے تم دیکھ چکے ہو مسٹر روشاں، مائیکل جون اور امیر انکسناں کے ساتھ وہاں صرف ملازم تھے جو مجھے ہاتھوں میں رکھتے تھے میری ہر بات کو پورا کیا جاتا تھا، انہی ملازموں میں سے ایک کو میری ماں کا درجہ دیا گیا کیونکہ ماں کی سچ تفصیل میرے علم میں نہیں تھی۔ وہ مر گئی اور مجھے یہی علم ہوا کہ میری ماں مر گئی اور اس کے بعد مسٹر ہارون دانش نے میری پرورش کی اور جب مجھے ہوش آیا تو کوئی تصور بھی نہیں تھا میرے ذہن میں کہ ہارون دانش میرے باپ نہیں ہیں یا وہ عورت میری ماں نہیں تھی جس نے مجھے ماؤں کی طرح پرورش کیا، ہارون دانش مجھے اپنے ساتھ مصروف رکھتے تھے، وہ ماہر آثار قدیمہ تھے اور میں بھی ان کے قدم بہ قدم انہی راستوں پر آگے بڑھ رہی تھی کہ کارچوک کی پہاڑیوں میں ایک مردہ تہذیب کے آثار تلاش کرنے کے لئے آپ لوگوں نے ہارون دانش کو مجبور کیا اور اس کے بعد کے حالات آپ کو معلوم

ہیں کہ کیا ہوا۔

”یہ بات تمہیں کس نے بتائی کہ ہارون دانش تمہارے باپ نہیں ہیں، چلو ماں کے بارے میں میں مان لیتا ہوں۔“ روشاں نے سوال کیا۔

”وقت نے، حالات نے، میں ہوش کی دنیا میں آئی تو مجھے احساس ہوا کہ نہ میری ماں ہے اور نہ باپ، باپ کے نو اور خانے میں نبھانے کیا کیا موجود تھا، میرے ذہن میں یہ تجسس جاگا کہ آخر میرے ماں باپ ہیں کون؟ ملازموں کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا، تنہا میں ہارون دانش غائب ہو گئے اور میں ان کی تلاش میں بھٹکتی رہی، مجھے جگہ جگہ سے یہ شواہد ملے کہ وہ زندہ ہیں، لیکن میں نے انہیں زندہ نہیں دیکھا۔“

میں بڑی ذہانت سے روشاں کو تفصیل بتا رہی تھی، میرے لہجے میں جذباتی کیفیت بھی تھی لیکن میں نے دانش سندی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا اور روشاں کو صرف اتنا بتا رہی تھی جتنا میرے لئے ممکن یا مناسب تھا۔ وہ خاموشی سے میری صورت دیکھتا رہا جیسے حالات کا اندازہ لگا رہا ہو، میں نے کہا۔

”ملازم مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکے، حالانکہ میں نے ان پر بے پناہ سختیاں کیں، لیکن کسی بد بخت نے مجھے کچھ نہیں بتایا، مسٹر روشاں بہت سے ایسے مرحلے آئے جب میں نے اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنے کے بارے میں سوچا لیکن حقیقت یہی ہے کہ شاید موت بھی مجھے قبول نہ کرے، وہ عورت جس نے میری پرورش کی اس سے زیادہ مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا بے شک یہ سب کچھ ہے لیکن مجھ پر جنون طاری ہو گیا، میں اپنے ماں باپ کی تلاش میں ہوں اور وہ کوشش کر رہی ہوں جس سے مجھے اپنے ماں باپ کا پتہ چل سکے، میرا منہ نہیں کیا ہے، میرا باپ کون ہے، میری ماں کون تھی؟ میں یہ سب جاننا چاہتی ہوں، مجھے کوئی ذریعہ حاصل نہیں ہوا اور اس کے بعد اصرار جنیدی، عدنان ثنائی اور نجاب نے کون کون مجھے ملا، مجھے عسکری بھی ملا جس سے کچھ ٹھوس کے لئے میں متاثر ہوئی ایک عورت کی

حیثیت سے لیکن وہ ایک تنگ حرام اور چھوٹا آدمی ہے میں اب تک نہیں جانتی کہ سب کچھ کیا ہے مسٹر روشاں سب کچھ میرے لئے قابل فہم ہے۔ اصرار جنیدی نے مجھ سے ملاقات کی اور مجھے انوکھی تفصیلات بتائیں، آپ جانتے ہیں تو میں آپ کو اس کے بارے میں بھی بتا سکتی ہوں لیکن اس سے بھی مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا اور میں مسلسل تاریکی میں رہی، سمجھ رہے ہیں، نا، آپ، ایک بار مجھے معلوم ہوا کہ میری جائیداد وغیرہ کی نگرانی ایک ایڈووکیٹ اے کے ہمدانی کرتے ہیں، میں نے ضد کر کے ان سے ملاقات کی، اے کے ہمدانی نے مجھے بتایا کہ میرے لئے میرے والد کا وصیت نامہ موجود ہے، لیکن پھر اے کے ہمدانی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بھی یقینی طور پر آپ کے علم میں ہوگا، انتہائی بری حالت میں ہونے کے باوجود انہوں نے ایک نام کا غدر لکھا یہ ایک عمارت کا نام تھا اور جب میں اس عمارت میں اے کے ہمدانی کی سیکرٹری کے ساتھ داخل ہوئی تو وہاں مجھے تابوت نظر آئے جن میں دو مہیاں موجود تھیں۔ جن کے چہرے تک کپڑے کی بیٹیوں میں لپٹے ہوئے تھے، میں کچھ نہیں سمجھ پائی تھی آج تک میں کچھ نہیں سمجھ پائی۔ میرے ایک ملازم نے مجھے بتایا کہ میرے والد نے میرے لئے ہدایت کی ہے کہ میں انجین چلی جاؤں اور وہاں جا کر مسٹر وسکن ڈیزل سے ملوں، میں نہیں جانتی کہ وہ اس بارے میں کیا جانتے ہیں، خیر میں یہاں آ گئی اور انہوں نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا، جب میں نے ان سے ضد کر کے یہ کہا کہ آخر میرے والد کون ہیں، کہاں ہیں اور یہ ساری کہانی کیا ہے؟ تو انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو مجھے دوسروں سے ملتا رہا تھا، انہوں نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں اور جو معلومات حاصل ہوں گی وہ مجھے ضرور بتائیں گے کہ ہمیں اس کے لئے الجھناڑ چلنا ہوگا، میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھی، لیکن کیا کرتی میرے پاس کرنے کے لئے اور کچھ تھا ہی نہیں، میں ہزار ہوں تھی زندگی سے، ہمدانی جہاز بیکار ہو گیا تھا، آپ یقیناً کیجیے مسٹر روشاں مجھے نہ موت سے دلچسپی ہے نہ زندگی

میں جس شخص کو اپنے بارے میں کچھ نہ معلوم ہوا ہے زندگی کا کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے، میں اپنے بارے میں ہدایت رہنے کے بجائے مرجانا پسند کرتی ہوں، ہمارا گھر آپ سے کوئی مجھے موت سے خوف زدہ کرنا چاہے تو آپ کو انتہائی ناموسی ہوگی، بس میری زندگی کی یہ ایک خواہش ہے کہ مجھے صرف ایک بات یہ ہدایتی بات ہے کہ میں کون ہوں، میں کون ہوں اور میرا قصہ کیا ہے؟ اس کے بعد اگر وہ مجھے قتل کرنا چاہیں تو میں اپنی سرنے کو تیار ہوں، سنے مسٹر روشاں! آپ لوگ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، میں اسی طرح کا جنون اپنے ذہن میں رکھتی ہوں، نہ مجھے اپنی جوانی کا احساس ہے اور نہ مجھے عشق و محبت سے دلچسپی ہے، میں تو اپنی ذات میں بھٹکتی ہوئی ایک آوارہ روح ہوں، میری روح دیران ہے مسٹر روشاں! میں آپ سے صرف اس شکل میں خدائون کر سکتی ہوں کہ آپ مجھے میرے بارے میں بتا دیں، آپ کی جگہ کوئی بھی شخص ہو میں اسے اپنی زندگی ختم کر سکتی ہوں، بس میری موت سے پہلے مجھ پر یہ انکشاف کر دے کہ آخر میں ہوں، کیا؟ اگر ہارون دانش زندہ ہیں تو کہاں ہیں؟ میں ہر چیز کو کفر کی نگاہ سے دیکھتی ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ ہارون دانش کس محبت کا شکار ہیں، سمجھ رہے ہیں آپ یہ ہے پوری تفصیل اور میں نے آپ کو جو کچھ بتا دیا ہے، اب مجھ سے اس کے بارے میں ایک بھی سوال نہیں کریں گے آپ، بس صرف آپ فیصلہ یہ کریں کہ کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟

”تمہیں بے بسی ابھی نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مجھ سے کچھ سوال مت کرنا، ابھی میرے حالات پورے نہیں ہوئے، کچھ اور سوالوں کے جواب چاہئے مجھے۔“ روشاں بڑی بے رحمی سے بولا۔

”جی فرمائیے۔“

”اس گھر میں جہاں تم گئی تھیں میرا مطلب ہے اچھا چھوڑو اس سے پہلے کی بات کرو جب میں نے تمہیں

پہلی ملاقات میں اس مکان میں بھیجا تھا وہاں کیا واقعات پیش آئے۔“

میں نے جواب میں پورا واقعہ دہرایا جو کچھ تھا، روشاں نے گردن ہلائی پھر بولا، ”اور تمہیں یہ کس نے بتایا کہ اس عمارت میں جو تابوت رکھے ہوئے ہیں ان کا تعلق تمہارے باپ سے تھا۔“

میں پوری ذہانت سے سب کچھ بتا رہی تھی میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہاں میں نے مسٹر ہارون دانش کی آواز سنی تھی اور انہیں کس عالم میں دیکھا تھا بلکہ میں نے کہا۔

”میرے ملازم نے مجھے یہ بات بتائی تھی جب اس نے مجھے اے کے ہمدانی کی بے ہدایت بتائی جس کے تحت اس نے مجھے اتھین بھیجا تھا تو اس نے کہا کہ وہ تابوت میرے ماں باپ کے تھے۔“

”اور تم نے اسے مان لیا؟“

”میں نہیں جانتی کہ وہ سب کچھ کیا تھا، آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیا ماننا تھا اور کیا نہیں ماننا تھا۔“

”اچھا ایک بات اور بتاؤ، تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ وہ تابوت اس جہاز کے تہہ خانے میں ہیں، کیا تمہیں اس شخص نے بتایا تھا جس کا نام البر ونوس تھا؟“

”نہیں میں نہیں جانتی کہ وہ کون تھا۔ یہ بات مجھے وسکن ڈیزل نے ہی بتائی تھی کہ جہاز کے مال خانے میں وہ تابوت موجود ہیں۔ میں نے جب پہلی بار ان تابوتوں کو دیکھا تو فوراً پہچان لیا یہ وہی تابوت تھے جو اس عمارت میں مجھے ملے تھے۔“

”تم البر ونوس کو نہیں جانتی؟“

”نہیں۔“

”پہلے بھی اسے دیکھا۔“

”میں نے کہا نا کہ میں نے اسے بعد میں بھی نہیں دیکھا بلکہ جب جہاز کا حادثہ ہوا تو مجھے علم ہوا کہ ان تابوتوں پر البر ونوس کی لاش بڑی ہوئی پائی گئی ہے۔“

”اور یہ بات بھی تمہیں وسکن ڈیزل ہی نے

بتائی ہوگی۔“

”ہاں۔“

”اس کے علاوہ کوئی بات جو میری رہنمائی تمہاری مشکل کی سمت کر سکے، اب میں پورے خلوص سے تم سے یہ بات کہہ رہا ہوں فی الوقت یہ صرف الفاظ ہیں لیکن آنے والا وقت تمہیں اس حقیقت سے روشناس کرائے گا کہ ان الفاظ میں سچائی ہے، میں تمہاری بھرپور مدد کرنے کے لئے تیار ہوں، تم ڈیزل سے رابطہ رکھو یا دنیا کے کسی بھی فرد سے بھی، میں تمہارا ہمدرد تمہارا غمگسار رہوں گا اور تمہارے لئے سب کچھ کروں گا، لیکن تم اپنے ذہن میں چھپی ہوئی ہر وہ بات مجھے بتا دو جو میری سچ سمجھ رہنمائی کر سکے۔“

”میرے علم میں جو کچھ تھا میں نے آپ کو بتا دیا مسٹر روشاق، اور اب میں آپ کے ان الفاظ کا ثبوت چاہتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے اب تم مجھے بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں میرے لئے کیا سوالات اٹھتے ہیں؟“

”آپ کون ہیں مسٹر روشاق؟“ میں نے سوال کیا۔

”ایک محقق، مصر کی قدیم تاریخ سے جنون کی حد تک عشق رکھنے والا، میں نے تاریخ مصر کے ایسے پوشیدہ گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے جن تک کسی اور کی نگاہ نہیں پہنچ سکی، یوں سمجھ لو کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ شاید میں فرعون کے دور کی کوئی روح ہوں جسے دوبارہ انسانی شکل میں زندگی دے دی گئی ہے تو غلط نہیں ہوگا، مصر کی قدیم تاریخ کا اگر تم نے مطالعہ کیا ہے میرا مطلب ہے ہارون دانش کے حوالے سے تو یہ سمجھ لو میں بھی وہ ”کا“ ہوں جس کی تشکیل دوبارہ اس کائنات میں کی گئی ہے اور میری روح واپس ایک انسانی جسم میں آگئی ہے، مجھے تاریخ مصر سے دیوانگی کی حد تک عشق ہے، مسٹر ہارون دانش وہ دوسرے انسان تھے جنہوں نے مصر کی تاریخ کے ایسے ایسے پراسرار باب وریافت کئے جو بڑے بڑے محققوں کے علم میں نہیں ہیں، لیکن

میں نہیں جانتا کہ پھر کیا ہو، یہ بہت زیادہ پرانی بات نہیں ہے، لیکن اس پرانی بات کو اپنی عمر سے منسلک نہ کر، تمہاری عمر تمہاری عمر.....“ اس نے جملہ اوجھڑا چھوڑ دیا۔ پھر بولا۔

”ہارون دانش نے تاریخ مصر پر ایسی ایسی انوکھی تحقیقات کا انکشاف کیا ہے جس نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا، ان کی کچھ کتابیں اور مسودے پراسرار طریقے سے غائب ہو گئے وہ کتابیں شائع نہیں ہوئی تھیں، ان مسودوں میں مصر کی چھ ہزار سالہ تحقیق کے ایسے ایسے نوکے باب تھے کہ اگر وہ دنیا کے سامنے آجائے تو مصر کے اہل علم کے بارے میں ہزاروں محققین نے جو اپنی اپنی داستانیں لکھی ہیں لیکن اگر کوئی یہ انکشاف کرے کہ قدیم مصری دور کے کچھ مدفنوں اجسام زندگی پا کر، ایک محقق کے ساتھ تاریخ مصر پر تحقیقات کر رہے ہیں اور اس سے بحث کر رہے ہیں تو کیا اس حقیقت کی سچائی پر غور کیا جاسکتا ہے، یا تو اس شخص کو جھوٹا سمجھا جائے یا پھر اس داستان کو دنیا کی سب سے زیادہ پراسرار داستان، لیکن جو شاسا ہیں جو ان حوالوں کو جانتے ہیں جو ہارون دانش نے دیئے اور یہ حوالے دورِ فرعون کا کوئی شخص ہی دے سکتا ہے اس کے بعد وہ تیونس میں گم ہو گیا، نجانے کسے کسے اس کی تلاش تھی، نجانے کون کون اس کے لئے سرگرداں ہے میں بھی انہی میں سے ایک ہوں اور گمشدہ ہارون دانش کے وجود کے بارے میں کوئی پتہ نہیں چلتا کہ وہ تاریخ کا کوئی ایسا ہی فرد ہے جو ہزاروں سال پرانی تاریخ سے گزر کر اس دنیا تک آچکا ہے، یا پھر کوئی اور لیکن ہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا میں اس کی اولاد زندہ ہے، اور کون کون ہے جو اس تاریخ کو جاننے کے لئے دیوانہ ہیں ہو جائے گا اور لڑکی تم نے مجھ سے میرے بارے میں سوال پوچھا میں نے تمہیں بتا دیا کہ میں کون ہوں، لیکن تم کائنات کی اس تاریخ کا سب سے انوکھا باب ہو، سمجھیں اگر پڑھ لیا جائے تو جانے کیسے کیسے انکشافات ہوں، سمجھیں تم.....“ وہ خاموش ہو گیا، اس کی گردن کی رگیں چوٹی رہی تھیں، خون سے عاری چہرہ اس وقت کچھ عجیب سی

تھیں کا شکار ہو رہا تھا جنہیں کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا، بس یوں لگ رہا تھا کہ وہ حد پر جوش ہے، وہ پھر بولا۔

”اور سب سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ ہارون دانش زندہ ہے، وہ فنا نہیں ہوا روپوش ہے، اگر وہ کسی مشکل کا شکار ہے تو تم یقین کرنا اس نے بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے وہ اس مشکل میں کسی کا بھی ساتھ حاصل کر سکتا تھا اور جو شخص اس کے لئے سب سے زیادہ کارآمد ہوتا وہ میں ہوں، میں.....“

”آپ.....“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ہاں۔ وہ مجھے ایک بار مل جائے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ یقین کرو بے بی میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ تعاون کرے، اگر وہ چاہے تو مجھے اپنی تحویل میں لے لے اور تاریخ کے سربلست راز کی نقاب کشائی کرے، بڑی ساری کہانی انہی واقعات کے گرد گھومتی ہے، میں خود بھی اپنے آپ کو تاریخ میں تلاش کرنا چاہتا ہوں، کچھ رہی ہو نام، میں نے جو کچھ تم سے کہا ہے اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں ہے۔“

وہ خاموش ہو گیا اور میں بھی خاموشی سے اسے دیکھنے لگی، نجانے کیوں مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ سچ بول رہا ہو اور اس وقت میں خود بھی جذباتی ہو گئی تھی۔ کوئی خاص جھوٹ نہیں بولا تھا میں نے اس سے، بس کچھ باتیں چھپا رکھی تھیں، جو وہی دیرینک خاموشی طاری رہی پھر میں نے کہا۔

”آپ میرے لئے کیا کر سکتے ہیں مسٹر روشاق؟“

”کچھ بھی نہیں، ہاں ایک پیشکش کر سکتا ہوں نہیں۔“

”کیا؟“

”کسی بھی طور پر تمہیں کسی بھی شکل میں ہارون دانش کا کوئی نشان مل جائے تو میرا ایک پیغام اسے ضرور سنائی دے گا۔“

”کیا؟“ میں نے سوال کیا۔

”اس سے کہنا کہ سچ کو ڈوبنے والے آخری ستارے کی قسم روشاق تجھ سے غیر خالص نہیں ہے، بس وہ بھی تیرے ساتھ اس دور کی تلاش میں جانا چاہتا ہے، جہاں خود اس کا بھی وجود ملتا ہے، وہ خود بھی شاید اپنی تاریخ میں کوئی جھکا ہوا کردار ہے۔“

”تمہارے خیال میں مسٹر ہارون دانش مجھ سے ملیں گے؟“ میرے لہجے میں خود بخود ایک حسرت بیدار ہو گئی۔

”یقیناً..... شاید کوئی ایسا لمحہ آجائے جب اس کا تم سے ملنا ضروری ہو جائے، ایک بار ایک بار وہ مجھ سے مل لے صرف ایک بار میری بات سن لے آج تک اسی کوشش میں مصروف ہوں، اور لڑکی تیرا موجودہ نام یہی ہے ناشا..... یہی ہے ناں؟.....؟“

”کیا مطلب؟“

”میں تجھ سے ایک سوال کر رہا ہوں، اس کا مجھے جواب دے۔ تیرا نام ناشا ہی ہے نا۔“

”ہاں..... لیکن اب تم مجھے یہ بھی بتاؤ گے کہ کیا میرا کوئی اور نام بھی تھا۔“

”نہیں، ابھی اس سلسلے میں مجھ سے کچھ مت پوچھ۔“

”تو پھر۔“

”بس میں تجھ سے یہی کہتا ہوں ناشا کہ مجھ سے پوشیدہ ہونے کی کوشش نہ کرنا اور اگر کسی نے تجھے مجھ سے چھپانے کی کوشش کی تو سڑنے والی چھ ہزار لاشوں کی قسم اس کی ناکا زندہ دار میں ہوں گا صرف میں۔“

”مجھ سے آپ کی کیا دلچسپی ہے مسٹر روشاق؟“

”ارے میں نے تجھے بتا دیا کہ تو تاریخ کے ہزاروں سالوں کے پیچھے چھپی ہوئی ایک انوکھی تخلیق ہے، ایک انوکھا راز، میں چاہتا ہوں کہ جب تو منکشف ہو تو سب سے پہلے تجھے میرا قلم تحریر کرے۔“ روشاق کھوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اور تم نے جو قسمیں کھائی ہیں ان کا کیا مطلب

ہے، صبح کا آخری ستارہ اور نجانے کون کون سے نام، یہ سب کیا ہے مسٹر روشاق، آپ کا مسلک آپ کا مذہب کیا ہے؟

”رک جا ایک لمحے کے لئے رک جا ایک لمحہ ٹھہر۔“ روشاق نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا، اس نے اپنے سامنے رکھے سامان سے ایک کاغذ نکالا اور اسے میرے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

”لے دیکھ آئے، دیکھ کسی شکل میں اسے پہچانتی ہے۔“ میری نگاہ کاغذ پر پڑی ہوئی تصویر پر پڑی اور میں نے اسے ایک لمحے میں پہچان لیا، یہ وہی عورت تھی جو روشاق کی ہم شکل تھی اور جس نے مجھے انتہائی نفرت کے ساتھ اس مکان سے باہر نکال دیا تھا، ایک بار پھر میرے ذہن سے ایک لہری گزر گئی اور میں نے بے اختیار کہا۔

”یہ..... یہ..... سلا نویسہ ہے۔ سلا نویسہ عثمیانہ.....“ یہ الفاظ میرے من سے بے اختیار نکلے تھے اور میں ان کا مفہوم نہیں جانتی تھی، لیکن روشاق بے اختیار اچھل پڑا۔ اس کے پورے بدن پر لرزہ سا طاری ہو گیا، وہ بچنی بچنی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا اور اس کے بعد آہستہ سے بولا۔

”مگر تو اسے کیسے جانتی ہے؟“ ”ایں..... میں حیرانی سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔

”تو اسے کیسے جانتی ہے؟“ ”کسے؟“ میں نے سوال کیا اور وہ میری صورت دیکھنے لگا، پھر آہستہ سے بولا۔

”یقیناً تجھے احمد جینی نے بتایا ہوگا۔“ ”میں نہیں جانتی مجھے یاد نہیں ہے۔“ ”آہ..... تو میرا خیال ٹھیک ہے، میرے راستے بالکل صحیح ہیں۔“ روشاق نے بھی پراسرار لہجے میں کہا۔ اچانک ہی میں چونک پڑی، میں نے آہستہ سے کہا۔

”ایک بات بتائیے مسٹر روشاق، کیا یہ عورت میری ماں ہے؟“ یہ سوال بھی بے اختیار ہی میرے جگر سے نکلا تھا۔

”تیری ماں۔“ روشاق چونک کر بولا پھر چلنے سے بولا۔ ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، ایسی کوئی فیصلہ بات اپنے دل میں نہ لانا یہ تو ایک قدیم تاریخ ہے زمانہ قبل کا ایک انوکھا دور۔“

”جو اس مکان میں زندہ تھا۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”وہ فریب تھا تیرے لئے نہیں ہمارے لئے۔“ ”اپنے مذہب کے بارے میں آپ نے نہیں بتایا مسٹر روشاق۔“

”بس انسان ہوں میں اس سے آگے پیچھے کچھ نہیں، جن ناموں سے عقیدت ہے ان کی نفسیں کھالیتا ہوں۔“ روشاق نے مدہم لہجے میں کہا۔

”آپ اس سلسلے میں میری کچھ میں مدد کر سکتے ہیں مسٹر روشاق۔“

”میں.....!“ یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں میں اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ سو گیا ہو۔

”مسٹر روشاق۔“ آخر کار میں نے اسے پکارا لیکن وہ پھر بھی نہ چونکا اس وقت ایک اور پراسرار واقعہ ہوا اچانک ہی روشندان میں وہی شخص بلی نظر آئی، اس نے اپنے حلق سے ایک کڑواہ آواز نکالی اور روشاق اچھل کر پھر اس کی آواز بھری۔

”ہاں۔“ میں جاگ رہا ہوں، تیور ہماری جاگ رہا ہے سورج زادی، جاگ رہا ہے۔“ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور سکرادیا۔

”آپ سو گئے تھے مسٹر روشاق۔“ وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ پھر بولا۔ ”نہیں، میری روح مجھ سے دور چلی گئی تھی۔“ میری نگاہ روشندان کی طرف اٹھ گئی مگر بلی وہاں موجود نہیں تھی ابھی ایک گہری سانس لے کر وہ گئی پھر میں نے خود کو سنبھال

”آپ سے ایک آخری سوال کرنا چاہتی ہوں۔“

”ہاں۔“ بس آخری سوال، اور پھر واپس چلی جاؤ۔ سورج ڈوبنے کو ہے۔ میری عبادت کا وقت قریب آ رہا ہے۔“

”وہ دونوں تابوت خالی کیسے ہو گئے؟“ ”آہ، میں سچ کہہ رہا ہوں، بس نہیں جانتا میں کچھ توہوری دیر تک گئی تھی ورنہ ایک بہت بڑا عقدہ حل ہو جاتا۔“

”بس اب جائزہ کرم جا۔“ وہ مضطرب نظر آنے لگا اور میں اسے گھورتی ہوئی باہر چل پڑی لیکن جاتے ہوئے میری نگاہ روشندان کی طرف گئی۔ وہاں دو انگارہ آکھیں دکھائی تھیں خونخوار اور بھیسا کب آنکھیں۔

”کیون کے باہر سب کچھ وہی تھا۔“ روشاق آخر کیا ہے؟ کچھ نئے نئے نقوش مجھے ایک نئے جہاں کی سیر کراتے تھے آشنائی مندر۔ اس کے اندر عبادت کرنے والے انسان۔ قدیم مصری لباس میں ملبوس، اور مندر کی فرش کا وہیں چہرہ چھپائے رکھ کر تکیا رکھا تھا۔

”دور سے عسکری نظر آیا۔“ جس نے مجھے نہیں دیکھا اس سے اس وقت بولنے کو دل نہیں چاہا ایسے میں نے اسے روشاق کے بارے میں بتا دیا تھا۔ تب میں جانے کو دل نہیں چاہا۔ میں نے عرش کا رخ کیا اور خاص طور سے ایک پرسکون گوشہ پسند کیا۔ پھر کہ جانے کتنا وقت سمندر کو کیٹھتے ہوئے گزارا۔ ذہن میں نہ جانے کیا کیا خیالات آ رہے تھے۔ وہ بھیسا کب طوفان باندھ رہی تھی نے جہاز کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا لیکن بحری قزاق بہتر نہیں انہیں تھے انہوں نے مارشل کوئی زندگی دیدی تھی

”جواب وہ پرسکون سفر کر رہا تھا۔“ پھر اس وقت چونکی جب اس کی کواسے قریب دیکھا۔

”نشاء.....“ صوفی کی آواز میں بیار تھا۔

”کوہ..... سٹر۔“

”میں تمہیں بہت دیر سے دیکھ رہی تھی۔“

”اگرے ہاں ایک دم رات ہو گئی۔“ میں نے

چونک کر چاروں طرف دیکھا۔

”کھانا کھا میں۔“

”ہاں۔“ مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔

”آؤ.....“ صوفیہ نے کہا۔ ہم نے جہاز کے ریستوران میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران سسٹر نے کہا۔

”سسٹر پزل سے ملاقات ہوئی تمہاری۔“

”کب۔“

”تھوڑی بہت دیر پہلے۔“

”کوئی خاص بات۔“

”نہیں۔“ بس میرے پاس آئے تھے۔ یہ بتانے کے لئے کہ تم روشاق کے پاس گئی ہو۔“

”.....“ مجھے دیکھا ہوگا۔“

”شاید.....“

”کیا بات ہوئی؟“

”وہ ایک پراسرار انسان ہے۔ بے حد پراسرار۔ آپ یقین کریں سسٹر جب تک میں اس کے پاس رہی مجھے یوں لگتا رہا جیسے میں کسی زندہ انسان کے ساتھ نہ ہوں۔ وہ مجھے زمانہ قدیم کی کوئی بھیسا کب روح معلوم لگا ہے۔ ایک باوق الفطرت انسان۔“

”تم سے کیا کہتا ہے۔“

”وہ مجھ سے صرف اس لئے دلچسپی لے رہا ہے کہ میرے ذریعے ہارون دانش سے مل لے۔“

”ارے۔“ تم اپنے پاپا کا نام کیسے لے رہی ہو۔“

”پاپا.....“ میں نے کہا اور پھر خاموش ہو گئی۔

اس کے بعد ہم نے مزید کوئی گفتگو نہیں کی۔ اور بیٹھے ریستوران کے ماحول کا جائزہ لیتے رہے۔ انسان بھی کیا چیز ہے۔ یہ سب کتنے بڑے حادثے سے دوچار ہوتے ہیں۔ کون کون کیا کیا کھو بیٹھا ہے لیکن اس وقت وہ بالکل خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔

”طیلس.....“ صوفیہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”ہاں.....“ میں نے کہا اور کرسی کھسکا کر اٹھ گئی۔ پھر ہم دونوں کیمین میں آ گئے۔ وسکن ڈیزل اپنے کیمین میں موجود نہیں تھے۔

”.....“

”.....“

”.....“

بیڈ پر لیٹ کر صوفیہ نے کہا۔ "میرے ذہن میں تو بس ایک ہی خیال آتا ہے اگر مسٹر ہارون دانش روشاق کو قابلِ بھروسہ سمجھتے تو ہمیں اسٹین نہ بھیجتے۔ آخر کوئی بات تو ہوگی جس کی وجہ سے انہوں نے روشاق سے گریز کیا۔"

"ہاں۔۔۔ شاید۔ میں نے نیند بھری آواز میں کہا۔

"جہیں نیند آ رہی ہے سو جاؤ۔" صوفیہ نے کہا۔

میں نے کروٹ بدل لی۔

دوسری صبح انگل ڈیزل نے ہمیں جگایا تھا۔

"ہیلو گزرو۔"

"ہیلو انگل۔۔۔ ہم دونوں نے بیک وقت کہا۔

"انگل ڈیزل نے کہا۔ پھر بولے۔

سمندر کی آخری لکیر سے سورج طلوع ہوتا ہے تو ایک سحر انگیز منظر آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے تم نے یہ منظر دیکھا ہے گی۔

"نہیں انگل۔"

"دیکھا کرو۔ جب یہ مکمل ہو جائے گا تو ہم اس حسین منظر کی تمنا ہی کرتے رہیں گے۔ کیا خیال ہے۔"

"واقی۔ حسین لگتا ہوگا۔" صوفیہ نے کہا۔

"میں نے ایک مہربان نوجوان سے کہا ہے کہ وہ تین افرو کے ناشتے کا انتظام کروے۔ چنانچہ تم نہا کر عرشہ پر آ جاؤ۔"

"ہم آ رہے ہیں۔" میں نے لاشعوری سے کہا۔

اور کچھ دیر کے بعد عرشہ پر پہنچ گئے جہاں انگل ڈیزل ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ناشتے کے دوران باتیں شروع ہو گئیں انگل ڈیزل نے چائے کے بڑے بڑے سپٹے کر اپنا کپ خالی کر دیا پھر بولے۔

"یہ سچ ہے کہ روشاق کو شدت سے ہارون دانش کی تلاش ہے۔ اور وہ صرف اس وجہ سے نشاء کو نگاہ میں رکھنا چاہتا ہے لیکن دوسرا سچ یہ بھی ہے کہ اگر ہارون دانش اسے حاصل ہو جائے تو ہارون اپنا مشن کبھی پورا نہ کر سکے گا۔"

"پاپاشن۔۔۔؟" میں نے سوال کیا۔

"صوفیہ۔"

"کیا آپ اس مشن کے بارے میں جانتے ہیں۔"

"انگل۔"

"ہنکا نہ سوال ہے۔ ویسے یا تو تم مجھے بتا دیجئے۔"

"گئیں۔ پھر روشاق سے غلطی ہوگی۔"

"کیا انگل۔"

ڈیزل سوچ میں ڈوب گیا پھر اچانک بولا۔

روشاق نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم لوگ انجرائز کیوں جا رہے ہیں؟

"نہیں۔۔۔ نہیں پوچھا۔"

"شاید بھول گیا۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے دوسری ملاقات پر تم سے یہ سوال کرے۔"

"مجھے کیا جواب دینا ہے انگل۔"

"کہ تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔"

"انگل کچھ سوالات میرے ذہن میں ہیں۔"

"مجھ سے پوچھنا چاہتی ہو۔"

"جی۔۔۔۔۔"

"اس گفتگو سے متعلق ہیں۔"

"ہاں۔"

"پاپاشن۔۔۔؟" میں نے سوال کیا۔

"صوفیہ۔"

"کیا آپ اس مشن کے بارے میں جانتے ہیں۔"

"انگل۔"

"ہنکا نہ سوال ہے۔ ویسے یا تو تم مجھے بتا دیجئے۔"

"گئیں۔ پھر روشاق سے غلطی ہوگی۔"

"کیا انگل۔"

ڈیزل سوچ میں ڈوب گیا پھر اچانک بولا۔

روشاق نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم لوگ انجرائز کیوں جا رہے ہیں؟

"نہیں۔۔۔ نہیں پوچھا۔"

"شاید بھول گیا۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے دوسری ملاقات پر تم سے یہ سوال کرے۔"

"مجھے کیا جواب دینا ہے انگل۔"

"کہ تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔"

"انگل کچھ سوالات میرے ذہن میں ہیں۔"

"مجھ سے پوچھنا چاہتی ہو۔"

"جی۔۔۔۔۔"

"اس گفتگو سے متعلق ہیں۔"

"ہاں۔"

ڈیزل نے کہا اور پھر وہ وہاں سے چلا گیا۔ میں نے صوفیہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی پھر اس نے سرسراہٹ آواز میں کہا۔

"البرٹوس انگل ڈیزل کا ساتھی تھا۔"

"ہاں سسٹر۔ یہ نہیں کون کیا تھا اور کیا ہے لیکن ایک اور بات سمجھ میں آئی ہے۔"

"کیا۔۔۔۔۔"

"اسٹین میں ہمیں طویل قیام کرنا پڑا تھا۔ اس دوران وہ تابوت وہاں منگوائے گئے تھے اور یقیناً وہ دسکن ڈیزل کے کہنے پر وہاں لائے گئے تھے اور یہ کام البرٹوس نے کیا ہوگا۔"

"صوفیہ۔"

"آہ دماغ کے پرچے اڑ گئے ہیں کوئی بات جو سمجھ میں آئی ہو۔"

"اب تو تمہیں۔۔۔۔۔ بھی خوف محسوس ہونے لگا ہے نشاء۔۔۔۔۔ روشاق کیا کہہ رہا تھا تم مصر کی چھ ہزار سالہ تاریخ کا یہ اسرار باب ہو۔" صوفیہ نے کہا اور میں ہنس پڑی۔

"ہاں۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اب یہی رہ گیا ہے کہ لوگ مجھ سے خوف کھائیں۔"

مارشل بدستور سفر کر رہا تھا۔ لوگ بحری قزاق کو اپنا دیوتا مان چکے تھے۔ اس کا بے اہدا احترام کیا جا رہا تھا اس نے اصول بھی ایسے اپنائے تھے کہ جو نہ ہوتی تھی جہاز کے پرانے خلاصوں کو کچر بے کار ہونے کی حقیقت سے اقدام دیا جاتا تھا۔ وہ دوسروں کو ہدایت دیتے تھے اور دوسرے ان پر عمل کرتے تھے لیکن سب اصول پسندی زندگی کے حصول کے لئے تھی۔ مگر اس کے بارے میں اب کوئی بدلے اندازیں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس دن جہاز کے معمولات بدستور جاری تھے کہ اچانک جہاز پر سب لاؤڈا آہٹیکر جج اٹھے اور سب متوجہ ہو گئے۔

"متوجہ ہوں۔ میں آپ کا کپتان گارساں آپ

سکون

میری بالکل فکر مت کرو۔ اوکے۔" دسکن

پسندیدہ

لیکن انگل آپ کو اپنی حفاظت ضرور کرنی

پڑے گی۔

سے مخاطب ہوں مارشل کے تمام مسافروں سے درخواست کرتا ہوں کہ سب عرشے پر جمع ہو جائیں کہیں خالی کر دیے جائیں۔ ایک ایک فرد باہر آ جائے مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“

جہاز پر موجود ہر شخص کے چہرے پر سنسنی پھیل گئی مختلف کام کرتے لوگوں کے ہاتھ رک گئے لوگ ایک دوسرے کو خبر کرنے لگے۔ میں اور صوفیہ بھی اس طرف چل پڑے جہاں دوسرے لوگ جمع ہو رہے تھے۔

”سفر صوفیہ نے سرسرائی آباد میں کہا۔“
”خدا خیر کرے کہ جانے وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔“
”ایک بات پر آپ نے غور نہیں کیا سسر۔“
”کیا؟“

”اصولی طور پر تو اب احمد چندی اور عدنان ثنائی کو بھی باہر آنا پڑے گا۔“
”شاید۔“

میں خاموش ہو گئی۔ بڑی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ بھاگ بھاگ کر عرشے پر جمع ہو رہے تھے عرشے پر رش ہو گیا تھا روشنائی کی جھلک بھی نظر آتی تھی لیکن ابھی تک احمد چندی اور عدنان ثنائی نہیں نظر آئے تھے۔ میری نگاہیں ان دونوں کو تلاش کر رہی تھیں کچھ لمحوں کے بعد گارساں بھی سامنے آ گیا اس نے ہاتھ میں میٹا فون پکڑا ہوا تھا۔ ایک بلند جگہ کھڑے ہو کر اس نے جمع ہر نگاہ ڈالی پھر بولا۔

”سب آگئے دوستو! ایک اہم بات کہنا چاہتا ہوں آپ سے۔ مارشل بالکل ناکارہ ہو چکا تھا لیکن اب وہ ایک بہترین جہاز ہے اور خوش اسلوبی سے اپنی منزل پر جا رہا ہے میرا بدنامیاد فرانس کے سپاہی کے کہنے کے مطابق شیطان کا دوسرا روپ تھا اور اس کا کہنا ٹھیک ہی تھا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ٹھیک کہہ رہا ہوں میری خواہش تھی کہ آپ لوگوں کو آپ کی منزل تک پہنچا دوں۔ آج کا سفر الجبرائز اور اس سے آگے کے راستوں پر تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ الجبرائز تو نہیں جاؤں گا کیونکہ حکومت الجبرائز میرے اور میرے ساتھیوں کے

لئے موت کے پھندے تیار کئے بیٹھی ہے اس لئے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں مارشل کو کیمرون، یا نايجیریا۔ جاؤں گا۔ ان دونوں ممالک میں مجھے خطرہ نہیں تھا وہاں مجھے عزت دی جاتی لیکن۔“

وہ رکا تو بہت سے مسافر بیک وقت چیخ اٹھے۔
”لیکن کیا مسٹر گارسا۔“
”لیکن کیا کیپٹن؟“

”ٹیم نے جہاز کے انجن ٹھیک کر لئے۔ لیکن اس کے کپاس ٹھیک نہیں کر سکے وہ میری طرح ٹوٹ پھوٹ گئے۔ اور دوبارہ قابل استعمال نہیں ہو سکے۔ ہمارے پاس سمٹوں کے تین کے لئے آلات نہیں ہیں۔ میں نے اس کے لئے ستاروں کا سہارا لینے کی کوشش کی کیونکہ ہر بھی مجھے آتا ہے لیکن مجھے کچھ برسرِ ارادہ مشاہدے ہوئے ہیں۔ سمندری طوفان نے جہاز کو کسی ایسے روٹ پر ڈال دیا ہے جو عام سمندری راستوں سے ہٹا ہوا ہے آپ لوگوں کو خود بھی اندازہ ہوا ہوگا ممکن ہے آپ نے اس بارے میں بھی نہ سوچا ہو کہ اس طویل سفر کے دوران میں نگاہ کی آخری حد تک کوئی جہاز سفر کرتا ہوا نظر نہیں آتا اس سے میرے خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہمارا سفر نامعلوم سمندروں میں جاری ہے، ایک کپتان ایک جہاز والے ہونے کی حیثیت سے میں جانتا ہوں کہ ایسے لمحات میں کیا کرنا چاہیے اور وہی میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔“
لوگوں کے منہ سے بے معنی آوازیں نکلی تھیں۔ ان کے چہروں سے خوف نمودار ہو گیا تھا، گارسا نے کہا۔
”میرے پاس اس بارے میں بھی ایک تفصیل موجود ہے اور آپ لوگوں کا تعاون بھی مجھے حاصل ہے۔ اگر ایکسٹرانک کپاس ٹوٹ نہ گئے ہوتے اور انجن کی طرح دوبارہ قابل استعمال بنایا جاسکتا تو میں یقیناً ایسا کرتا اور اس وقت ہمارے لئے یہ مشکل نہ رہتی، لیکن ایسا ہو چکا ہے تاہم میرے لئے ایک بہتر پہلو یہ ہے کہ آپ لوگوں کا تعاون مجھے حاصل ہے۔ مارشل غیر محتاط طریقے سے سفر کر کے ایک ماہ سمندر میں گزار سکتا ہے اور اگر خصوصی احتیاط شروع کر دیں تو یہ عرصہ ذیل یعنی دو

ہفتا ہے۔ چنانچہ کیوں نہ ابھی سے احتیاط شروع کر دی جائے۔“
”میں اس عرصے میں ہم زمین تلاش کر لیں گے، میں اس بارے میں آپ کی رائے چاہتا ہوں۔“

اور میں ستاروں کے ماہروں کو دعوت دیتا ہوں کہ اگر وہ راستوں کے تعین میں میری مدد کریں تو میں ان پر شکر گزار ہوں گا۔“

اس بار نہیں سے کوئی آواز نہیں ابھری تو گارسا نے پھر کہا۔ ”گویا کوئی ستارہ شناس موجود نہیں ہے۔“
”بیٹھے اگر چچاؤں کو فراموش کر دیں تو ظاہر ہے مشکلات میں تو رہیں گے۔“ ایک سمت سے روشنائی کی آواز ابھری اور تمام گروہیں اس طرف گھوم گئیں، خود گارساں بھی ادھر دیکھنے لگا تھا۔ روشنائی اسے مخصوص ذیلے ڈھالے لباس میں ایک طرف کھڑا منظر ہاتھ اور پچھپ بات یہ تھی کہ اس وقت اس کی خوف ناک بلی اس کے کندھے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ گارساں نے چپکٹی بلی آواز میں کہا۔

”معزز چچا! کیا تم دوسری بار بھی میری مدد کر سکتے ہو دوسرے میں تمہیں بھولا نہیں ہوں، بس دوسرے مسافروں کو یہ احساس میں دلانا چاہتا تھا کہ تم نے مجھے آزمائش دلائی ہے اس لئے میں تمہیں خصوصی اہمیت دے رہا ہوں۔“
”حالانکہ میں اس کا حقدار ہوں۔“ روشنائی نے کہا۔

”اور اس حق کا مقروض ہوں چچا، لیکن اگر تم اس مسئلے میں کچھ کر سکو تو پھر جہاز کے تمام مسافر مقروض ہو جائیں گے۔“
”ہمیں زمین کی تلاش ہے ناں؟“
”بالکل۔“

”تو پھر میں اس فہین سراغ رساں سے مدد لیتا ہوں جو میرے کندھے پر موجود ہے اور جو بہت ہی مشکل حل کر دے گا۔“
”یہی وہی وقت روشنائی کے کندھے پر بیٹھی ہوئی بلی اپنی

جگہ سے کھڑی ہو گئی اس نے حلق سے انتہائی خوف ناک آوازیں نکالیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ لوگ ساکت کھڑے ہوئے تھے، یہ سب کچھ شہدہ گری ہی محسوس ہو رہی تھی لیکن اس شہدہ گری نے پہلے ہی حالات کا رخ بدلا تھا اور اس وقت بھی لوگ اس سے متاثر ہوئے تھے، روشنائی نے آہستہ آہستہ بلی کے کان میں کچھ کہا اور وہ روشنائی کے چہرے کو چائے لگی، پھر اس نے روشنائی کے سر پر اگلے پاؤں رکھے اور اچھل کر اس کے سر پر چڑھ گئی، اس کی گردن حیرت انگیز طور پر چاروں طرف گھوم رہی تھی۔ روشنائی اور دوسرے لوگ خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ سب پر ایک عجیب سی مثبت طاری تھی، پھر بلی کا رخ ایک سمت ہو گیا اور اس نے اپنا ایک ہاتھ سامنے کی سمت اٹھا دیا، روشنائی نے کہا۔

”تم دیکھ رہے ہو کیپٹن گارساں۔“ گارساں کے منہ سے کوئی آواز نکلی، البتہ اس کی آنکھوں میں لکڑی کی چمک تھی اور وہ روشنائی کے سر کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”کیا بلی نے کسی طرف اشارہ کیا ہے؟“
”ہاں معزز چچا اس نے ایک ہاتھ دائیں سمت اٹھایا ہے۔“
”اور تمہیں جہاز کا رخ اسی سمت کرنا ہوگا، سمجھے، تمہیں جہاز کا سمت اسی رخ کرنا ہوگا۔“
”چچا معاف کرنا جو کچھ تم کہہ رہے ہو کیا یہ سچ ہے؟“

”سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے نتیجہ کہ انسان عقل سے کام لے۔ میں کوئی شہدہ گری یا تماشا نہیں کر رہا، میں نے ایک دعویٰ کیا ہے اور تم کوشش کرو۔“
”ہوں، گویا جہاز کا رخ تبدیل کر لیا جائے۔“
”یہ تم پر منحصر ہے، اگر تم ان باتوں پر یقین کرو۔“
”نہیں چچا، اس وقت تو ہم ٹھیکے کا سہارا بھی تلاش کریں گے۔“

”ٹھیک ہے تو پھر رخ تبدیل کر لو۔“ روشنائی نے براہِ اعتماد لہجے میں کہا۔ یقیناً شاید گارساں کو بھی نہیں تھا، لیکن وہی ڈوبتے اور ٹھیکے والی مثال تھی وہ ہدایات نشر

کرنے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد جہاز کے انجن بند ہو گئے اسے کسی خاص طریقے سے رخ بدلنے کی کارروائی کی جارہی تھی۔ بہر طور وقت گزرتا رہا اور جہاز کا رخ تبدیل کیا جانے لگا۔ سب لوگ منتظر ہو گئے تھے۔ میں بھی صوفیہ کے ساتھ کینبن میں واپس آ گئی تھی۔ صوفیہ کے چہرے پر عجب سے آثار تھے، تھوڑی سی پاپوسی کا اظہار ہونے لگا تھا اس کے چہرے سے اس نے دم لہجے میں کہا۔

”کیا ہماری کہانی سمندر میں ہی ختم ہو جائے گی؟“

میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ ”میری کہانی کا تو شاید آغاز اور انجام ہی نہیں ہے سسٹر، لیکن آپ یقین کریں میں آپ کے لئے افسردہ ہوں۔“

”اور جب تم بار بار یہ الفاظ کہتی ہو تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے اس خیال کے تحت کہ اپنی زندگی تمہارے نام کرنے کے باوجود میں وہ مقام نہیں حاصل کر سکی جو مجھے ملنا چاہیے تھا تمہاری نگاہ میں۔“

”ارے نہیں نہیں سسٹر۔۔۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“

”تو پھر جو ہوتا ہے ہم دونوں کے ساتھ بھی ہوگا بلکہ جہاز کے تمام مسافروں کے ساتھ، پھر تم میرے لئے کیوں افسردگی کا اظہار کرتی ہو؟“

نجانے کتنا وقت ہمیں یہاں گزرا تھا کہ یکایک کینبن کے دروازے پر دستک ہوئی اور صوفیہ نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا، ایک ادیبانہ عطر کا خوشبو اٹھا اس نے کہا۔

”آپ مس نشاء ہیں؟“

”ہاں بولو کیا بات ہے؟“ صوفیہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”مسٹر وکسن ڈیزل آپ کو ڈیک پر بلا رہے ہیں، براہ کرم میرے ساتھ آئیے۔“

صوفیہ نے میری شکل دیکھی اور میں نے گردن ہلا دی۔

”چلتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر دوڑنے پر آ گئی۔ ”کیا کہا ہے مسٹر ڈیزل؟“

”آپ میں سے جو بھی نشاء ہو، وہ دوسرے ساتھ چلے۔“ وہ شخص بولا۔

”صرف نشاء؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں انہوں نے یہی تاکید کی ہے۔“

”گویا ہم دونوں نہیں جاسکتے؟“

”جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ میں نے آپ سے عرض کر دیا، آگے آپ کی مرضی ہے۔“ وہ شخص بولا اور میں ایک لمحہ کے لئے سوچنے لگی، پھر میں نے صوفیہ سے کہا۔

”نجانے کیا بات ہے سسٹر میں جانتی ہوں آپ آرام کریں۔“

میں نے لباس وغیرہ درست کیا اور باہر نکل آئی، برابر میں انکل ڈیزل کا کینبن تارک تھا، ماحول پر گھبراہٹ سا نا طاری تھا، نجانے کیا بات تھی کہ اندرونی طور پر میں کچھ گھبراہٹ سی محسوس کر رہی تھی جیسے کچھ ہونے والا ہو لیکن کیا ہو سکتا ہے آخر، وکسن ڈیزل کا پیغام لانے والا میرے آگے آگے چلا ہوا عرشے پر آ گیا، اس نے تھوڑے فاصلے پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ مسٹر ڈیزل موجود ہیں۔“

جس سمت اس نے اشارہ کیا تھا وہاں شمس تاریکی تھی اور کپتان گارساں نے بہت کم روشنیاں جلائی تھیں۔ تاہم وہند لاہٹوں میں انکل ڈیزل کا ہیولہ نظر آرہا تھا۔ میں تیز خیز قدم اٹھاتی ہوئی بہ فاصلہ عبور کرتے ان کے قریب پہنچ گئی۔ پیغام دینے والا شخص اب میرے پیچھے ہو گیا تھا۔ ادھر انکل ڈیزل ریڈنگ پر ہاتھ جمانے سمندر کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”کیا بات ہے انکل خیریت؟“ میں نے حیران لہجے میں پوچھا اور وکسن ڈیزل نے رخ بدل کر مجھے دیکھا، لیکن تاریکی اتنی بھی نہیں تھی کہ میں انہیں نہ پہچان سکتی، وہ انکل ڈیزل نہیں تھے، میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، یہ شخص امرجنیدی تھا، امرجنیدی نے چند لمحات

ناسی اختیار کی پھر بولا۔

”تم سے بہت اہم گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

”اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔“

”یہ کیا بکواس ہے، آپ نے مجھے دھوکے سے دیا ہے مسٹر امرجنیدی، یہ شخص مجھے وکسن ڈیزل کے بدلے سے یہاں بلا کر لایا ہے۔“

”مجھ پر یہی دورہ، ورنہ شاید تم آنے سے گریز کرتیں۔“

”لیکن اس دھوکہ دہی کی ضرورت کیوں نہیں آتی آپ کو؟“

”ایک بات کا جواب دو، کیا مجھے اس جہاز پر دیکھ کر نہیں حیرت نہیں ہوئی؟“

”آپ جیسے جرائم پیشہ لوگ کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں۔ کچھ رہے ہیں آپ مسٹر امرجنیدی، مگر میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“

”بات کرو یا نہ کرو جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ سن لو، ہمیں، ہم سب بہت خطرناک جاں میں گرفتار ہونے والے ہیں، یہ آخری موقع ہے بالکل آخری، میں نے زندگی کی بازی لگا کر مارشل سے فراز کا انتظام کیا ہے، نیچے ایک اسٹیمر موجود ہے، یہ سڑھی رکھی ہوئی ہے جو ہمیں نیچے پہنچا دے گی، ہم مارشل چھوڑ کر زندگی بچا سکتے ہیں، ورنہ جہاز کا ایک ایک مسافر گارساں کے ہاتھوں فنا ہونے والا ہے، میں اس کا منصوبہ بن چکا ہوں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مارشل کو کوئی ساحل ہی نہ ملے اور ہم لوگ اس کے ہاتھوں فنا ہو جائیں، لیکن میں تمہیں یہ پیش کر رہا ہوں کہ میرے ساتھ چلو ہم خوشی تلاش کر لیں گے، اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ نشاء وقت بالکل گنہگار ہے۔“

”میرا خیال ہے آپ پاگل ہو گئے ہیں امرجنیدی، دماغ خراب ہو چکا ہے آپ کا، میں تمہیں اس بات کی صورت پر، میرا آپ سے واسطہ نہیں ہے۔“

”بہت گہرا واسطہ ہے نشاء، بہت ہی گہرا واسطہ۔“

”اگر جنیدی نے کہا اور پھر جو کچھ ہوا میرے لئے غیر متوقع تھا، اچانک ہی عقب میں موجود قوی ہو چکا تھا، مجھے بلا کر لایا تھا مجھے دیوچ لیا اور دوسرے لمحے میں اس کے ہاتھوں میں بلند ہوئی تھی، میرے حلق سے بے اختیار چیخ نکلی تو امرجنیدی نے کہا۔

”اوگدھے کے بچے اور اس قوت نے اس کا منہ کھلا چھوڑ دیا ہے، منہ بند کر۔“

لیکن اس کی نوبت نہیں آئی، دیوچل شخص مجھے اپنی طرح اٹھائے ہوئے کنارے پر آیا اور پھر ریڈنگ پر چڑھ کر اس نے گہرائی میں چھلانگ لگا دی، میرے حلق سے نجانے کتنی چیخیں نکل گئی تھیں، مجھے یوں لگا تھا جیسے آسمان سے گری ہوں، قوی ہو چکا تھا گرتے ہوئے مجھے چھوڑ دیا اور دوسرے لمحے میں میں چھپا پاک سے پانی میں جا گری۔ لیکن امرجنیدی لگانے والا پانی میری آنکھوں میں لگا پھر حلق میں بھر گیا اور میرا سانس بند ہونے لگا، لیکن اس شخص نے بڑی ٹیکنیک سے کام لیا تھا وہ میرے ساتھ ساتھ نیچے آیا تھا اور اپنی طور پر وہ کوئی ماہر تیراک تھا چنانچہ اس نے مجھے گہرائی میں نہ جانے دیا اور ایک بار پھر مجھے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔

میرے ہوش دھواں بحال نہیں تھے اس کے باوجود میں نے اسٹیمر کے انجن کی آواز سنی وہ قریب آیا تو مجھے اس میں اچھال دیا گیا، یہاں اور کوئی بھی موجود تھا جس نے مجھے سنبھال کر اوندھا لٹا دیا اور غالباً میرے پیٹ سے پانی نکالنے کا عمل شروع کر دیا گیا، لیکن پانی میرے پیٹ تک نہیں جا سکا تھا بس حلق اور ناک میں بھر گیا تھا، میں نے تڑپ کر اس شخص کو لات ماری اور وہ پیچھے لڑھک گیا اسی اثناء میں دوسرا شخص اوپر چڑھ آیا تھا۔ میں اچھل کر کھڑی ہوئی تو ان دونوں نے جھپٹ کر مجھے دیوچ لیا، سامنے امرجنیدی مجھے رکی کی سڑھی سے اترتا نظر آ رہا تھا، مجھے دیوچنے والوں نے ایک بار پھر مجھے نیچے گرا دیا اور ان میں سے ایک نے میرے دونوں ہاتھ موز کر میری پشت پر کس دیئے، دوسرا اسٹیمر سنبھالنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ امرجنیدی نے اسٹیمر میں چھلانگ

لگاوی اور اس کے بعد اسیر آگے بڑھ گیا۔ ہاتھوں کے بعد میرے پاؤں بھی ری میں جکڑ دیے گئے پھر اس شخص نے مجھے کھینٹ کر ایک طرف بٹھایا، مجھ سے کچھ فاصلے پر کوئی اور بھی بیٹھا ہوا تھا جس کے خدوخال تاریکی میں نظر نہیں آ رہے تھے، اسیر نے ایک زبردست جھٹکے سے رخ تبدیل کیا تھا اور ایک سمت اختیار کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔

میری کیفیت عجیب و غریب ہو رہی تھی، شدید غصہ بھی تھا اور خوف بھی تھا، مجھے اصر جندی نے مارشل سے اغوا کیا تھا اور موت کے سفر پر چل پڑا تھا اب کیا ہوگا۔ لیکن یہ سوچنے کا موقع نہیں ملا، اچانک مارشل کے برج پر سرچ لائٹ جل پڑی اور اس کی تیز شعاعی روشنی سمندر پر پڑی اور پھر وہ اسیر کا تعاقب کرنی ہوئی آگے بڑھنے لگی اور آن کی آن میں اس نے اسیر کو اپنی گرفت میں لے لیا، ہم سب تیز دوڑتے ہوئے روٹی میں نہا گئے۔ اصر جندی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”اوہ! راز کھل گیا، انہیں پتہ چل گیا، رفتار تیز کرو و رفتار تیز کرو۔“

”اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے سر۔“ اسیر گنگ پر کھڑے ہوئے شخص نے کہا۔

اچانک روشنی بجھ گئی، خاموشی چھا گئی، بڑی سنسنی کا احساس ہو رہا تھا، سر پکرا رہا تھا آنکھیں بند ہوئی جاری تھیں، اسیر پر موجود لوگ بھی سکتے کی سی کیفیت میں تھے، ایک ایک لمحہ چنٹا ہوا گزر رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ اسیر روشنی میں تو آ گیا ہے، پھر ادھر سے کوئی کارروائی کیوں نہیں ہوئی۔ میرے اندازے کے مطابق کوئی چندہ منٹ گزر گئے پھر اچانک اسیر گنگ پر کھڑا ہوا شخص دہشت بھرے لہجے میں بولا۔

”کارروائی شروع ہو گئی ہے۔“

”کیا کہا؟“ اصر جندی کا لہجہ بھی خوف سے بھر پور تھا۔ اسیر چلانے والے کے جواب دینے کی ضرورت نہیں پیش آئی، تین سمت سے مدہم مدہم روشیاں سفر کرتی ہوئی نظر آئی تھیں، یقیناً یہ بھی اسیر تھے

جو اس اسیر کے تعاقب میں چلے تھے، میرے دل کو ڈھارس ہوئی، یہ سخت خوف زدہ ہو گئے تھے، اچانک شہر سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا شخص بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”تھکیل ختم ہو گیا جندی۔“

”میں آخری دم تک کوشش جاری رکھیں گا۔“ اصر جندی نے جواب دیا پھر اسیر چلانے والے سے بولا۔

”رفتار تیز کرو دان کے زرخے میں آج سے بچو۔“

”عجیب بات کر رہے ہیں آپ سر، اس کی رفتار اس سے زیادہ نہیں ہے میں کیا کروں۔“

”اوہ۔۔۔ وہ۔۔۔ آخر وہ دیکھو ان کا فاصلہ تو کم جارہا ہے، آخراں کی رفتار اتنی تیز کیوں ہے؟“

”ان کی رفتار تیز نہیں ہے بس انہوں نے ہم گھیرنے کے لئے خاص طریقہ کار اختیار کیا ہے۔“

”مشکل ہے، لگتا مشکل ہے، وہ بحری قزاق ہے، سمندروں کا کیرا۔“ سامنے والے آدی نے کہا اور

نے آواز پہچان لی، یہ عدنان ثنا کی تھا، اصر جندی سے ہوئے انداز میں تین ستوں سے آنے والی روشنی کو دیکھ رہا تھا۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ انہوں نے فرار ہونے والے اسیر کو گھیر لیا ہے۔

”وعدہ ان پر سرچ لائیں روشنی ہو گئیں، گوان روشنیوں نے بھی ہمارے اسیر کا احاطہ کر لیا تھا لیکن بس چند لمحات تھے جب وہ اسیر تک پہنچنے والی تھیں اور یہ لمحات بھی گزر گئے، سب کو آنکھوں پر ہاتھ رکھنے پڑے تھے، میں نے بھی گردن جھکا کر آنکھیں پٹی لیں، پھر میرے فون پر آواز ابھری جو پہلے تو واضح نہیں تھی لیکن پھر صاف سنائی دینے لگی۔

”تم لوگ مشین منوں کی زد پر ہو، صرف ایک منٹ دیا جاتا ہے اسیر کا انجن بند کرو ورنہ ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔ کسی نے حرکت کی تو فائر کھول دیا جائے گا۔ یہ سمندر شراک پھٹکیوں سے بھرا پڑا ہے، پانی میں کودے تو بدترین موت مارے جاؤ گے، پانچ بجے گزر گئے ہیں وارننگ پھر سن لو۔ وہی الفاظ پھر دہرائے

میں اور اچانک اسیر کا انجن خاموش ہو گیا۔

”یہ کیا کیا تم نے گدھے کے بچے۔“ اصر جندی چیخا۔

”آپ کا دماغ خراب ہے سسر جندی، ہم کتے کی موت مرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔“ اسیر چلانے والے کے دوسرے ساتھی نے کہا اور جندی اس کے بعد کچھ نہ بول سکا، متیوں اسیر ہمیں روشنی کی زد میں لئے ہوئے ہمارے قریب آ گئے، پھر ان پر سے ری اور انجنزے پھینک کر اسیر کے کناروں میں پھنسائے گئے اور اس کے بعد چند افراد اسیر پر آ گئے، انہوں نے پھرتی سے اسیر پر موجود چاروں افراد کو قبضے میں لے لیا، مجھے دیکھ کر ان میں سے ایک نے کہا۔

”اوہ مائی گاڈ یہ ایک لڑکی کو بھی اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔“

”کھولو اسے ہلکی ان کے علاوہ اور بھی کوئی اسیر میں موجود ہے۔“ دوسرے آدی نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتی۔“

”کوئی اور ہے تمہارے ساتھ؟“ پہلے آدی نے سوال کیا۔

”نہیں اور کوئی نہیں ہے۔“ اس بار عدنان ثنا کی نے کبلہ چلو دوسرے اسیر پر چلو۔

”میں لنگڑا ہوں براہ کرم مجھے سہارا دو۔“

ان لوگوں کو دوسرے اسیر پر پہنچا دیا گیا مجھے بھی ایک اور اسیر پر منتقل کر دیا گیا تھا جس اسیر پر جندی فرار ہو رہا تھا اسے بھی سنبھال لیا گیا اور پھر چاروں اسیر مارشل کی جانب چل پڑے۔ اوپر جانے کے لئے مجھے بھی ری کی سیریشی استعمال کرنی پڑی تھی، مارشل پر زیادہ ہنگامہ نہیں ہو رہا تھا، لیکن ڈیک پر سسر صوفی، ولسن ڈیزل، عسکری اور دوسرے چند افراد کے ساتھ گارساں بھی موجود تھا، عسکری ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھا اس نے مجھے دیکھا اور پھر اس نے اس سہارے کو قبول کیا، البتہ سسر صوفی مجھ سے لپٹ گئی اور بری طرح سے لپٹ گئی۔

”تم ٹھیک ہونا ڈارنگ تم ٹھیک ہونا۔“

اسی وقت گارساں بولا۔ ”کیا یہ لڑکی بھی فرار ہونے والوں میں شامل ہے؟“

”نہیں کیپٹن یہ لوگ اسے اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ اسیر میں یہ ہیں ری سے بندھی ہوئی ملی تھی، ہم نے اسے کھولا تھا۔“

”تمہارا کمبین نمبر کیا ہے بے بی؟“ گارساں نے پوچھا، لیکن میرے بجائے سسر صوفی نے انہیں کمبین کا نمبر بتایا اور بولی۔

”ہم دونوں ساتھ رہتے ہیں۔“

”اسے لے جاؤ اس وقت تک اپنے کمبین سے باہر مت نکلتا جب تک میں تمہیں طلب نہ کروں۔ کوئی اور کمبین میں نہ جائے ان پر پہرہ لگا دیا جائے۔“

”اوکے کیپٹن۔“

”ان لوگوں کو نیچے لے جاؤ اور سنو، ان کے لباس اتروالینا تاکہ۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر گارساں عجیب سے انداز میں ہنسا اصر جندی کے منہ سے ایک آواز نکلی تھی، لیکن گارساں پلٹ کر واپس چل پڑا، سسر صوفی مجھے لے کر کمبین کی جانب چل پڑیں، کمبین میں داخل ہوتے ہی وہ بے اختیار ہو گئیں اور مجھ سے لپٹ کر زارو تظار رونے لگیں۔

میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی، لیکن اس وقت مجھے صوفی کی محبت کا احساس ہو رہا تھا، یہ احساس کچھ عجیب سا تھا، جب ان کا دل ہلکا ہوا تو وہ میرے لئے دوسرا لباس نکال کر بولیں۔

”چلو کپڑے بدل لو۔“

”جی۔“ میں نے کہا، پھر جب میں کپڑے تبدیل کر کے باہر آئی تو صوفی کنگھے سے میرے بال سنوارنے لگیں، پھر بولیں۔

”کیا ہوا تھا نشاء۔۔۔۔۔ کیا ہوا تھا میری جان؟“

”اصر جندی نے مجھے اغوا کیا تھا۔“

”آخر کیسے۔۔۔۔۔ یہ کیسے ہوا تھا؟“

”مجھے دھوکے سے بلایا گیا تھا انکل ڈیزل کے نام پر، لیکن مجھے بلانے والا اصر جندی تھا، اور پھر میں نے

صوفیہ کو ساری تفصیل بتائی، وہ چند لمحاتے خاموش رہے
کے بعد بولیں۔

”تمہیں دیر ہوگئی تو میں پریشان ہو کر سرے پر گئی، وہاں کچھ کارروائی ہو رہی تھی، مجھے شبہ بھی نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ کچھ ہوا ہے، میں اس کارروائی کو نظر انداز کر کے تمہیں تلاش کرتی پھری، تب اچانک ہی مجھے مسٹر ڈیزل مل گئے، انہوں نے بتایا کہ کچھ لوگ ایک اسفیرلے کے فرار ہوئے ہیں، میں نے بے قراری سے تمہارے بارے میں پوچھا تو وہ دنگ رہ گئے اور پھر کہیں دوڑے چلے گئے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا تمہاری تلاش میں ناکام ہو کر میں وہاں کھڑی ہوئی اور پھر مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی واقعہ پیش آیا ہے، اب مجھے یقین ہو گیا نشاء خدا کی قسم اب مجھے یقین ہو گیا ہے۔“

”میرے باپ، میرے مالک، میرے رہنما، میرے دیوتا، اے کے ہمدانی کے ساتھ وہ وحشیانہ سلوک احمد چندی نے کیا ہے وہ اور اب میں اس سے انتقام لوں گی۔ ہمدانی میرا باپ تھا، میرا باپ تھا وہ، میرا رہنما تھا، اس نے مجھنی زندگی سے روشناس کرایا تھا۔“ صوفیہ شہید جذبات کے عالم میں خاموش ہو گئی تھیں۔

”اور وہ سبجٹ بھیڑی کھال میں بھیرا، وہ لنگڑا پروفیسر وہ بھی یقیناً اس سے مختلف نہیں ہوگا۔“ میں نے دانت پیڑیں کر کہا۔ سسٹر صفویہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر ہم دونوں بہت دیر تک خاموش رہے اس کے بعد سسٹر صفویہ بولیں۔

”میرا خیال ہے اب نہ تو کسی کو ہمارے پاس آنے دیا جائے گا نہ ہم باہر جا سکیں گے مگر سارا سخت اور با اصول آدمی ہے۔“

رات گز گئی، غیند تو بالکل نہیں آئی تھی ایک لمبے
کے لمبے پلک حقیقت کو خود کو پانی میں ڈوبا محسوس کرتی،
اور دہشت زدہ ہو کر جاگ اٹھتی، پھر آہستہ آہستہ روشنی
نمودار ہو گئی، پھر صبح کو کسفر صوفی نے خبرہ کے دیکھ لیا،

وسکن ویزل کی تلاش میں باہر نکلی تھیں لیکن نہیں دروازے پر روک دیا گیا۔

”آپ کا ناشتہ ابھی آرہا ہے میڈم، براہ کرم
آپ باہر نکلنے کی کوشش نہ کریں۔“

”میں برابر والے کیمین میں جانا چاہتی ہوں۔“
 ”آپ اپنے کیمین کا دروازہ بھی اس وقت تک
 مت کھولیں جب تک کیمین سے ملاقات نہ
 کر لیں۔“ جواب ملا۔

ناشتہ تھوڑی دیر کے بعد آگیا کیپٹن گارساں نے
دن کے بارہ بجے مجھے غلب کیا تھا۔ مکمل عدالت رکائی تھی
اس نے تمام مسافر عرش پر جمع تھے، درمیان میں
احمر جنیدی کی عدالت ٹٹائی اور وہ دونوں افراد موجود تھے
جنہوں نے مجھے انواء کیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں
ہتھکڑیاں بڑی ہوئی تھیں، اوپری بدن بے لباس تھے
اور ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ ہمیں گارساں
کے سامنے پیش کیا گیا، کچھ فاصلے پر روشاٹ عسکری کے
ساتھ کھڑا ہوا تھا اس کے چہرے پر مسخرانہ انداز کے آثار
تھے، کیپٹن گارساں نے پراسرار انداز میں مجھے مخاطب
کیا اور بولا۔

”معزز خاتون! آپ سے چند سوالات کروں گا، براہ کرم سچ جواب دیجیے گا۔“

”جی۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”فرار کے منصوبے میں آپ کا کتنا حصہ تھا؟“

”مشرکارساں، میں کسی فراد وغیرہ کے بارے میں نہیں جانتی، اس شخص نے دھوکہ دے کر مجھے غرے پر بلوایا یہ شخص۔۔۔۔۔“ میں نے اس شخص کی طرف انگلی اٹھائی جو مجھے وسکن ڈیزل کے حوالے سے غرے پر لے گیا تھا، میں نے گارساں کو پوری تفضیل بتائی اور گارساں نے عدنان شاہ کی طرف رخ کر کے کہا۔

”کیا یہ لڑکی سچ بول رہی ہے؟“

”ہاں یہ سچی ہے۔“ عدن شاکی نے جواب دیا۔

”تم اسے کیوں لے جانا چاہتے تھے؟“

”ہمیں راستے کے انتظامات کے لئے ایک

تاہون کی ضرورت تھی۔“ اہم جنیدی نے جواب دیا۔

”اسی کا انتخاب کیوں کیا گیا تھا؟“

”بس، ہمیں یہ اطمینان تھا کہ یہ اس نام کا جو
 بننے سے آجائے گی، اس کی اور کوئی خاص وجہ نہ
 تھی۔“

”کہاں جانا چاہتے تھے؟“

کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا اس ہم زندگی کی جدوجہد کرنا چاہتے تھے، آزادی کے ساتھ تمہاری غلامی میں کرنا کہہ رہے تھے بھی کبھی کوئی میزبان نہیں پاسکے کے بانی کے پاس بارگاہ اعلیٰ طرح سمندر میں دوڑتا رہے گا۔ کے تمام مسافر آہستہ آہستہ مرجا میں گئے ہم زندگی جدوجہد کرنے کے لئے فرار ہو رہے تھے اور کوئی منہ نہیں تھا ہمارا۔“ آخر حیدری نے کہا۔

”یہ جرم ہے میرے دوست، سمندری اصول کے مطابق جرم ہے یہ اور اس کی سزا ہوتی ہے، تم یہ نیتی انیسٹرے کر کر فرار ہونے کی کوشش کی تھی، مگر مجھے اور اگر تمہارے پاس اعلیٰ ہوتا تو تم اعلیٰ استہ کرتے، خیر تم نے جدوجہد نہیں کی اس لئے تمہاری بہت معمولی ہے، تم چاروں جہاز کے فرش صاف کرو گے۔ تمام کینٹین کے ہاتھ روم دھوؤ گے، نظریہ اور ڈیوٹیاں نہیں بتاتے رہیں گے، اوکے، ان جہازوں کی کھول دی جائیں اور ہاں سنو! آخری بار قبل حکم نہ ہوئی تو دس کڑے مارے جائیں گے اور اور اس کے باوجود حکم عدولی ہوئی تو تمہیں اٹھا کر سرخیں چیک دیا جائے گا پس منتشر“۔ گھاساں اڑوں ہاتھ اٹھا دیے، پھر میری طرف رخ کر کے بولا

”کیا یہ سزا مناسب ہے ان کے لئے لڑکی

میں نے وہ حتمی فیصلہ کرنا تھا اس اعداد کے ساتھ کہ
فیصلہ آخری فیصلہ ہے، غرض یہ کہ سب لوگ منتظر ہو
رہے ہیں۔ لیکن ڈیزل نے بتایا تھا کہ وہی شخص ان
پاس بھی آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ اگر جیندی اس

ایک خاص موضوع پر بات کرنا چاہتا ہے۔

”گُذ..... پھر۔ میں نے پوچھا۔“

”انکل کہہ رہے تھے کہ یہ بدترین سزا

”لیکن میں۔ وہ مجھے کیوں سنا:

چاہتا تھا۔

”تم۔۔۔۔۔!“ سسٹر صوفیہ مسکرا کر بولی۔

لی چھ ہزار سالہ تاریخ کا ایک پراسرار ترین باب

”بھئی بھئی دل چاہتا ہے سسٹر کہ“

”ہموڑے سے اپنا سر پاس پاس لڑلوں۔“

"کیوں۔"

”تاکہ اس میں جتنے راز

باہر آ جائیں۔“

”وقت اپنے ہاتھوں سے اپنی کھڑکی پر لگا رہا تھا۔“

ۋارلىك-

”نہ جانے وہ کون تھے جو احرارِ جنید

شانی کا ساتھ دے رہے تھے۔“

کرتے ہیں عسکری۔ میں صوفیہ سے باتیں کر رہی ہوں
 آپ بلاوجہ ہمارے درمیان۔“
 ”اوہ..... وہ شرمندگی سے بولا اور پھر وہاں
 سے آگے بڑھ گیا میں نفرت بھری آنکھوں سے اسے
 دیکھتی رہی تھی مارشل کا سفر بدستور جاری تھا اس وقت شام
 کے پانچ بجے تھے کہ اچانک جہاز کے سارن بجنے لگا۔
 بڑی ہولناک آواز تھی۔ لوگ بھاگ بھاگ کر عرش
 پر جانے لگے بہت سے لوگ عرش پر ہی تھے ہم بھی
 اوپر پہنچ گئے تھی مائیکروفون پر گارساں کی آواز ابھری۔
 ”مارشل کے مسافر۔ خوشخبری سنو! ہم نے زمین
 دیکھ لی ہے۔ طاقتور دور بینوں سے زمین دیکھ لی گئی ہے۔
 ابھی آپ لوگ اسے نہیں دیکھ سکتے ہم نے فاصلوں کا
 تعین کر لیا ہے کل صبح تک ہم اس زمین کے قریب پہنچ
 جائیں گے یہ خبر پورے دھوکے سے دی جا رہی ہے۔“
 وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ زندگی کو ترسے ہوئے
 لوگ پھر سے خوشیوں میں ڈوب گئے۔ اور طرح طرح
 سے اس کا اظہار ہونے لگا۔
 ہم تو صرف دیکھنے والے تھے۔ ویسے میں سوچ
 رہی تھی کہ روشاق، احمد چندی سے کہیں زیادہ چالاک
 اور خطرناک تھا احمد چندی اپنی حماقت سے عذاب میں
 گرفتار ہو گیا تھا جبکہ روشاق نے گارساں جیسے خطرناک
 آدمی کو اپنی نگاہ میں لے لیا تھا۔
 جہاز کے مسافر نہ جانے کیا کیا کرتے پھر رہے
 تھے بیشتر تو ساری رات نہیں سوئے تھے اور عرش پر ہی
 رہے تھے صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ زمین کی
 صورت نظر آ گئی۔ میں اور صوفیہ بھی زندگی سے اتنے
 بیزار نہیں تھے کہ زمین کی خوشخبری کے باوجود گہری نیند
 سو جاتے۔ ہم نے بھی عرش پر مسافروں کے جہوم میں
 جگہ بنا کر ان ساحلی ٹیلوں کو دیکھا جو زرد اور بد نما شکل
 رکھتے تھے ان کے وامن میں کالی چٹائیں بکھری نظر
 آ رہی تھیں۔
 مارشل کی رفتار سست ہو گئی تھی اور ساحل پر لگا
 رکھتے ہوئے سفر کیا جا رہا تھا۔

صوفیہ بھی میرے ساتھ موجود تھی۔ اس نے
 کہا۔ ”کیا خیال ہے نشاء۔ اس جگہ کے بارے میں کیا
 کہتی ہو۔“
 ”شاید کوئی جزیرہ ہے۔“
 ”شاید۔ غیر آباد سا لگتا ہے۔“
 ”ابھی کافی دور ہے۔“
 ”ایں۔ لگتا نہیں ہے۔ مجھے تو بے حد خوف محسوس
 ہو رہا ہے۔“
 ”کیوں.....“
 ”میں نے سمندروں میں اپنے جہاز کے
 بارے میں پڑھا ہے جو نامعلوم اسرار رکھتے ہیں اگر ایسا
 ہوا تو۔“
 ”تو ہم ایک نئے عذاب میں گرفتار ہو جائیں
 گے۔“
 ”یقیناً ایسے جزائر میں آبادی کا نام و نشان نہیں
 دنیا کو ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا۔“
 ”کیسی دل ہلا دینے والی باتیں نہ کریں سسر۔“
 ”پلیز۔ ڈرامت کرو۔ لیکن میرے اندر خوف
 ابھر رہا ہے میں اسے دبا نہیں پارہی ایک خوف ناک
 خیال میرے دل میں آ رہا ہے پہلے سمندر کے قیدی تھے
 اب ایک ویران اور غیر آباد جزیرے میں قید ہو جائیں
 گے۔ اپنی دنیا سے دور اور۔ اور۔“ سسر صوفیہ ایک گہری
 سانس لے کر خاموش ہو گئی۔
 ”پلیز۔ ایسی خوف ناک باتیں نہ کریں
 سسر۔ ہو سکتا ہے آپ کا خیال غلط ہو۔“
 ”تم دیکھ رہی ہو۔ مارشل ساحل کے ساتھ آگے
 بڑھ رہا ہے۔ ابھی تک کوئی عمارت یا ایسی کوئی شے نہیں
 نظر آئی جس سے یہاں انسانی وجود کا پتہ چل سکے۔
 ”پتہ نہیں۔“ میں نے خوف زدہ لہجے
 میں کہا۔ جہاز کے دوسرے مسافروں کے ذہنوں میں
 کیا تھا اس کا اندازہ مشکل تھا ممکن ہے دوسرے لوگ بھی
 ہماری طرح ہی سوچ رہے ہو۔ اب سورج خوب چمکنے
 لگا تھا اور ہر شے صاف نظر آ رہی تھی مارشل پورے

جزیرے کا چکر لگا رہا تھا پھر اس کا یہ چکر پورا ہو گیا
 اور روشن دن میں اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ یہ کوئی
 غیر آباد جزیرہ تھا۔
 اس دوران تجربے کار کپتان نے مارشل
 کو بتا دیا کہ مارشل کے لئے مناسب جگہ کا انتخاب
 کر لیا تھا۔ چنانچہ چکر مکمل کرنے کے بعد منتخب جگہ مارشل
 کے آگے بند کر دیئے گئے جو جگہ منتخب کی گئی تھی وہاں دو بلند
 پہاڑ اپنی وسعتوں کا آغاز کرتے تھے ان کے
 درمیان ایک وسیع درہ بالکل اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے
 جزیرے کا داخلی دروازہ ہو۔ مارشل کے لنگر ڈال دیئے
 گئے۔ مسافروں میں جو شجیدہ اور تجربے کار افراد تھے وہ
 صورت حال کا اندازہ کر چکے تھے۔ لیکن زیادہ تر ایسے تھے
 جو زمین مل جانے سے خوش تھے اور ماضیوں نے بعد میں
 پیش آنے والی صورت حال پر غور ہی نہیں کیا تھا۔
 گارساں بھی عرش پر آ گیا تھا۔ آخر اس
 نے کہا۔
 ”دوستو!..... زمین ہمارے سامنے ہے اور اس
 کے اطراف کا چکر لگانے سے ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ
 صرف ایک جزیرہ ہے۔ ہمیں اس کی نوعیت کا کوئی اندازہ
 نہیں ہے۔ بظاہر یہ غیر آباد معلوم ہوتا ہے لیکن بہر حال
 یہاں ہمیں سمندر کے بے متنی سفر سے نجات حاصل ہوئی
 ہے۔ اس بات کے امکانات بھی ہیں کہ جزیرے کے
 اندرونی حصے میں ہمیں آبادی مل جائے ہو سکتا ہے کسی
 بود بد ملک نے یہاں اپنا کوئی ریسرچ کیمپ قائم کیا
 ہو۔ اور۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ میں سے کسی شخص
 جزیرے پر اترنے کے لئے بے چین ہیں۔ میں نے
 آپ کی بحفاظت خشکی پر پہنچانے کی ذمہ داری قبول کی
 تھی جسے میں نے پورا کر دیا ہے میں آپ کا حکمران نہیں
 ہوں لیکن میں آپ کی اپنی زندگی اور بہتری چاہتا ہوں۔
 اور اس کے لئے ایک بار پھر میں آپ کی اجازت
 چاہتا ہوں۔“
 جہاز کے تمام مسافر گارساں سے خوش تھے۔
 انہوں نے اسے بخوشی اجازت دے دی کہ وہ رک کے

آئندہ کے راستے منتخب کرے تب گارساں نے کہا۔
 ”میں آپ کے ساحل پر جانے کے اختیارات
 کرتا ہوں۔ کوئی شخص بے اعتدال کی کوشش نہ کرے۔
 اور میری اجازت کے بغیر ساحل سے آگے بڑھنے کی
 کوشش نہ کرے۔ تمام مسافر زمین پر ایک جگہ جمع
 ہو جائیں پھر آگے کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔“
 آہستہ آہستہ لالچیں پانی میں اتاری جانے
 لگیں اور مسافر پورے منظم کے ساتھ ساحل کی طرف
 چل پڑے۔ گارساں بے وقوف نہیں تھا۔ عدنان
 ثنائی، احمد چندی، اور دونوں..... پر خاص نگاہ
 رکھی گئی تھی میں اور سسر صوفیہ بھی ساحل پر پہنچ گئے اس
 خوشی سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا جو زمین پر قدم رکھ
 کر حاصل ہوئی تھی۔
 صوفیہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”خداوند عالم
 تو نے انسان کو کیا بنایا ہے۔ کیسا عجیب لگ رہا ہے زمین
 پر قدم رکھ کر۔ شاکر کھیلوں کی خوراک بننے سے۔
 یا سمندر میں بھوک پیاس کے مرنے سے بچنے کے بعد یہ
 زندگی کتنی اچھی لگ رہی ہے۔ لیکن۔“
 ”ہی سسر۔“
 ”آگے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔“
 ”گارساں نے ایک اور بات بھی تو کہی تھی۔“
 ”ہاں کسی ملک کی تجربہ گاہ۔ یا ریسرچ کیمپ کے
 بارے میں نا۔“
 ”ہاں۔“
 ”ممکن نہیں ہے۔ اتنا بڑا جہاز ساحل سے آگے
 ہے۔ اور کسی نے اس طرف متوجہ ہونے کی کوشش نہیں کی
 جبکہ یہ ایک خطری عمل تھا۔“
 سسر صوفیہ کی دلیل وزنی لیکن خوف ناک تھی۔
 میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر دوسروں کو دیکھنے لگی
 عسکری، ولسن ڈیزل، روشاق وغیرہ بھی نظر آ رہے
 تھے۔ پتہ نہیں ان کی سوچوں کیا تھیں۔ سب ہی اپنے
 طور پر اس جزیرے کا جائزہ لے رہے تھے ایک
 بار پھر صوفیہ کی آواز ابھری۔

”نشاء جان۔“ میں نے چونک کر صوفیہ کو دیکھا۔ اس کے چہرے کے پیلاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ حد سے زیادہ خوف زدہ ہے۔ مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ میں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اس سے کہا۔ ”مجھے معاف کرنا میں تمہیں بہت پریشان کر رہی ہوں۔“

”آج ایسے کیوں کہہ رہی ہو۔“ سسز میرے لئے یہ شرمندگی میں کافی ہے کہ آپ میری وجہ سے اس مصیبت میں پھنسی ہیں۔

”پتہ نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے۔ یہ جزیرہ مجھے اس ہولناک سمندری سفر سے زیادہ خوف ناک لگ رہا ہے تم نے ایک خاص بات نہیں محسوس کی۔“

”کیا۔“ یہاں زندگی کا نام نشان نہیں ہے۔ ورنہ ایسی جگہوں پر سمندری پرندے کی گل وغیرہ ضرور نظر آتے ہیں۔“

”لیکن یہاں تم دیکھ رہی ہو؟“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور گارساں واقعی انتظامی اور کابادشاہ نظر آ رہا تھا اس نے دس دس آدمیوں کے گروپ بنائے اور انہیں اس راستے کی طرف روانہ کر دیا یہ گروپ کا ایک دوسرے سے سو گز کا فاصلہ رکھا گیا تاکہ باقاعدہ اور حفاظت طریقے سے پیغام رسائی ہو سکے باقی لوگ ساحل پر اتر کر بیٹھ گئے۔ اور دوسرے امور سرانجام دینے جانے لگے۔ مارشل پر گارساں کے ایسے سامنے موجود تھے جو اسلحہ اور خوراک کی حفاظت کر رہے تھے۔

آخر کار روانہ ہونے والے گروپوں کی طرف سے خبریں موصول ہونے لگیں جن کا لب لباب یہ تھا جزیرے کے دوسری طرف مجبوروں کے جنگل میں فضا میں جوشی میٹھی سمجھوڑ کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے وہ اسی وجہ سے ان کی جھانپوں میں پیلے پیلے سگروں جیسے پھلوں کے جھاڑ بکھرے ہوئے ہیں اس طرف پرندے موجود ہیں بڑے جانور نہیں نظر آتے زیادہ تر بڑے سے طوری چٹائیں نظر آ رہی ہیں کہیں کوئی انسانی وجود یا عمارت نہیں نظر آتی۔

”جزیرہ غیر آباد ہے۔“ گارساں نے اعلان

کیا۔ ”ہمارا دوسرا عمل یہ ہوگا کہ ہم پہاڑ کے دوسری طرف منتقل ہو جائیں۔ جہاز کی اہم خوراک کو محفوظ رکھا جائے گا۔ سب کو مکمل غذا ہونی ہے ان پھلوں کا عملی تجربہ کیا جائے گا۔ پہلے کچھ دیر آرام کیا جائے گا پھر دوسرے فیصلے کیے جائیں گے۔“

جزیرے کے مسافر چل پڑے۔ ہم بھی انہیں میں شامل تھے۔ صورت حال بڑی غم انگیز تھی۔ ہر چیز سے نفرت محسوس ہو رہی تھی صوفیہ یہاں آ کر حوصلہ ہار گئی تھی۔ رات کو وہ سسک سسک کر رو پڑی تھی میں اسے دلا سر دینے لگی مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ہمارے پیچھے عسکری بھی موجود ہے۔

”خود کو سمجھائیے میڈم صوفیہ۔ آپ نے بہت بڑی ذمہ داری قبول کی ہے۔“ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا اور میرے دل میں شدید نفرت پیدا ہوئی۔

”تم ہمارے سر پر کیوں مسلط رہتے ہو۔ یہاں سے دور چلے جاؤ۔“

”یہاں آ کر تو ہم خود بخود ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ رہنے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ تھوڑے دن گزر جانے دیں پھر دیکھیں لوگ کس طرح ایک دوسرے کے القات کو تمہیں گے۔“

”اس کے باوجود میں تم سے رجوع نہیں کروں گی۔ دوسری بات اگر روشاق نے تمہاری ڈیوٹی بھی پر لگا رکھی ہے تو اسے بتا دینا کہ جو کچھ میں اسے بتا چکی ہوں اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم اسے مالاوی ہوگی۔“

”تمہارا شکر یہ نشاء تمہارے طرز عمل نے میرے احساس شرمندگی میں کمی کر دی ہے میں نے اپنی غربت مندی پریشانیوں دور کرنے کے لئے روشاق سے درخواست کیا تھا۔ بعد میں تم سے محبت ہو گئی تو اسے عمل کو گناہ سمجھ کر اس کا کفارہ ادا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن اب میں مظلومیت کی منزل میں داخل ہو گیا ہوں تم اب زیادتی کرنے لگی ٹھیک ہے اب میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

گارساں اب بھی سارے انتظامات سنبھالے ہوئے تھا قاتنے وغیرہ کا بندوبست اسی باقاعدگی سے کیا گیا تھا کہ درمی زمین پر بیٹھنے کا تجربہ بھی کیا تھا لیکن وقت سب کچھ کر لیتا ہے۔ جوں جوں رات بیٹھتی جا رہی تھی فضا میں سرخی اترتی جا رہی تھی ہوا گرم لیکن خشک تھی پھر یہ نہیں سمجھتا تھا کہ صبح جاگے تو جسم اکڑا ہوا تھا بدن میں درد ہو رہا تھا چائے پینے دی گئی جس کے ساتھ دو دو بسکٹ تھے۔ ناشتہ کے بعد لوگ ٹولیاں بنا کر جنگل میں نکلے تھے۔ گارساں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

جنگل میں دور تک نکل جانے والے جب واپس آئے تو کوئی اچھی خبر نہیں لائے تھے۔ انہوں نے تصدیق کی کہ جزیرے پر کوئی آبادی نہیں ہے۔ میں نے مبرو سکون سے یہ خبر سنی تھی گارساں نے خوراک پر سختی شروع کر دی پہلے پھل اور سمجھوڑیں خوراک کا حصہ بنائی تھیں شام کے چھپنے میں دسکن ڈیزل ہمارے پاس آ بیٹھا اس نے کہا۔

”وہ مشکل مرحلہ آ گیا ہے جس کے آگے میری سوچ کے دودھانے بند ہوئے ہیں۔ میں تم لوگوں کو کوئی دلا سر نہیں دے سکتا۔“

”ٹھیک ہے انکل ہم نے اپنی تقدیر سے سمجھوڑ کر لیا ہے۔“ میں نے شخص کی سانس لے کر کہا۔

”مگر میری تقدیر کیوں کالی ہو گئی ہے میں کیا کروں۔“ اچانک صوفیہ پھٹ پڑی اور ہم دونوں ہنسنے لگے۔ ڈیزل نے کہا۔

”مارشل پر جتنے مسافر ہیں ان میں سے کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ وہ ایسی کسی شکل کا شکار ہو جائیں گے جو کچھ ہمارے سب کی توقع کے خلاف ہوا ہے۔ جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے کے بجائے تقدیر کے فیصلے کا انتظار کرو۔“

”ہاں۔ کالی تقدیر کے فیصلے کا انتظار۔“ صوفیہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا میں ششدر رہ گئی تھی لیکن ڈیزل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اس کے باوجود۔ خود پر کنٹرول رکھیں میڈم صوفیہ۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے میری کوئی صورت نکل آئے۔“

”آپ نے زبان پر تالے کیوں لگا رکھے ہیں مسٹر ڈیزل۔ آپ ہمیں کیوں نہیں بتاتے کہ آپ کو آئندہ کیا کرنا تھا آپ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ ہارون دانش نے ہمیں آپ کے پاس کیوں بھیجا تھا؟ عجیب پر اسرار رکھیل چل رہا ہے زندگی بار بار موت سے ہمکنار ہو رہی ہے اور اس راز کا انکشاف نہیں کیا جا رہا جس کے لئے یہ سب عذاب مول لیا گیا ہے۔“ صوفیہ نے کہا۔

”اس راز سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے بے بی۔“ ڈیزل نے چل سے کہا۔

”وہ تو میں بھی جانتی ہوں مگر کیا کروں، پاگل پن سوار ہو گیا تھا دیوانی ہو گئی تھی لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے مجھے آگے کا حال معلوم ہونا چاہیے۔“ صوفیہ نے جنونی لہجے میں کہا۔

”تمہاری مختصر عقل کچھ نہیں سمجھ پائے گی۔ ادا کے۔۔۔۔۔ ڈیزل نے کہا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ صوفیہ کے چہرے پر شدید غصے کے آثار تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”سسز۔“

”سوری نشاء۔ دیری سوری۔ بس بہت ہو گیا اس سے زیادہ کچھ ممکن نہیں ہے۔ سوری۔۔۔۔۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھ گئیں۔“

”سسز۔ پلیز! میں نے رندگی ہوئی آواز میں کئی بار اسے پکارا لیکن صوفیہ تیز تیز قدم اٹھاتی کافی دور چلی گئی اور پہلی بار میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ میں خوب روئی پھر خود ہی جب بھی ہو گئی۔ رونے والوں کو کوئی دلا سر نہیں دیتا۔ میں ایسی ہی تھی مسافر محروموں میں سے اکثر بے اختیار درد پڑتی تھیں اور خود ہی خاموش بھی ہو جاتی تھیں ہر ایک کے رونے کی وجہ مختلف تھی میرے ساتھ جو کچھ تھا وہ میرے رونے کے لئے کافی تھا اب تو عسکری بھی ناراض ہو گیا تھا۔ صوفیہ بھی چھوڑ گئی تھی دسکن ڈیزل نے بھی بے بسی کا اظہار کر دیا تھا اب۔۔۔۔۔ اب کیا ہوگا کیا ہوگا؟“

(جاری ہے)

کمرہ اندھیرا تھا کہ اچانک ایک دھشت ناک اور بھاری چیخ سنائی دی، پھر چند منٹ بعد ہی ایک بلے کی خوفناک آواز جس نے گھر کے مکینوں کو دھلا کر رکھ دیا مگر پھر اللہ والہ کی آواز سننے ہی وہ.....

حدود سے تجاوز انسان کے لئے کبھی کبھار جان لیوا ثابت ہوتا ہے، کہانی پڑھ کر تو دیکھئے



چل رہی ہوتی 24 گھنٹوں میں سے جس وقت بارش ہو رہی ہوتی ہم اپنی جگہ سے نہیں ہٹتی تھیں اور اپنے آئینے میں لگے جڑ پر پٹی تیل کے ساتھ خود بھی لپٹی رشتیں۔ اماں ہزار مع کرتیں پردہ ہم ہی کیا جو مان جائیں۔ ”دادی کے ایسا کہنے پر میں ٹھکھلا کر ہنس پڑتی۔“

”اور کبھی دادی جان ”میں آپ پر ہی تو مکی ہوں۔“

میں محسوس کرتی دادی یہ سن کر خوش ہو جاتی ہیں لیکن ساتھ ہی چپ چپ سی ہوجایا کرتی ہیں اور یہ کہہ کر اٹھ جاتیں۔ ”ٹھیک ہے میں تیرے لئے پکڑے لاتی ہوں۔ پھر ہم دادی پوتی مل کر کھائیں گے۔“ اور میں ہزار بار کوشش کرنے کے باوجود بھی دادی کی اس خاموشی اور فکر کی وجہ پوچھ نہ پاتی۔

لیکن ایک بار جب مون مون کی بارشیں شروع ہوئیں تو مجھے موقع مل ہی گیا۔ اس بار بارش بھر پور انداز میں اپنا جلوہ دکھا رہی تھی ہر چیز وحلی وحلی ٹھکری ٹھکری نظر آ رہی تھی دادی لان میں بنی چھتری کے نیچے کرسی پر بیٹھی بارش سے لطف اندوز ہو رہی تھیں اور میں ان کے سامنے ہی بارش میں کھڑی بارش کی بوندوں سے کھیل رہی تھی کہ دادی کی اچانک آواز سے چونک پڑی وہ مجھے آواز دے کر اپنے پاس بلا رہی تھیں میں جلدی سے

نہنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھوکے، بارش کی بوندوں کو اپنے ساتھ لاتے اور جسم کو ہلکے جاتے، مجھے بارش بہت پسند ہے اور مون مون کی بارشیں میں ایسے ہی چھوڑ دوں ایسا ہوا بھی نہیں سکتا۔ میرا کہنا تھا کہ بارش آئے اور ہم کمروں میں بند ہو کر بیٹھ جائیں یہ بارش کے ساتھ نا انصافی ہے اور اتنی بڑی نا انصافی میں نہیں کر سکتی۔ بارش کی ایک ایک بوند کو خود میں جذب کر لیتا ہی بارش کا اصل حق ادا کرتا ہے۔ میری اس منطق پر ہر کوئی ہنستا تھا اور مجھے پاگل خطاب دے دیا جاتا۔ لیکن گھر میں ایک ہستی تھی جو میرے اس پاگل پن میں بھی میرا ساتھ دیتی تھی اور وہ تھیں میری دادی جان، عمر کے اس پڑاؤ پر اب تو وہ بارش کو بس دور بیٹھ کر دیکھ ہی پاتی تھیں لیکن بارش کے موسم کے شروع ہوتے ہی گھر میں انواع و اقسام کے کھانے ان ہی کی بدولت پکے شروع ہو جاتے اور میرے تو مزے آ جاتے۔

دادی کہا کرتی تھیں۔ ”زینتی مجھے تجھ میں اپنی جوانی دکھتی ہے مجھے بھی بارش جنوں کی حد تک پسند تھی اور تیری ہی طرح بارش کی ہر بوند کے ساتھ انصاف کرتا جیسے میرا فرض تھا۔ اور اس فرض کو پورا کرنے میں میں اکیلی نہیں ہوتی تھی نہ سب بھی میرا پورا ساتھ دیتی ہم دونوں ہمیشہ جیسی بھی بارش ہو رہی ہوئی، ٹھنڈی ہوا میں

کچھ بولیں گی لیکن جب خاموشی طویل ہونے لگی تو میں نے ہی خاموشی کو توڑا۔

”دادی جان سچ بتائیں ناں کیا بات ہے میں آپ سے ہمیشہ سے ہی یہ پوچھنا چاہتی تھی لیکن بہت نہیں ہوئی۔“

میں دادی سے دوستی کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی۔ دادی نے نگاہیں میری طرف اٹھائیں اور بولیں ”میں تمہارے لئے فکر مند رہتی ہوں گزیا۔“ مجھے سخت حیرانی نے گھیر لیا۔ ”میرے لئے.....؟ لیکن کیوں دادی جان مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے کیا.....؟“

”ارے نہیں تم تو میری جان ہو تمہاری ہر غلطی سرا آکھوں پر..... بس میں تمہیں کچھ سمجھانا چاہ رہی تھی۔“ دادی نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھا تو میری رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ ”خود دادی آپ کی ہر بات سرا آکھوں پر۔ بلکہ کوئی بات تھی تو آپ مجھے پہلے ہی کہہ دیتیں آپ کا سمجھانا مجھے اچھا لگتا ہے۔“ دادی نے پیار سے میری طرف دیکھا اور بولیں۔ ”تمہاری یہی عادتیں تو مجھے بے حد پسند ہیں۔“ میں دادی کے اور قریب آ کر بیٹھتی تو دادی نے

بھاگ کر دادی کے پاس پہنچی اور دادی کی طرف دیکھا تو وہ تھوڑی پریشان دکھائی دیں۔

”کیا ہوا دادی جان۔؟“ میں نے فکر مندی سے پوچھا تو بولیں ”کچھ نہیں بس خانماں چاٹ کی پلیٹ دے کر گیا ہے اس لئے میں نے سوچا تمہیں بلا دوں، چاٹ کھانے کا اصل مزہ تو بارش میں ہی ہے ناں پھر بارش ختم ہونے کے بعد مزہ نہیں آئے گا۔“

مجھے دادی پر پیارا آ گیا اور فوراً چاٹ کی پلیٹ اٹھائی۔ اور پھر خیال آیا تو دادی کی پلیٹ، میں ان کی طرف بڑھادی۔ دادی نے پلیٹ ہاتھ میں لے تولی تھی لیکن ان کے چہرے سے پریشانی گئی نہیں تھی۔ وہ مسلسل کچھ سوچ رہی تھیں اور مجھے چاٹ کھاتے ہوئے بھی دیکھ رہی تھیں اور اس بار میں نے ہمت کر لی لی۔ ”کیا بات ہے دادی جان آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں؟“ میرے پوچھنے پر انہوں نے پھر ایک نظر مجھے دیکھا ایک سی سانس لے کر بولیں۔ ”نہیں میں پریشان نہیں ہوں لیکن تمہاری فکر مند ہوں۔“

مجھے اندازہ ہو گیا کہ آج دادی بولنے کے موڈ میں ہیں لہذا وجہ پوچھنے لگی۔ ”دادی جان کس بات کی فکر ہے آپ کو مجھے بتائیں ناں۔“ میرا خیال تھا کہ وہ فوراً

کہنا شروع کیا ان کی کہانی ان ہی کی زبانی سنئے۔

”یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اور زنبب ابھی کالج کے آخری سال میں تھیں۔ وہ دن بھی کیسے دن تھے۔ ہماری ایک دوسرے میں جان بستی تھی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ہماری ہر پسند، ناپسند ایک جیسی تھی۔ ہمیں بارشوں کے موسم سے عشق تھا۔ اماں لاکھ منع کرتیں۔ لیکن وہ ہم ہمہ گیر کیا جوان جانتیں۔ اور پھر جیسا کہ میں تمہیں بتاتی ہی رہتی ہوں کہ جب بھی بارش ہوتی ہم وقت نہیں دیکھا کرتیں تھیں اور کھلے آنگن میں کھڑی گھنٹوں بارش سے لطف اندوز ہوتی رہتیں۔ یہ ایسا کوئی غلط فعل یا عمل بھی نہیں لیکن بہر حال احتیاط ہر چیز میں ہونا بہت لازمی ہے۔ اس بارگزی نے سب کا برا حال کیا ہوا تھا۔ ہر چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ لوگ بارشوں کی دعائیں کر رہے تھے اور ہم دونوں تو بارشوں کے انتظار میں دن گن رہی تھیں لہذا اس بار جب بارشیں ہوئیں تو ہم نے سارے گھر کو سر پرائیڈ کیا۔ اماں ابابا کی ہم جان تھیں سو وہ منع کرتے کرتے بھی ہمازی خوشی کے آگے چپ ہو جاتے تھے۔ اس بارگزی بھی تو بہت سخت تھی لہذا گھٹائیں بھی اسی حساب سے بے حساب برس رہی تھیں اور ہم سن موچی نہ دن دیکھتے نہ رات اور جب گھٹائیں چھائیں باہر آنگن کی طرف رخ کرتیں۔

اس وقت بھی بارش زور و شور سے ہو رہی تھی اور ہم دونوں ایک دوسرے میں لگن خوب شور مچا رہی تھیں کہ دقت کا پتا ہی نہ چلا کہ کب دن ڈھلا اب تو عصر سے مغرب ہونے کو آ رہی تھی اماں کی بارہیں لوگ بھی تھیں اور آواز دے چکی تھیں لیکن ہم خود میں لگن تھیں کہ ایک بار پھر اماں کی آواز آئی وہ مجھے بلارہی تھیں کہ شاید میری کسی دوست کا فون آیا تھا لہذا میں زنبب کو بھی چھوڑ کر اندر بھاگ آئی۔

فون پر میری عزیز دوست تھی اور میں اس سے باتوں میں لگن ہو گئی کاش میں اس وقت زنبب کو ساتھ ہی لے آئی یا ہم اماں کا کہنا مان لیتیں تو اس وقت وہ سب نہ ہوتا جس کا ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا شاید اماں اس لئے

بھی منع کرتی تھیں لیکن کاش کے کھل کے ایک بار سمجھا دیتیں، بنا دیتیں تو زنبب اس کھڑے دقت سے بچ جاتی۔ یا کاش ہم خود ہی اماں کی آواز سن کر اندر آ جاتیں۔

خیر اس وقت عصر اور مغرب دونوں کا وقت مل رہا تھا اور زنبب اپنی دھن میں بارش میں کھڑی اچھل کود کر رہی تھی کہ اچانک سامنے سے ایک بہت سی خوبصورت لمبی آبی نظر آئی، لمبی سے بھی بھلا کوئی ذرا ہے لہذا ایک عجیب بات ہوئی کہ وہ زنبب کے پیروں سے آ کر لپٹ گئی وہ زنبب کے چاروں طرف چکر لگا رہی تھی زنبب اپنی دھن میں مست تھی، لہذا لمبی کا اتنا لگاؤ دیکھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور اسے گود میں بیٹھا کر پیار کرنے لگی۔

اب مغرب کی اذان ہو رہی تھی اور میں کھڑکی سے زنبب کو دیکھ رہی تھی کہ اماں نے مجھ سے کہا ”بہت دیر ہو گئی ہے اندر آ بھی چھا رہا ہے زنبب کو اندر لے آؤ؟“ اماں کی بات سن کر مجھے بھی خیال آیا اور فون رکھ کر آنگن کی طرف بھاگی۔ زنبب ابھی تک لمبی کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ میں نے زنبب کو پکارا تو وہ ایسے چوکی جیسے کہ سے خواب سے جاگی ہو۔ میری آواز پر لمبی نے ایک نظر زنبب کو دیکھا میاؤں میاؤں کی آواز نکالی اور دوسری طرف چھلانگ لگادی۔

اور زنبب ایک خواب کے عالم میں اندر آ گئی۔ اماں ہمیں مسلسل ڈانٹ رہی تھیں لیکن زنبب ایسے کھڑی تھی جیسے اسے کچھ سنا ہی نہ دے رہا ہو۔ میں نے اسے بلایا۔ ”کیا ہوا زنبب؟“

لیکن اس نے میری بات کا جواب نہ دیا اور وہیں فرخ پر بیٹھ گئی اور میری اور اماں کی صورت دیکھنے لگی ہم دونوں پوری ہنسی ہوئی تھیں اس لئے اماں کو اور غصہ آیا لیکن زنبب کے منہ سے اچانک بہت دزد بھری آواز نکلی۔ ”اماں میرا سر۔۔۔“ زنبب کی آواز میں بہت غیر معمولی پن تھا۔

بھی اماں ایک دم خاموش ہو گئیں اور لپک

کرنیب کی طرف بڑھیں ”کیا ہوا تم ٹھیک زندہ۔۔۔؟“ اماں پوچھ رہی تھیں اور میں بھی کرنیب کے سامنے موجود تھی اور اسے بھرپور لگا ہوں سے دیکھ رہی تھی۔ زنبب نے بائیں ایک بار پھر کہا۔

”اماں میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔“ اماں کی نظر اس کے پیچھے کپڑوں پر گئی تو بولیں۔ ”چلو اٹھو پہلے کپڑے بدل لو ورنہ ٹھنڈ لگ جائے گی سر میں درد بھی اسی لئے ہو رہا ہوگا۔“ فرخ سے زنبب اٹھنے کی کوشش کرتے کرتے نیچے گری اور بے ہوش ہو گئی۔

اور پھر جب زنبب کو ہوش آیا تو وہ نارمل ہو چکی تھی لیکن اماں نے مجھ سے کہا کہ کپڑا پانڈی لگا دی کہ اب ہم بارش میں نہیں نکلیں گی یہ سن کر مجھے تو بہت افسوس ہوا ہاتھ اور میں ابابا کو ماننے کی ترکیب سوچنے لگی مگر لگتا تھا کہ زنبب کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا میرے لاکھ بار پوچھنے پر بھی وہ صرف مجھے گھورتی رہتی تھی۔ لگتا تھا اسے اپنا ہی کوئی ہوش نہیں ہے۔ ہر وقت خلاؤں میں گھورتی رہتی، کوئی ضد نہ کرتی بارش آئی اور طلی جاتی لیکن وہ چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ مجھ سے بھی باتیں کرنا بند کر دیا تھا۔

اماں اور میرا خیال تھا کہ وہ ناراض ہو گئی ہے لہذا اماں اسے منانے کے لئے اس کی پسند کی ساری چیزیں مانیں لیکن وہ ان میں سے کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگائی تھی میں اسکیے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ اس کی اس ہمارا خاموشی سے مجھے بھی ڈر لگنے لگا تھا جب وہ رات کو کمرے میں اندر آ کر کے سوئی تو میں لائٹ جلانے کو گئی کیونکہ ہمیں روشنی کر کے سونے کی عادت تھی اور زنبب کو تو اندر سے سے بہت ڈر لگتا تھا لیکن اندر سے میں ہی وہ مجھ سے کہتی ”تم باہر جا کر سو جاؤ۔“ اور میری ہمت نہ ہوتی کہ میں زنبب کو کچھ کہہ سکوں گی وہیں سو جاتی اور میری خاموشی سے اٹھ کر اماں کے پاس آ کر سو جاتی۔ کہاں تو زنبب کی فرمائش ہی ختم نہ ہوتی تھی اور اب لگتا ہے وہ گھر میں ہی موجود نہیں ہے

ڈرڈا بجسٹ کی مشہور و معروف کتابیں

75/-	پراسرار کہانیاں
75/-	دہشت ناک کہانیاں
75/-	حیرت انگیز کہانیاں
75/-	خوفناک کہانیاں
75/-	ڈراؤنی کہانیاں
75/-	آئینی کہانیاں
75/-	بھانک کہانیاں
75/-	خوفزدہ کہانیاں
75/-	ناگ دیوتا (مکمل ناول)
75/-	پشاپاز دیوی (مکمل ناول)
75/-	پھندا (مکمل ناول)
75/-	قیدی روحیں (مکمل ناول)
75/-	غیبی آواز (مکمل ناول)
75/-	روح بیتی (مکمل ناول)
150/-	یوتاف (مکمل ناول) مجلد
150/-	مداری (مکمل ناول) مجلد
150/-	طلسم زاد (مکمل ناول) مجلد
150/-	بنت فرعون (مکمل ناول) مجلد
150/-	ہمزاد کا شوق (مکمل ناول) مجلد
150/-	بجنور (مکمل ناول) مجلد
450/-	جادوگر (مکمل ناول) مجلد
200/-	اوتار (مکمل ناول) مجلد
60/-	لے ہاتھ
60/-	بھگتی روح
60/-	لاٹ کا چنگامہ

شعب بک اینجینی اردو بازار کراچی

فون: 32773302

ہمارے ساتھ ساتھ ابانے بھی اس کی خاموشی کو محسوس کیا اور نینب سے کئی بار بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ صرف گھورتی رہتی جس سے ابا اور پریشان ہو جاتے۔

اماں، ابا کا خیال تھا کہ سر کے درد اور بے ہوشی کی وجہ سے نینب کے دماغ پر شاید کچھ اثر پڑا ہے لہذا کئی ڈاکٹر زکوڈیکھا لیکن سب نے اسے صحت مند قرار دیا اور کہا: ”بچی نے شاید آپ کی باتیں دل پر لے لی ہیں کچھ دنوں میں خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔“

لیکن نینب کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی میلے کپڑے کئی کئی دن تک پہنے رہتی، بال بھی بکھرے رہتے اماں مجھے سمجھاتیں بہن کو اکیلا مت چھوڑا کرو اپنے ساتھ کام میں لگائے رکھا کرو تاکہ اس کا دل پہلے اور خود بھی کام کرتے وقت نینب کو اپنے ساتھ بیٹھالیتی اماں کی عادت تھی کہ نماز کے بعد سورۃ یاسین ضرور پڑھتی تھیں۔

ایک بار ایسا ہوا کہ جیسے ہی اماں نے سورۃ یاسین پڑھنا شروع کی نینب کی حالت بگڑنا شروع ہو گئی اور وہ چیخ کر کمرے سے باہر بھاگ گئی۔

میں اور اماں اس کی حالت دیکھ کر سکتے میں آگئی ابا کو بتایا تو ابا کچھ سوچ کر مولوی صاحب کو بلا لائے، مولوی صاحب نے نینب کو اپنے پاس بیٹھایا اور کچھ حساب لگانے لگے۔ نینب کی آنکھیں ویران پڑی تھیں۔ وہ حساب لگاتے لگاتے چونک پڑے اور قرآنی آیات پڑھتے پڑھتے نینب کی ہتھیلی کھول کر کچھ دیکھا۔ مولوی صاحب کے چہرے پر پریشانی دیکھی جاسکتی تھی۔

وہ بولے: ”بچی کا پچھلے دنوں کیا کہیں اکیلے جانا ہوا ہے یا پھر کوئی ایسی جگہ جہاں وہ کچھ وقت اکیلے رہی ہو؟“

اماں ابا دونوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ گھر میں کوئی پالتو جانور ہے جو بچی کے ساتھ رہتا ہو؟“ مولوی صاحب نے پھر پوچھا۔

اماں نے اس بار بھی نفی میں سر ہلا دیا۔

”بچی آپ مجھے نہیں بتاؤ گی کہ کیا بات ہے دیکھا کوئی چیز آپ کو پریشان کر رہی ہے؟“ مولوی صاحب اس بار نینب سے مخاطب ہوئے تو نینب ایک دم بے چین ہو کر اٹھی لگتا لگتا تھا شاید وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

نینب کی حالت دیکھ کر مولوی صاحب نے اس سے اور کچھ نہیں پوچھا اور اٹھ کر باہر چلے آئے مولوی صاحب نے ہماری طرف دیکھا اور فکر مندی سے گویا ہوئے مجھے بچی پر کسی چیز کا سایہ محسوس ہو رہا ہے اور وہ بچی پر جانور کی شکل میں۔ آپ مجھے بتائیں کہ اس کی یہ حالت کب سے ہے۔

اماں نے اس دن کا سارا واقعہ کہہ سنایا لیکن اماں بارش والی بات کے بارے میں نہیں جانتی تھیں لہذا میں نے مولوی صاحب کو اس کے بارے میں مکمل رواداد سنا دی تو انہیں کوئی شک نہ رہا اور جاتے جاتے وہ واپس آنے کا کہہ کر چلے گئے اور ساتھ ہی پانی پر دم کر کے نینب کو پلایا اور ایک تعویذ بھی اس کے گلے میں ڈال گئے۔

تعویذ ڈالتے ہوئے نینب نے مولوی صاحب کا ہاتھ بہت سختی سے پکڑ لیا تھا جسے انہوں نے نظر انداز کر کے کچھ پڑھا اور نینب پر بھونک ماری تو اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا اور اس کے گلے میں تعویذ ڈال کر چلے گئے۔

نینب کی حالت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی وہ ہر وقت چیختی چلاتی رہتی کبھی: ”اس تعویذ کو میرے گلے سے ہٹا دو میرا دم گھٹ رہا ہے۔“ کبھی کبھی: ”کوئی میرا گلہ دار رہا ہے میری سانس بند ہو رہی ہے۔“

اس دوران اماں مسلسل روٹی رکھیں اور میں بھی اماں اور کبھی نینب کو سنبھالتی۔ مولوی صاحب نے تعویذ کی صورت بھی گلے سے اتارنے سے منع کیا تھا مغرب تک نینب کی حالت ایسی ہی رہتی پھر وہ بے ہوش ہو جاتی اور جب ہوش آتا تو غلاہ میں گھورتی رہتی۔

میں مولوی صاحب کا بے چینی سے انتظار

تا۔ دوسرے دن وہ چلے آئے تو ہمیں روشنی کی کرن نظر آئی اور امید ایک بار پھر جاگ اٹھی، مولوی صاحب کے ساتھ ایک بزرگ بھی تھے۔

مولوی صاحب میرے ابو سے بولے ”محبوب صاحب آپ پریشان نہ ہوں آپ دیکھئے گا نینب بچی کو اس جن سے فوراً نجات مل جائے گی۔“ مولوی صاحب نے ایک عزم سے کہا:!

”آپ کا بہت بڑا احسان ہو گا مجھ پر مولوی صاحب! ابا بولے۔“ آپ اندر آ جائیں۔“ ابا نے ان کے لئے راستہ چھوڑا اور وہ بزرگ بولے: ”اندر تو ہم آئی تھے ہیں۔ جنید صاحب آپ بس ذرا ہمیں بچی کا کر دیکھا دیجیے۔ اب ذرا اس جن کی بھی خبر لیں۔“

ابا نے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو بزرگ نے اپنی آنکھیں بند کیں اور کچھ پڑھتے ہوئے آگے بڑھے، ساتھ ہی ان کے ہاتھ میں جو شیخ تھی اس کے دلے بھی گرائے گئے۔

کمرے کے قریب پہنچ کر مولوی صاحب نے کہا: ”ٹھیک ہے آپ دروازہ کھولے۔“ ابا نے بہت کوشش کی لیکن دروازہ نہ کھلا ابا نے دروازہ بجایا لیکن اندر سے کوئی آواز نہ آئی تو بزرگ خود ہی آگے بڑھے اور اپنے دونوں ہاتھ دروازے پر رکھ کر کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ دروازہ پہلے تو ہلنے لگا اور پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی کھل گیا۔ کمرے کی لائٹ آف تھی اور معمول سے زیادہ اندھیر اور خاموشی تھی۔

مولوی صاحب نے ہم سب کو باہر رکنے کا اشارہ کیا تو ابائی سے رہانہ گیا تو وہ آگے بڑھے تو انہیں روکا۔

بزرگ نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا تو اندر سے نینب کی ایک بمیانیک چیخ سنائی دی، ہم سب پر خوف طاری تھا۔ کسی بے لگی حسلس آواز آنا شروع ہوئی تھی۔ وہ بہت زور زور سے غرار ہاتھ تھا۔ نینب بھی اس حسلس چیخ رہی تھی۔ ”اماں مجھے بچا دیجیے مجھے مار ڈالے گا دیکھئے بہت زور لگ رہا ہے میری مدد کرو۔“

نینب کی آواز ایک دم بدل گئی۔ وہ بہت

استاد

استاد شاگرد سے۔ بتاؤ 1876ء

کو کیا ہوا تھا۔

شاگرد۔ پتہ نہیں

استاد۔ قائد اعظم پیدا ہوئے تھے۔

استاد۔ اچھا 1881ء کو کیا ہوا تھا۔

شاگرد۔ جناب قائد اعظم 5 سال کے

ہو گئے تھے۔

(صغیر حسین رسوائے سدھو)

بھیا یک انداز میں چیختی۔

”چلا جا یہاں سے ورنہ بہت برا ہوگا۔“

اس بار بزرگ بولے۔ ”چلے جائیں گے لیکن

تو کیوں اندھیرے میں چھپتا ہے سامنے کیوں نہیں

آتا؟“

”شکر کر میں سامنے نہیں آ رہا اگر سامنے آ گیا

تو تیری خیر نہیں ہے چلا جا یہاں سے۔“ پھر آواز آئی

تو بزرگ ایک قدم اور آگے بڑھے اور بولے۔

”میں کیوں چلا جاؤں تو کیوں نہیں چلا جاتا۔

یہ تیرا مسکن نہیں ہے۔“

”ہم اپنا مسکن خود تلاش کرتے ہیں۔ تو مجھے

مت سیکھا۔ اب یہیں میرا بھیرا ہے۔“

”بزرگ کو غصہ آ گیا تھا اور اتنی دیر میں

انہوں نے کچھ پڑھ کر اندھیرے ہی میں پھونک مار دی

اور لائٹ جل اٹھی۔ نینب کمرے کے ایک کونے میں

کھڑی غرار ہی تھی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکل رہی

تھیں ابا اس کے قریب جانے لگے تو انہیں روک دیا

گیا۔ ”آپ قریب نہ جائیں۔“

”بزرگ بولے۔“ یہ تیرا بھیرا نہیں ہے۔ اس

بچی کو چھوڑ دے۔“

نینب بہت خوف ناک انداز میں ہنسی۔



راج دلاری

ایس احتیاز احمد - کراچی

آسمان پر اچانک دودھیا روشنی پھیل گئی، پھر لوگوں نے دیکھا کہ وہ روشنی آہستہ آہستہ زمین کی طرف آنے لگی، جب روشنی بالکل نینچے آگئی تو لوگوں کی آنکھیں چندھیا گئیں اور پھر لوگوں کے سامنے اچانک۔۔۔

صدیوں پر محیط عجیب و غریب سوچ کی حامل ناقابل فراموش۔۔۔ دل کو مسونی کہانی

پہلی باری میں راج دلاوی کا نام سنا تو کرے لیکن جب "راج دلاوی، راج دلاوی" کا نام کوئی توجہ نہیں دی۔ اس لئے کہ ہندوؤں میں عورتوں کے نام عام طور پر اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

"راج دلاوی" لیکن جب دوسری باری میں نام سنا تو سوچنے لگا کہ یہ راج دلاوی ہے کون؟ لیکن پوچھنے کی پھر بھی اس سے بہت نہیں ہوئی کہ ماتحت عملہ نہ معلوم کیا خیال کرے لیکن جب "راج دلاوی" نام کی لڑکی رام پور میں تھی۔ جس کے متعلق طرح طرح کے مافوق الفطرت

بلے نے حصار کے چاروں طرف ایک چکر مارا اور ہوا میں غائب ہو گیا، ہم سب خوف کے مارے غرقِ کائنات رہے تھے اور اپنی اپنی جگہ جم کر رہ گئے تھے۔ اس منظر ہم نے اپنے خواب میں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن بزرگ اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھے تھے اور ان کے چہرے پر اب مسکراہٹ تھی۔ وہ مولوی صاحب اور باجی کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے آپ بی بی کو اندر لے جائیں اور سلا دیجیے جب یہ سچ اٹھے گی تو سب ٹھیک ہوگا۔"

اباننہ کو اندر لے آئے تو اماں نے اپنے کمرے میں اسے سلا دیا۔

بزرگ اباجی سے مخاطب ہوئے۔ "اس جن کا خاتمہ ہو چکا ہے اور جو باہر آپ نے دیکھا وہ اس کا ساتھی تھا لیکن اب وہ آپ کو تک نہیں کرے گا۔"

یہ سن کر اباجی اور ہماری جان میں جان آئی اور ہم نے مولوی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ کہ اگر وہ نہ ہوتے اور ہمارا ساتھ نہ دیتے تو نہ جانے کتنا کھانا کھاتا۔

داوی نے اپنی کہانی ختم کی اور مجھے مخاطب کیا۔ "زبانی میں تمہیں بس یہی سمجھانا چاہتی تھی کہ میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں کہ میں تمہارے ساتھ کب تک ہوں لیکن تم اپنا خیال خود رکھا کرو، ذرا سی احتیاط سے ہم بہت بڑی بڑی آزمائشوں سے بچا سکتے ہیں۔"

میں نے داوی کی یہ بات سنی تو داوی کے گلے لگ گئی اور وعدہ کیا "داوی ایسا نہ بولیں، اللہ! آپ کی عمر دوا کرے، میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کی ہر بات پر عمل کروں گی۔"

تمام بہنوں سے میری گزارش ہے کہ وہ بھی ذرا سی احتیاط سے خود کو محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے (آمین)۔



"کتنے نادان ہیں تو کیا تو نہیں جانتا ہم جہاں بھیرا کرتے ہیں وہاں سے اتنی آسانی سے نہیں جاتے۔" اور یہ کہہ کر وہ ہانگوں کی طرح آگے بڑھی، اگر مولوی صاحب اور اباجی نے اسے نہ پکڑ لیا ہوتا تو وہ بزرگ کا منہ نوج چلی ہوتی۔ نینب بہت دھان پان سی لڑی تھی۔ لیکن اس وقت اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ بزرگ مسلسل کچھ پڑھ رہے تھے۔ نینب کے قریب آتے ہی انہوں نے اس پر پھونک ماری اور اپنے ساتھ لائی ہوئی رسی سے اسے باندھ دیا۔ پھر انہوں نے اباجی اور مولوی صاحب کی مدد سے اسے اٹھایا اور باہر آگلیں میں لے آئے۔

نینب مسلسل جھج رہی تھی بزرگ نے جلدی سے سب کے گرد ایک حصار کھینچی اور زمین پر بیٹھ گئے۔

بزرگ کی آواز سنائی دی "جا چلا جا یہاں سے جہاں سے تو آیا ہے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" لیکن نینب مسلسل جھج رہی اور مولوی صاحب اور بزرگ کو برا بھلا کہتی رہی اس کے بعد بزرگ نے ہم سے ایک بائلی پانی لانے کو کہا اور ساتھ ہی ساتھ کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد بزرگ نے اس جگہ ایک چھوٹا گڑھا کھودا اور پھر اس گڑھے میں بائلی سے پانی نکال نکال کر اس گڑھے میں ڈالنے لگے۔

ہم سب حیران تھے کہ آدھی بائلی پانی ڈالنے کے باوجود وہ گڑھا خشک تھا، پانی گڑھے میں پڑتے ہی غائب ہو جاتا تھا، یہ عمل بھی وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک کرتے رہے کہ نینب ایک دم سے خاموش ہو گئی۔

ہم سب حیران تھے کہ بچا ایک کچھ فاصلے پر سے ایک بلاغہ دوڑا ہوا اور بزرگ کے حصار سے کچھ دور آ کر بیٹھ گیا۔ وہ بزرگ کو گھور رہا تھا اور غرارہا تھا بزرگ نے آنکھیں کھولیں اور اسے دیکھا۔ "جا چلا جا یہاں سے ورنہ تیرا حشر بھی تیرے اس ساتھی جیسا ہوگا۔"

کہانیاں منسوب تھیں۔ میں نے جو کچھ بھی اس کے بارے میں سنا اس پر یقین کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ یہ ایسی کھرت کہانیاں تھیں جن کو انسانی عقل کسی صورت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

میرا حال ہی میں رام پور میں تبادلہ ہوا تھا۔ یہ دو گاؤں کے مجموعہ کا نام ہے ان میں سے ایک رام ہے۔ یہاں بدھ مذہب کی بڑی بڑی یادگاریں۔ پہاڑ پر بہت بڑے بڑے اسٹوپ بنے ہوئے ہیں۔ منگہ آثار قدیمہ نے دو میل سے زائد رقبے میں چار دیواری تعمیر کر کے ان آثار کا حصار کر لیا ہے۔ جگہ جگہ گوتم بدھ کے بڑے بڑے بت رکھے ہوئے ہیں پتھروں کی سلوں پر تحریرات اور تصاویر کندہ ہیں۔ ان سب چیزوں کے علاوہ ایک عجائب گھر بھی پہاڑ پر بنا ہوا ہے۔ اس میں اس دور کی ہر چیز موجود ہے۔ یہاں سونی سونی کتابیں موجود ہیں جو بتوں اور متعلقہ چیزوں کی مکمل تاریخ ہیں۔

تاریخ اور آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ دنیا کے ہر حصے سے یہاں آتے ہیں۔ جن کے قیام کے لئے پہاڑی سے نیچے سرکاری ڈاک بنگلے بنے ہوئے ہیں۔ ان بنگلوں میں آسائش اور ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ اس کے علاوہ کھانے کے انتظام کے لئے باورچی اور ٹشی وغیرہ بھی موجود رہتے ہیں۔ ڈاک بنگلوں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔ آثار سے قریب پہاڑ پر ہی رام نام کا گاؤں آباد ہے۔ اسی پہاڑ سے نیچے پورنام کا گاؤں ہے۔ اس سے کچھ دواڑ چل کر سرسک کے کنارے کا بھون نای گاؤں ہے۔ یہ بھی پال کا سرحدی گاؤں ہے۔

یہ تمام علاقہ پہاڑی اور میدانی ہے۔ اونچے نیچے پہاڑوں اور میدانیوں میں سرسبز تھانور درخت کثرت کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں۔ بھون کے پہاڑی گھروں میں کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو ریلوے لائن کے اس پار موضع منڈوالی دکھائی دیتا ہے۔ دوسری جانب موضع بھون ہے جس کے نیچے ایک کشادہ مذہبی بستی ہے۔ ان

موضع جات میں کشم کے ناکے جیسا ہواں تاکیدار اور سپاہی تعینات ہیں۔

تبادلہ پر آنے کے دو ہفتے بعد میں گشت پر نکلا۔ اریا چوڑہ اور بہار کا محاسبہ کرتے ہوئے مجھے کئی دن صرف ہو گئے۔ یہ بارش کا موسم تھا اور ان دنوں موسلا دھار بارش ہونے کی وجہ سے ندی نالے طغیانی پر تھے جس کی وجہ سے مجھے کئی دن قیام کرنا پڑا۔ بہار سے جس وقت روانہ ہوا تو شام ہونے والی تھی۔ ناکے دار اور سپاہی نے مجھے روکا بھی لیکن میں نے کوئی خیال نہیں کیا اور گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ جس دقت پور اور رام پور کے درمیان پہنچا تو بارش میں تیزی آ گئی۔ اندھیری رات ہونے کی وجہ سے قد آدم گھاس میں راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اندازے سے چلتا ہوا جب ایک جگہ پہنچا تو تالہ پورے شباب کے ساتھ طغیانی پر تھا۔ کچھ دیر تک گھڑا ہوا سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہئے؟ آخر یہی فیصلہ کیا کہ واپس ہو کر کسی طرح رام گاؤں پہنچا جائے۔ گھوڑے کو پٹلا کر اندازے سے روانہ ہوا لیکن اندازہ غلط ہی رہا۔ کافی دیر تک بھٹکنے کے بعد بھی پور تک پہنچنے کی کوئی سہیل نظر نہ آئی۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ شاید آج تمام رات یونہی بانی پانی میں بھیٹنے ہوئے بھٹکتا رہے گا۔

ایک ایک ایک بار زور سے بجلی چمکی جس کی روشنی میں کچھ دوری پر کسی ساڑھی پر بنی ہوئی چھتری دکھائی دی۔ میں نے اس وقت اس کو ہی غیبت جانا۔ وہی مرگھٹ میں اندھیری رات گزارنا کچھ خوش بات نہیں تھی لیکن مرنا کیانہ کرتا کے مصداق مرگھٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ کچھ دور چلے پر مجھے چھتری کے پاس ایک ٹھکانے ہوئے چراغ کی روشنی دکھائی دی۔

”کیا یہاں کوئی رہتا ہے؟“ میں نے دل میں سوچا۔ ”دیکھا جائے گا۔ اس وقت اگر کوئی بھوت بھی ہوتا تو میں اس کے گھر میں بھی ٹھہر جاؤں گا۔ اس بارش میں بھیٹنے سے بہتر تو یہی ہوگا کہ تمام رات بھوت سے غی دل لگی رہے۔“

یہی کچھ سوچتا ہوا میں مرگھٹ کی جانب بڑھتا لیکن جب میں مرگھٹ کے حدود میں داخل ہوا تو جا کر ساڑھی کی چھتری کے قریب ایک کینیا بنی ہوئی جس میں سے وہ روشنی آ رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ اس کینیا میں انسان ہی رہتا ہوگا ورنہ بھوت کو مکان پر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ روشنی اور گھر دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا۔ وہ غریب بھی مسلسل کئی گھنٹے سے بارش اور کچھ میں پھرتے ہوئے پریشان ہو رہا تھا۔ گھوڑے کے نہانے کی آواز سن کر کینیا کا

دروازہ کھلا اور گروا (گہرے نیلے) رنگ کی کفن بننے ایک ساڑھی پانچ کر آیا۔ یہ بہت ضعیف آدمی تھا مگر اور ساڑھی کے بالوں کے علاوہ بھنوس تک سفید تھیں۔ اس نے پہلے مجھے بڑے تعجب کے ساتھ دیکھا پھر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”حضور رات کی کوپ کہاں؟“

میں نے ساڑھی کو بغور دیکھا اور پھر گھوڑے سے اترنے ہوئے کہا۔ ”مہاراج۔ بارش کی وجہ سے ندی نالے پورے طغیانی پر ہیں اس لئے آج رات شاید آپ کے پاس ٹھہرنا ہوگا۔“

”بڑی خوشی کی بات ہے حضور۔ مگر آپ کو شاید آپ کی شان کے مطابق آرام نہ مل سکے گا۔“

”کوئی بات نہیں۔“

”آپ اندر چلیں میں گھوڑا باندھ کر ابھی آتا ہوں۔“

گھوڑے کی۔ لگام ساڑھی کو دے کر میں کینیا میں داخل ہو گیا ایک کونے میں صاف ستھرا کمر بچھا ہوا تھا۔ درمیان میں آگ جل رہی تھی۔ پاس میں ہی سرگ چھالا بچھا ہوا تھا۔ ساڑھی کے دھونی لگانے کا ٹکڑہ تھا۔ میں نے برساتی اور ہیٹ اتار کر دروازے کے قریب لٹکا دیا۔ جوتے اور مونڑے اتار کر ایک طرف بٹنگ اور خود آگ کے پاس جا بیٹھا۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی کہ ساڑھی گھوڑا باندھ کر میرے قریب آ بیٹھا۔

”یہاں سے رام کتنی دور ہے؟“ میں نے ساڑھی

سے پوچھا۔ ”دو کوس (چار میل)۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ میں چار میل کے اندر ہی اب تک چکر لگا تا رہا۔ بہر حال اب تو پریشان ہو چکا تھا اور اس وقت دوبارہ روانہ ہونا بھی کچھ مناسب نہیں تھا اس لئے رات یہیں کاٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

”حضور کھانے کے لئے کچھ پیش کروں؟“ ساڑھی نے پوچھا۔ ”نہیں مہاراج۔ اس کی ضرورت نہیں ہے تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ یہ تو بتاؤ کہ کس کی ساڑھی ہے؟“

”لنگا چمار اور اس کی بیوی کی۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ چمار کی اور ساڑھی؟ یہ کیسی انوکھی بات تھی اور پھر اس پر ساڑھی استعانت یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی۔

”مطلب یہ ہے کہ جن کی یہ ساڑھی ہے وہ اتنی عظیم شخصیتیں تھیں کہ ان کا ثانی ابھی تک کوئی پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ اور آج سینکڑوں برس سے ہمارا خاندان اس ساڑھی کی خدمت کر رہا ہے۔ ہم برہمن لوگ اس سلامتی کی خدمت کرتے ہیں یہ واقعی تعجب کی بات ہے لیکن اس ساڑھی کے ہاشی لاکھوں برہمنوں سے بہتر تھے۔“

”مہاراج بات سمجھ میں نہیں آئی ذرا تفصیل سے بتاؤ۔“

”حضور یہ لمبی لیکن حقیقت پر مبنی کہانی ہے۔ کیا سنیں گے؟“

”خبر سنوں گا۔“ میں نے کہا دیے مجھے بھی رات گزاری کے لئے یہی صورت بہتر معلوم ہوئی کہ زیادہ سے زیادہ وقت باتوں میں گزارا جائے۔

”آج سے سینکڑوں برس پہلے کی بات ہے۔“

مہاراج نے کہانی شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”رام پور میں ایک لڑکی راج دلاری تھی۔“

”راج دلاری؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”تو یہ بھی راج دلاری کا قصہ ہے۔“

”ہاں بیٹا یہ راج دلاری کا ہی قصہ ہے۔ راج

والاری گونگا چمار کے یہاں پیدا ہوئی۔ لیکن پیدائش کے وقت ایسے عجیب و غریب اور پراسرار حالات رونما ہوئے جس کی بناء پر مال باپ کے علاوہ گاؤں والے بھی پریشان ہو گئے۔

جس رات یہ لڑکی پیدا ہوئی وہ پورنماش کی رات تھی۔ لیکن اس دن شام کے وقت سے ہی تیز ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں اور پھر جیسے جیسے رات زیادہ ہو رہی تھی اسی طرح سے ہوا بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ دس گیارہ بجے رات کو ہوائے طوفانی صورت اختیار کر چکی تھی۔ ہوا کی وجہ سے اتنا گرد و غبار اٹھا کہ چاند چھپ گیا مگر ہلکی ہلکی روشنی پھر بھی باقی تھی۔ درختوں کے پتوں میں سے گزرتی ہوائیں سیٹیاں بجارہی تھیں اور ان سیٹوں کی آوازوں میں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہزاروں بھوت تاج رہے ہیں۔ اور یہ غلط بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ بھوتوں کو ناپتے ہوئے تو نہیں دیکھا جاسکتا لیکن ہر شخص کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے انسان کی قسم کے کچھ لوگ آسمان سے اتر کر زمین پر آ جا رہے ہیں۔ ان آنے جانے والوں کو لوگ دیکھنے کے بجائے صرف محسوس کر رہے تھے۔

طوفانی ہواؤں کی وجہ سے عورتیں اپنے اپنے بچوں کو لے کر گھروں میں چھپ گئی تھیں لیکن مردوں کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی نئی بات ہونے والی ہے۔ طوفان سے انہیں کوئی ڈر نہیں تھا اس لئے کہ اس قسم کے طوفان تو آتے ہی رہتے ہیں لیکن حیات کی بناء پر ان کے دل بے چینی محسوس کر رہے تھے اور ہر شخص یہی سوچ رہا تھا کہ کوئی کچھ ہونے والا ہے۔

رات کو کوئی گیارہ بجے یعنی لڑکی کی پیدائش سے ایک گھنٹہ قبل ہلکی ہلکی روشنی کے ہالے آسمان سے اترنا شروع ہوئے۔ ہر شخص ان کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ ان سب کا رخ گونگا چمار کے گھر کی جانب تھا۔ گاؤں کے سب مرد یہی کرشمہ دیکھ رہے تھے لیکن کسی کے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

ٹھوڑی دیر کے بعد ان بادلوں میں ایک خاص صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ہالے جس طرح اتر رہے تھے

اسی طرح ان میں سے کچھ واپس بھی جا رہے تھے اور اب صرف آنے والوں کا ہی نہیں بلکہ جانے والوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔

ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ایک اور چیز رونما ہوئی یعنی اب بادلوں کے بجائے انسان اترنے لگے۔ معلوم ہو رہا ہے تھے ان کے جسم تو اچھی طرح دکھائی دے رہے تھے لیکن ان جسموں کے متعلق کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس قسم کے جسم ہیں جو ہوا میں تحلیل ہونے کے بعد بھی جسم ہی معلوم ہو رہے تھے۔ سب سے پہلے تو ایک ایسے مرد اترے جو صرف ساڑھی نما وحنی باندھے ہوئے تھے اور اس وحنی کا ایک پلو ان کے کاغذوں پر تھا۔ سر، داڑھی اور مونچھ کے بال بالکل صاف تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں عجیب طرز کا برتن تھا ایسا سلوم ہوتا تھا کہ اس میں پانی ہے اور دوسرے ہاتھ میں پھولوں کی ڈالیاں تھیں۔ لیکن جس طرح سے ان لوگوں کی ہر چیز عجیب و غریب تھی اسی طرح یہ پھول بھی عجیب نم کے تھے۔ کسی نے بھی ایسے پھول بھی نہیں دیکھے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے پھول ہزاروں سال قبل بھی ہوتے ہوں لیکن اب ان کا وجود ختم ہو چکا ہے۔ آنے والوں کی تعداد پندرہ تھی لیکن حلیے اور وضع قطع سے یہ مذہبی آدمی معلوم ہوتے تھے یا پھر یہ اس زمانے کے وید ہوں کے لیکن یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

ان لوگوں کے اترنے کے بعد عورتوں کے اترنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ عورتیں اچھائی حسین نوجوان اور نورانی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ بھی ساڑھیاں باندھے ہوئے تھیں مگر ان کے ہاتھوں میں کچھ دوسری چیزیں تھیں۔ سب سے آگے جو عورت تھی اس کے ہاتھ میں عودواں تھا جس سے نورانی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اس میں شاید عود و جڑیں کی کوئی چیز ڈال کر جلائی جا رہی تھی۔ عودواں سے نکلی ہوئی خوشبو کی لپٹیوں سے پوری فضا معطر ہو رہی تھی۔ چاروں طرف عطر بیز ہوا میں چل رہی تھی اور جو خوشبو لوگ سونگھ رہے تھے وہ ایک قسم کی نہیں تھی بلکہ کسی ایک قسم کی

روبو آئی اور کبھی دوسرے قسم کی۔

اس عورت کے پیچھے کثرت سے عورتیں تھیں۔ ہر طرح طریقے سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں عجیب قسم کے سامان تھے لیکن ان کو سمجھنے کے بعد اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ یہ سب سامان ہی کے متعلق ہے۔ یہ عورتیں کورس کے انداز میں کوئی کتہہ پڑھ رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کسی قسم کی دعا ہو لیکن ان کا کسی اداسگی سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

ابھی اس قسم کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک آسمان پر روشنی کا ایک بہت بڑا گولہ نمودار ہوا۔ سب لوگ گہرا کراس کی جانب دیکھنے لگے کہ دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔ جس وقت یہ گولہ زمین کی طرف آ رہا تھا اس وقت آدمی رات کا وقت تھا۔

جب وہ نورانی گولہ زمین کے قریب پہنچا تو اس وقت لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ جس کو وہ گولہ سمجھ رہے تھے وہ ایک اتنا بڑا ہالہ تھا جس کی وسعت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس ہالے میں آگے آگے کافی تعداد میں پہلی گھوڑوں پر سوار تھے۔ یہ ایک ہاتھ میں راس اور دوسرے میں نیزہ پکڑے ہوئے تھے۔ پہلو میں بڑے چمچ کا خنجر لٹک رہا تھا۔ پیٹھ پر ڈھال اور گالے پر رکنا تھی۔ ترش اس قسم کے تیروں سے گھروے ہوئے تھے۔ یہ فوجی بڑے منظم طریقے سے نیچے اتر رہے تھے۔

گھر سواروں کے پیچھے رتھوں کی قطار تھی۔ ان میں بھی فوجی سوار تھے۔ ان رتھ سواروں کی بھی شان و شوکت تھی۔ ہر ایک فوجی اسلحہ سے لیس گھوڑوں کی باگیں باندھے ہوئے رتھ میں کھڑا تھا۔

رتھوں کی لائن ختم ہونے کے بعد پھر کچھ لوگ سامنے آئے۔ اس سامان کو اٹھانے والے شکل و صورت سے غلام دکھائی دے رہے تھے۔ تمام سامان قیمتی اور عجیب وضع کا تھا۔ اس کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بچے کی پیدائش کے سلسلہ میں لایا جا رہا ہے۔ اس سامان میں ایک بہت قیمتی

گہوارہ تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے گدے لٹکے گئے ہوئے تھے۔ تھالوں میں چھوٹے چھوٹے کھلونے اور گھنٹیاں تھیں۔ کچھ تھالوں میں بچے کے نئے جڑاؤ زیورات اور کپڑے تھے۔ ایک تھالی میں چھوٹا سا تاج بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ تمام لوازمات کسی بچے کے لئے ہی ہو سکتے تھے۔

ابھی لوگ یہ سب چیزیں دیکھ ہی رہے تھے کہ ہالے کی روشنی تیز ہونا شروع ہو گئی۔ پھر وہ روشنی اتنی زیادہ تیز ہوئی کہ آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ یکا یک کچھ اور ہی نقشہ نظر آیا۔ وہ تھا تخت شای۔ اس کو چالیس آدمی اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ چھپر شای پورا کا پورا سنہری تھا اور اس میں کثرت سے چھوٹے بڑے ہر رنگ برنگے ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ ان کی جگہ جگہ پر آنکھیں گھبر رہی تھی۔ اس تخت پر ایک دیوتا اور ایک دیوی بیٹھے ہوئے تھے دونوں کے سروں پر جڑاؤ تاج تھے دیوتا کے ہاتھ میں ایک جڑاؤ چھڑی بھی تھی۔

تخت شای سیدھا گونگا چمار کے گھر پر اتر آ۔ اس وقت ٹھیک آدمی رات تھی۔ یکا یک فضا میں ایک گولہ بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف نورانی، ہلکی ٹھنڈی اور درد دھماکی روشنی پھیل گئی۔ روشنی کے پھیلنے ہی گونگا چمار کے گھر سے سوپ بجنے کی آواز سنائی دی۔

دیہات میں دستور ہے کہ گھر میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو پیدائش کے بعد اگر لڑکا ہو تو تھالی اور لڑکی ہو تو دانی فوراً سوپ بجائی ہے۔ اس سے آس پاس کے گھروں میں معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا پیدا ہوا ہے۔

سوپ کی آواز سن کر سب کو معلوم ہو گیا کہ گونگا کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن ابھی سوپ کی آواز بند ہی ہوئی تھی کہ یکا یک فضا میں سازوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ کس قسم کے ساز تھے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال جس قسم کے بھی ہوں، تھے کچھ عجیب سے جن کو شاید نہ تو کسی نے دیکھا ہوگا اور نہ سنا ہوگا۔ کوئی بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا بچا یا جا رہا ہے لیکن جو کچھ بھی بجایا جا رہا تھا اس میں ایک قسم کی کشش

تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ روح کھینچتی چلی جا رہی ہے۔ ابھی یہ ساز بج رہے تھے کہ گنگا چمار کے گھر میں سے کورس کی دھن میں آواز آنا شروع ہوئی۔ اس میں عورتوں اور مردوں دونوں کی آوازیں شامل تھیں۔ مگر اس کورس میں کیا تھا؟ اس کے ناواقفان سمجھ میں آ رہے تھے اور نہ معنی و مطلب کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ شاید یہ بچی کی پیدائش کے بعد کی دعا ہے۔

رات کے تین بجے کورس ختم ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساز کی آوازیں بھی آنا بند ہو گئیں اور پھر گنگا چمار کے گھر سے اٹھتے ہوئے ہالے فضا میں بلند ہو گئے۔ چار بجے صبح دیوتا اور دیوی بھی اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے واپس ہو گئے لیکن اس وقت دونوں بہت زیادہ خوش نظر آ رہے تھے۔

دن نکلنے پر سب لوگ گنگا کے گھر پہنچے تاکہ معلوم ہو سکے کہ تمام رات کیا تماشا ہوا ہے۔ گنگا چمار کو دیکھا تو اس کی حالت بھی غیر تھی۔ بہت ہی گھبرایا اور پریشان تھا۔ لوگوں کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ بچی کی پیدائش کے وقت اس کی بیوی کے پاس صرف آسان سے اتری ہوئی عورتیں تھیں۔ ان کے ہاتھوں ہی بچی کی پیدائش ہوئی۔ پیدائش کے بعد بچی کو کسی خوشبودار پانی میں نہلایا گیا۔ آسان سے لائے ہوئے کپڑے پہنائے گئے۔ دیوتا اور دیوی نے اتر کر خوراک کی سرپرست کر دیا۔ فوجی اور مردوں نے مل کر گانا شروع کر دیا۔ فوجی اور دوسرے لوگوں نے لڑکی کو بچہ دے کئے۔

دیوتا نے کہا ”میں دیوتا برہسپت (Jupiter) اور میری بیوی دیوی جنو (Juno) جو کھنکھاتی رانی ہے آج بہت خوش ہیں کہ ہماری بیٹی یورانیا (Urania) جو عظیم ہیبت کی دیوی ہے پانچ ہزار سال بعد پھر دنیا میں واپس آئی۔ جس گھر میں یہ پیدا ہوئی ہے ہم اسے وہاں سولہ سال تک رہنے دیں گے۔ پھر اسے ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ آج میں اور میری بیوی بہت خوش ہیں۔“

اس واقعہ کے بعد گنگا چمار تو کیا بلکہ نوزائیدہ بچی راج دلا ری کی وجہ سے پورے گاؤں کی حالت بدل گئی۔ فصل اچھی ہونے لگی۔ لوگوں کے پاس روپے بچے کی بہتات ہوئی۔ جتنے بیمار تھے سب اچھے ہو گئے۔ ہر شخص ہلکی خوشی کھا رہا تھا لیکن خود بچی کی یہ حالت کسی کے ایک بار بھی اس نے ہاں کا دودھ نہیں پیا۔ ماں نے جب بھی دودھ پلانے کی کوشش کی تو کسی نامعلوم طاقت نے اس کو اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ بڑی ہونے پر اس نے بھی کوئی چیز نہیں کھائی جب بھی اسے کھانے کی خواہش ہوئی ٹیسی طاقتوں نے ہی اسے کھلایا پلایا۔ وہی اس کو نہلاتے کپڑے تبدیل کراتے پیدائش کے بعد سے ماں باپ یا کسی اور نے سوائے اس کے چہرے اور ہاتھ ہر دے کے جسم کا ایک بال بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے اختیار رات اور احکامات کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود بھی ایک عظیم طاقت کی مالک ہے۔ وہ جس وقت جو چاہتی وہی ہوتا۔ ویسے وہ کسی کو نقصان بھی پہنچاتی تھی۔ بڑی ہونے کے باوجود اسے بچوں سے بہت زیادہ دوستی تھی۔ وہ ان کے ساتھ کھلتی اور ان سے نامعلوم زبان میں باتیں کرتی۔

ایک روز صبح میں بیٹھی ہوئی ایک بچی کو کھلا رہی تھی کہ نامعلوم اس کے دل میں کیا آیا۔ اس نے کئی اجنبی زبان میں کسی کو کچھ حکم دیتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لکھ بھر کے اندر ہی دوسراپ آ موجود ہوئے۔ یہ ایسے نایاب سانپ تھے جو صرف بھوپال کے علاقہ میں ہی ہوتے ہیں اور وہ بھی بہت کمی کے ساتھ ان میں سے ایک گھوڑا چھاڑ اور دوسری چار انگلی کی تاگن تھی۔ یہ دونوں اس قدر خطرناک سانپ ہیں کہ ان کا کاٹ پانی بھی نہیں مانگتا۔

ان دونوں سانپوں کو دیکھ کر سب لوگ گھبرائے

یہی کہہ کر بھی نہ سکتے تھے۔ یہ سانپ پہلے تو تن کریدے کھڑے ہوئے پھر انہوں نے اپنے بچن اس طرح زمین پر رکھے جیسے وہ راج دلا ری کو بچہ کر رہے ہوں۔

لڑکی کے حکم پر دونوں سانپوں نے ناچنا شروع کر دیا۔ ان کے سامنے وہ اس طرح ناچ رہے تھے کہ جیسے اس کے اڑی غلام ہوں۔ ویسے ان کا ناچ تھا بھی بہت دلچسپ جسے وہ خود اور پاس میں بیٹھے ہوئے بچے رنجو دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔

ایک ہی واقعہ نہیں بلکہ ہر روز کوئی نہ کوئی ایسا نیا واقعہ پیش آتا جس کو گاؤں والے حیرت سے دیکھتے رہتے اور یہ سب ہی ایسے ہوتے جن کے وجود کو عقل تسلیم کرنے کے لئے کسی بھی تار نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف لوگ اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں دیوانے ہو رہے تھے۔ ان کا یہ حال تھا کہ وہ بڑھاپا ہوا جوان، ناممکن تھا کہ اسے دیکھے اور نظر جھکا لے۔ وہ تو ایک ایسا حسن تھا جس کا ثانی اس دنیا میں ممکن ہی نہیں۔ اس کا شاباب ایسا ناقابلِ تخیل قلعہ تھا جس پر دنیا کی بڑی سے بڑی فوج بھی قابض نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود لوگوں کے دلوں میں اس کو پھانسنے کا ایک جذبہ تھا، دولہا تھا۔ جوش تھا، آرزو تھی۔ دلوں میں جیسے ہوئے کانٹے کسی بل ان کو چھین لینے نہیں آ رہے تھے۔ اسی بے چینی کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس کے گھر پھیرے لگاتے مگر دور تک کسی طرح رسائی نہیں ہوتی۔ گاؤں تو پھر گاؤں تھا لیکن آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی حسن ملکوتی کی ایک جھلک کے لئے اس کے گھر کا پرکھا (طواف) کرتے۔ لیکن راج دلا ری بچی بہت ہی جلدی جو کسی میں دلچسپی لیتی یا توجہ سے نہ دیکھتا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی شخص کو بھی بات کرنے یا آنکھ لٹانے کی امت نہیں ہوتی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آس پاس کے مالدار لوگ راج دلا ری کی پوشیدہ طاقتوں سے واقف نہیں تھے یا اس کی طاقت کو اپنی طاقت کے آگے بچا دیتے تھے۔

شاید اسی لئے منڈوائی کے ٹیبل کے لڑکے رنجیت سنگھ نے اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش شروع کر دی۔ ویسے رنجیت سنگھ بذاتِ خود بہت حسین جوان تھا۔ لیکن تھا آوارہ۔۔۔ روپے پیسے کی نہیں تھی۔ جوانی کا نشہ چڑھا تو گاؤں میں ہاتھ پیر کا لٹنا شروع کر دیئے۔ پہلے تو اس نے بچ ذات کنیاؤں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا جب یہاں کچھ مہارت حاصل ہو گئی تو اونچی پروازیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ اپنے گاؤں کے علاوہ آس پاس کے بھی اس کی پہنچ سے باہر نہیں رہے۔

راج دلا ری کی پیدائش اور اس سے متعلق مافوق الفطرت حالات ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ دور دور تک ان کی شہرت پھیل چکی تھی۔ ان کی بناء پر سب ہی اسے دیوی مانتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جس سے یہ دیوی خوش ہو جائے وہ نہال ہو سکتا ہے لیکن جس سے یہ ناراض ہو جائے اس پر بڑی سے بڑی مصیبت آ سکتی ہے لیکن نوجوان طبقے کو اس پر یقین نہیں تھا اور نہ وہ راج دلا ری کی طاقت کو گردانتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ رنجیت سنگھ نے رام پور کی ہیرا پھیری شروع کر دی۔ انوپ سنگھ اپنے بیٹے کے کثرتِ خوب جانتا تھا۔ اس کے علم میں جب یہ بات آئی تو بیوی کو پابند کیا کہ وہ بیٹے کو سمجھائے۔ لیکن رنجیت سنگھ کو تو اپنی جوانی اور طاقت پر گھمنڈ تھا۔ ماں کی بات بانسنے کے بجائے اپنی جوانی کا زعم دکھانے لگا۔ وہ تو یہ سمجھے ہوئے تھا کہ کوئی بھی اس کے مقابلہ میں نہیں آ سکتا۔

انوپ سنگھ کو جب یہ معلوم ہوا کہ بیٹے نے ماں کی بات کی کوئی پروا نہیں کی تو اسے سخت افسوس ہوا۔ وہ پہلے ہی بیٹے کی پد کردار اور تکبر کی وجہ سے نالاں تھا مگر اسے یہ امید تھی کہ ممکن ہے کہ وہ راہِ راست پر آجائے اور باپ دادا کو رسوا کرنے کے بجائے ان کا نام روشن کرے لیکن یہ امید موبہم تھی بظاہر اس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ صاحبزادہ نے راج دلا ری کے چکر میں رام پور کے پھیرے لگانا شروع کر دیئے ہیں تو اسے

خفت لگ رہی تھی۔ پھر اس کے سبھانے پر بھی جب بیٹا نہیں مانا تو وہ سمجھ گیا کہ اب اس پر کوئی ختم مصیبت آنے والی ہے۔ یہ اس کا تجربہ تھا کہ کہیں کواگر سمجھایا جائے تو اکثر بات اس کی سمجھ میں آ جاتی ہے لیکن جب کوئی شریف زادہ بے لگام ہو جائے اور گری ہوئی حرکتیں کرنے لگے تو اس کی سمجھ میں پھر کوئی بات نہیں آتی ہے اور وہ سمجھانے والے کو بے وقوف اور کمزور سمجھتا ہے۔ پہلے تو رنجیت سنگھ کی دلوں تک رام پور کے پٹیل کے گھر جاتا رہا پھر اس نے لنگا چار کے گھر کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ لیکن ان چکروں سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ راج دلاری یا اس کے گھر والوں نے اس کے چکر لگانے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ آخر مجبور ہو کر ایک روز رنجیت سنگھ نے رام پور پہنچنے کے بعد لنگا چار کو پٹیل کی بیٹھک میں بلوایا۔

پٹیل اور اس کے لڑکوں کو رنجیت سنگھ کی یہ حرکت بہت بری معلوم ہوئی۔ اب تک صرف اس خیال سے کہ یہ بھی منڈوا کی کے پٹیل کا لڑکا ہے اور اس کے باپ کے ساتھ بھی گھریلو تعلقات ہیں یہ لوگ اس کی آؤ بھگت کرتے رہے۔ لیکن اس کے بار بار آنے اور پھر لنگا چار کے گھر کے پھیرے لگانے سے یہ ناراض تھے۔ دوسرے دیہاتوں میں بہن یا بیٹی کی عزت و آبرو کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے خواہ وہ کسی قوم اور گھرانے کی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رنجیت سنگھ کی آمد کو اچھا خیال نہیں کرتے تھے اور ان باتوں کی اطلاع وہ انوپ سنگھ کو دینے والے تھے لیکن ان کے اطلاع دینے سے پہلے ہی رنجیت سنگھ نے آدمی بھیج کر لنگا چار کو بلوایا۔ رام پور کے پٹیل نے جب لنگا کو بیٹھک میں آئے دیکھا تو انہیں بڑا تعجب ہوا اس لئے کہ لنگا ہونے کو اب بھی چار دیواری تھا لیکن راج دلاری کے جنم لینے کے بعد سے جو واقعات پیش آ رہے تھے ان کی بنا پر اس کو جو عزت و منزلت تھی اس کا لحاظ ہر چھوٹا بڑا کرتا تھا۔

”کہو لنگا کیسے آتا ہوا؟“ پٹیل نے پوچھا۔
”سرکار، ان منڈوا کی والے چھوٹے بیٹا

نے آدمی بھیج کر بلایا ہے۔“ لنگا نے رنجیت سنگھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
یہ بات سن کر رام پور کے پٹیل کو بڑا تعجب ہوا۔ لیکن لنگا آدمی گیا تھا اس لئے کچھ کہنا نہ سکتا تھا۔ لنگا کی بہتر بھانجہ کے خاٹھی کے ساتھ قماش دیکھیں لیکن وہاں میں ضرور ڈر رہے تھے کہ دیکھو اب کیا قماش ہوتا ہے۔
”کہو لنگا جی خیریت سے تو ہو؟“ رنجیت سنگھ نے بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ پوچھا۔
”بھگوان کی کرپا سے سب کچھ ٹھیک ہے۔“
”میں نے اس لئے تکلیف دی تھی کہ تم سے کچھ باتیں کرنی تھیں۔“
”کہو چھوٹے بیٹا؟“
”یہ تو تم جانتے ہی ہو لنگا جی کہ اپنے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔“

”ہاں جانتا ہوں بیٹا۔“
”میں جانتا ہوں کہ تم راج دلاری کو میرے ساتھ بھیج دو۔ اس کو کسی بات کی تکلیف نہیں۔“
ابھی رنجیت سنگھ اپنی بات پوری کرتے نہیں پایا تھا کہ کسی پوشیدہ طاقت نے اس کے منہ پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ اس کے تین چار دانت ٹوٹ کر باہر گر پڑے اور ابھی وہ سمجھنے نہیں پایا تھا کہ کسی نے اسے اٹھا کر بیٹھک سے باہر ہوا میں اچھال دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پچاس سالہ گز دور ایک گڑھے میں جا گرا۔
یہ پورا کھیل زیادہ سے زیادہ ایک دو منٹ میں ختم ہو گیا۔ بیٹھک میں موجود آدمیوں کی سمجھ میں اب تک کچھ نہیں آیا تھا۔ کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اور جب ان کی سمجھ میں آیا تو رنجیت دور گڑھے میں پڑا ہوا تھا۔
لنگا نے قماش دیکھ کر خاموشی سے اٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ راج دلاری کا غصہ کی وجہ سے منہ سرخ ہو رہا ہے۔ اور وہ پیش کے عالم میں آنگن میں ٹپل رہی ہے۔ لنگا رام خاموش کھڑا ہوا بیٹی کو دیکھتا رہا پھر اپنی کوششیں کر چلا گیا۔

شریف ماں باپ کی کمین اولاد کا یہی حشر ہے۔ پٹیل نے حسرت اور افسوس کے ساتھ دوسرے لوگوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال یہ ہوتا تھا تو ہو گیا۔ اب چل کر اسے اٹھا کر انوپ سنگھ کے پاس روانہ کر دو۔“
لوگ ہمت کر کے آگے بڑھے لیکن گڑھے کے پاس پہنچ کر سب کے منہ سے یکا یک چیخیں نکلیں اور وہ فوراً تیزی سے پلٹ کر دوڑتے ہوئے بیٹھک میں آ گئے۔ ڈر کی وجہ سے سب کے چہرے سفید ہو رہے تھے۔ ان لوگوں کی چیخیں سن کر گڑھ کے دو لوگ بھی وہاں پہنچ گئے لیکن کسی کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔ کچھ لوگوں نے ان سے پوچھنے کی کوشش بھی کی لیکن خوف کی وجہ سے ان کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

یہ ایک رنجیت سنگھ کے جسم میں حرکت شروع ہوئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تمام لوگ اس کے پلٹنے چلنے پر گڑھے کی جانب دیکھنے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ کوشش کر کے کھڑا ہو گیا۔ کھڑے ہوتے ہی اس کا پورا لباس بدن سے ڈھلک کر پڑے گر گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بدن سے کچھ اتار کر کسی نے نیچے ڈال دیے ہوں۔
کپڑوں کے نیچے چھپ کر رہے ہی سب دیکھنے والے چیخیں مارتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کچھ نوجوان لاشیاں اور ہلے لٹے ایک جگہ اکٹھا ہو کر مقابلہ کے لئے تیار کھڑے ہو گئے۔ لیکن یہ ناہنگانہ صرف رنجیت سنگھ کی وجہ سے تھا۔ اس لئے کہ جب اس کے جسم سے کپڑے پھسل کر نیچے گرے تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کا سر منہ، ہاتھ، پیٹھ غرض جس سے جسے میں بڑے بڑے پھوڑے ہیں اور ہر پھوڑے میں سے ایک ناگ اپنی گردن باہر نکالتا ہے۔ زبان کو ہوا میں لہرا رہا ہے۔ اس منظر کو دیکھنے کی تاب نہیں رہتی تھی اور وہ چیخیں مارتے ہوئے

50/-	خالد بن ولید
40/-	عمر بن عبدالعزیز
40/-	حجاج بن یوسف
40/-	محمد بن قاسم
40/-	طارق بن زیاد
40/-	ہارون الرشید
40/-	ہامون الرشید
40/-	رکن الدین بھرس
40/-	سلطان ملک شاہ سلجوقی
40/-	سلطان الپ ارسلان
40/-	سلطان محمد الدین زنگی
40/-	سلطان نور الدین زنگی
40/-	سلطان صلاح الدین ایوبی
40/-	سلطان محمود غزنوی
40/-	شہاب الدین غوری
40/-	قطب الدین ایبک
40/-	شمس الدین التمش
40/-	غیاث الدین بلبن
40/-	جلال الدین خلجی
40/-	علاء الدین خلجی
40/-	سلطان تغلق
40/-	فیروز شاہ تغلق
40/-	تیو رنگ
40/-	قبلائی خان
40/-	اسکندر لودھی

شیخ بک ایجنسی اردو بازار کراچی
فون: 32773302

رجحیت سنگھ کھڑے ہونے کے بعد چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کے منہ سے دل ہلا دینے والی بھیاں نکلیں۔ جیسے بلند ہوتا شروع ہوئیں۔ اور وہ پاگلوں کی طرح چچکا ہوا جنگل میں دوڑتا ہوا چلا گیا۔ دوسرے دن جب اس کی لاش جنگل میں ملی تو پوری کی پوری ایسی کالی تھی جیسے کسی نے کالک مل دی ہو۔

رام پور میں رجحیت سنگھ کی جو رگت بنی تھی اس کا چرچا گاؤں گاؤں ہو رہا تھا۔ اس واقعہ کے بعد ان اوپاس نوجوانوں نے جو راج دلاری کو رام کرنے کی فکر میں تھے اپنے ارادے بدل دیئے اور اب کوئی بھی رام پور کے راستے سے گزرنے کو تیار نہیں تھا۔

کچھ دن کے بعد رام کے ایک برہمن کی لڑکی کی شادی تھی۔ بارات مرہٹے گاؤں سے آئی تھی۔ ایک تو گاؤں کی لڑکی کی شادی اور وہ بھی برہمنوں کے یہاں اسی لئے گاؤں کے سب ہی لوگ ہنسی خوشی شریک ہوئے تھے۔ بارات کے آنے پر بڑی چہل چل پھل تھی۔ شہنائیاں بج رہی تھیں۔ مہمانوں کا سواگت کیا جا رہا تھا۔ ہنسر کسی نہ کسی کام میں لگے ہوئے تھے۔ بارانی کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد تفریح میں وقت گزارنے لگے۔ بڑے بوڑھے جگہ جگہ بیٹھے باتوں میں مصروف ہو گئے۔ نوجوان لڑکے گاؤں کی گلیوں میں گھومنے پھرنے لگے۔ ان ہی لڑکوں میں ایک لڑکا جگہ لیش نارائن بھی تھا۔ اس میں ویسے تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ عام لڑکوں کی طرح وہ بھی ایک لڑکا تھا۔ چھریہ بدن، ساٹھ لڑکے معمولی خدوخال مگر تھا بہت مہذب اور شرمیلہ عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی چندہ سولہ سال کا ہوگا مزاج اور طبیعت عام لڑکوں سے ہٹ کر تھی۔ نہ کبھی شرارت کرتا نہ کھیل کود میں شریک ہوتا۔ اسے تنہائی بہت زیادہ پسند تھی۔ گھر بھی یا تو سب سے الگ اپنی کھڑکی میں رہتا یا پھر جنگلوں اور کھیتوں کی جانب ٹپٹپٹ نکل جاتا۔ اس کی اس عادت کو گھر کے لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اکثر نوکٹے بھی رہتے لیکن ایسا معلوم ہوتا کہ جگہ لیش کواناں سے یا تو نفرت ہے یا پھر وہ ان سے خوف

کھاتا ہے۔ گھر میں بھی تنہا پڑا غلام میں یوں کہتا کرتا، جیسے کسی چیز کو تلاش کر رہا ہو۔ جب بھی اس سے اس بارے میں پوچھا گیا تو وہ ٹال گیا۔

یہی وجہ یہ کہ وہ بارات کے ساتھ رام پور آنے کے بعد کچھ دیر تک لڑکوں کے ساتھ گاؤں کی گلیوں میں پھرا پھرا کر رہا تھا۔ یہ لڑکے ہو کرندی کے کنارے ٹپٹپٹ چلا گیا۔ اس کی یہ پرانی عادت ہونے کی وجہ سے کسی نے اس کی جانب توجہ بھی نہیں کی۔

جب وہ اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا کافی دور نکل گیا تو یکایک اسے احساس ہوا کہ وہ بہت دور آگیا ہے۔ اس نے جائزہ لینے کے لئے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہ اس وقت ندی کے کنارے کھڑا ہوا تھا، ہر طرف کھیت تھیں لیکن فصل کٹ چکی تھی اس لئے دور دور تک کسی آدم کا وجود نہیں تھا۔ اس نے پلٹ کر رام پور کو دیکھا۔ گاؤں کافی فاصلہ پر نظر آیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ٹپٹپٹ ہوا کئی میل دور نکل آیا تھا۔ دھوپ کافی تیز تھی اس لئے سوچا کہ کسی سایہ دار درخت کے نیچے ٹھوڑی دیر آرام کے بعد گاؤں واپس چلے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی سایہ دار درخت قریب میں نہ تھا۔

یکایک اس کی نظر ایک جانب پڑی چند قدم کے فاصلہ پر ایک ٹھکے مندر تھا۔ اس کو بڑا تعجب ہوا کہ خیالوں میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے اس نے اس مندر کو ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔

یہ ایک چھوٹا سا مندر تھا جس کی عمارت پتھر کی بنی ہوئی تھی لیکن اب آدھے سے زیادہ منہدم ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ صدیوں سے یہاں کوئی آبادی نہیں۔ جگہ لیش نے سوچا کہ چلو اسے دیکھیں تو یہ کیا مندر ہے؟ یہیں ٹھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد گاؤں واپس چلے چلیں گے۔ یہ سوچ کر وہ مندر کی جانب بڑھا۔ لیکن مندر کی بناوٹ دیکھ کر بڑا تعجب ہو رہا تھا کہ یہ کس قسم کا مندر ہے۔ اس طرح کا مندر تو اس نے آج تک دیکھا ہی نہیں تھا۔

یکایک اس کے خیالات نے پلٹا لکھایا اور وہ

بے لگا۔ یہ غلط ہے کہ میں نے اس بناوٹ کا حیران چک نہیں دیکھا ہے میرا خیال ہے کہ میں ایسے مندروں کو جانتا ہوں۔ میں ان کو مدتوں سے دیکھتا آ رہا ہوں۔ اپنے جنم لینے سے بھی ہزاروں سال پہلے میں ان میں جاتا تھا۔ لیکن ایسے مندر کہاں دیکھے ہیں، کب سے جانتا ہوں؟ یہ بات اسے بالکل یاد نہیں آ رہی تھی مگر جب وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا اس کا دماغ الجھتا جاتا۔ مگر دماغی کشمکش میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ مندر کی جانب اس طرح بڑھ رہا تھا جیسے کوئی نامعلوم خانہ اسے کھینچ کر وہاں لے جا رہی ہو۔

”اوہو..... اب یاد آیا“ یکایک اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”اس قسم کے مندروں کی تصویریں اس نے اپنے باپ کی چنگ میں بنی ہوئی دیکھی ہیں۔ اور ان کے بارے میں بتا جی نے بتایا تھا کہ بیٹے یہ چنگ اپنے باپ دادا اور ان کے بھی باپ داداؤں سے ہمارے پاس چلی آ رہی ہے۔“ اس کو یاد آیا کہ یہ چنگ کاغذ کے بجائے کسی جانور کی کھال پر لکھی ہوئی تھی۔

وہ بھی سوچتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ جس طرح کی تصویریں اس نے پتا کی چنگ میں بنی ہوئی دیکھی تھیں۔ یہ مندر بھی بالکل اسی طرح کا تھا۔ مندر کے بارے میں وہ آجائے پر جو حیرانگی اور ایک نامعلوم سا خوف اس کے دل میں تھا اس کے بجائے اب ایک قسم کی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ اپنے جانے پہچانے مندر میں ہی جا رہا ہے۔ جگہ لیش جس وقت سیزر حیاں چڑھ کر اپنے بچپانے کا ایک تیز جھونکا اندر سے آیا اور پھر ایسا محسوس ہوا کہ فضا میں ایک عجیب قسم کی خوشبو چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ خوشبو کی خوشبو ہے۔

ایسی خوشبو اس نے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ کتنی دلچسپ یہ خوشبو تھی۔ جھنپ جھنپ، مست کرنے والی خوشبو۔ ایسی خوشبو جس کے سونگھنے سے آنکھیں بھول

ہو کر بند ہونے لگیں اور پھر آدی سو جائے۔ اور واقعی وہ سونے لگا تھا۔ اس کو اتنا احساس تو ضرور تھا کہ خوشبو کے اثر سے اس کی آنکھیں بند ہو رہی ہیں اور اب وہ دالان میں گھسے بے ٹیک لگا کر سو رہا ہے۔

مگر یہ اس کی بھول تھی۔ بظاہر وہ سو رہا تھا لیکن اس کے دل و دماغ برابر کام کر رہے تھے اور پھر چند لمحوں کے بعد اس کے کانوں میں سازوں کی عجیب قسم کی دھن سنائی دینے لگیں۔ ان دھنوں کو وہ کبھی نہیں سنا تھا لیکن ان دھنوں پر اس کو اپنی روح کھینچتی اور بیدار ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

ابھی خوشبو اور سازوں کے بارے میں وہ کچھ سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ یکایک اسے پورے مندر میں نورانی روشنی پھیلنے لگی ہوئی معلوم ہوئی جس میں تیزی کے علاوہ ایک قسم کی خشکی اور لطافت بھی تھی۔ دودھیائی ہونے کے باوجود ہر چیز بالکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس نورانی روشنی میں شکستہ مندر اور دیوار پر بنی ہوئی کسی دیوتا کے شبیہ کو اپنی طرح دیکھ رہا تھا۔ مگر پلک جھپکتے ہی جب اس نے دوبارہ دیکھا تو منظر ہی دوسرا تھا۔

اب وہاں شکستہ مندر کے بجائے ایک بہت بڑے مندر کی عمارت تھی۔ سامنے کی دیوار ہٹ چکی تھی اور چند ترک مندر ہی مندر دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ مندر کے ساتھ ساتھ کسی دیوتا کے رستے کی جگہ بھی ہے۔ لوگ اس میں بڑی آزادی کے ساتھ چل پھر رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ یہ لوگ بڑے اچھے قسم کی رستی ساڑھیاں باندھے ہوئے تھے لیکن عورتوں اور مردوں کے باندھنے کا انداز جدا جدا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ آج یہاں یا تو کوئی تہوار ہو یا کسی بات کی خوشی ہے۔ سب ہی خوش خوش نظر آ رہے تھے۔ اور ہر ایک کے ہاتھ میں پھولوں کی ڈالیاں تھیں۔

جگہ لیش ابھی یہ سب کچھ دیکھ ہی رہا تھا کہ یکایک اس کی نظر اپنے جسم پر پڑی۔ حیرت کی وجہ سے

معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے آگے بڑھنے کے لئے اس کے قدموں میں جان ہی نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے محض میں راج دلاری کھڑی ہوئی تھی۔ وہی صورت، وہی قدم، وہی رنگ روپ تھا جس کو ابھی مندر میں دیکھ کر آیا تھا۔ راج دلاری کے ہاتھ میں بھی وہی پھولوں کی ڈالیاں تھیں جو اس کے ہاتھ میں تھیں "یورائیا" کیا ایک اس کے منہ سے نکلا۔

"کوس" اس کو جواب سنائی دیا۔ "آؤ تم اپنی یورائیا سے دور کیوں کھڑے ہو؟"

اور پھر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے مقناطیسی طاقت جگدیش کو کھینچ رہی ہے۔ وہ تیز قدم اٹھاتے ہوئے راج دلاری کے پاس پہنچا اور پھر دونوں بے اختیار ہو کر ایک دوسرے سے ایسے لپٹ گئے جیسے ہزاروں برس کے پھڑے ہوئے مل رہے ہوں۔ یہ بات غلط بھی نہیں تھی۔ کیا یک محبت کے سیلاب میں بہتے ہوئے اور جذبات سے مغلوب ہو کر راج دلاری نے جگدیش کو بیا کر لیا..... لیکن یہی پیار جگدیش کے لئے پیام اجل تھا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی اور چند لمحوں کے بعد ہی وہ مردہ حالت میں اس کے ہاتھوں میں جھول رہا تھا۔

راج دلاری نے جگدیش کو مردہ حالت میں دیکھ کر ایک زوردار چیخ ماری اس چیخ کو سن کر عورتیں اور مرد لنگ چمار کے گھر کی جانب دوڑے۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہر شخص دور کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا کہ جگدیش مردہ حالت میں راج دلاری کے ہاتھوں میں جھول رہا ہے۔ لڑکی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور وہ جگدیش کی لاش کو سینے سے لگائے ہوئے بڑبڑا رہی ہے "اوہ کوس یہ میں نے جذبات کی رو میں بہہ کر کیا کیا مجھے تمہیں بیا نہیں کرنا چاہئے تم تو فانی تھے اسی وجہ سے میں نے دیوتا باکس کے دربار میں بھی بیا نہیں کیا تھا۔ مگر محبت کے جوش میں مجھ سے کیسی بھول ہوئی۔ اب پھر مجھے تمہارا ہزاروں سال انتظار کرنا ہوگا۔ میرے کوس تم عظیم طاقت سے کہنا کہ تمہاری یورائیا تمہارا

انتظار کر رہی ہے۔ اس لئے وہ تم کو جلد ہی بھیج دیں گی۔ اپنی بات پوری کرنے کے بعد اس نے جگدیش کی لاش کو نیچے رکھا۔ جبکہ کراخری بار بار کہتا رہا میں تمہارے ہوئے پھول سینے پر رکھ کر کھڑے ہو گا۔ بغور دیکھ کر ایک زوردار چیخ ماری اور روتی ہوئی اپنی کھڑی میں چلی گئی۔

جگدیش کے ماں باپ اور عزیز واقارب کی حالت غیر تھی۔ گاؤں کا ہر فرد افسردہ اور پریشان تھا۔ راج دلاری کے کھڑی میں چلے جانے کے بعد لوگ جگدیش کی لاش اٹھا کر لے گئے اور پھر اس کے کرایا کرم میں آس پاس کے تمام گاؤں کے لوگ شریک ہوئے۔ سب ہی طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے لیکن کسی کو بھی اصلیت کا پتہ نہیں تھا۔

اس واقعہ کے بعد لوگوں نے بہت کم راج دلاری کو دیکھا۔ ماں باپ اس کی صورت کو ترس گئے۔ ہفتوں وہ کھڑی سے باہر نہیں آتی۔ اور اگر آتی بھی تو کچھ دیر کے لئے اور پھر واپس کھڑی میں چلی جاتی۔

غرض اسی طرح سولہ برس پورے ہونے کو آئے۔ کہ چاند کی چوہ تاریخ کی رات میں یکا یک آسمان سے پھر ہالے اترنا شروع ہوئے۔ ان ہالوں سے نورانی مخلوق کی آمد شروع ہوئی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی ان لوگوں کی وضع ایلیوں جیسی تھی۔ ان کے ساتھ فوجی سوار دستے بھی تھے۔ یہ سب کے سب لنگ چمار کے گھر میں اترے۔ ان لوگوں نے پہلے تو راج دلاری کو جگہ کیا دوبارہ کھڑے ہونے کے بعد ایک آدی فرمان لئے ہوئے آگے بڑھا اور پھر دوڑا تو ہونے کے بعد اس نے یہ فرمان راج دلاری کو پڑھ کر سنایا۔ اس عرصہ میں راج دلاری حادثہ کے ساتھ کھڑی کھڑی رہی۔ فرمان ختم ہونے کے بعد وہ سب گروں جھکائے خاموشی کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ شاید وہ جواب کے منتظر تھے۔

راج دلاری خاموش کھڑی ہوئی کسی بات پر غور کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل

میں کوئی ایسی الجھن ہے جس کی بنا پر کوئی فیصلہ نہ کر پا رہی تھی۔ آخر کچھ دیر بعد اس نے غرا کر سب کو دیکھا۔ چند قدم آگے بڑھی وہ پیاسہ کے سامنے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر رون مگر۔ اس کے گروں ختم ہوتے ہی سب لوگوں نے ایک نعرہ بلند کیا۔ لیکن یہ نعرہ کیا تھا کوئی بھی سمجھ نہ سکا۔ جب یہ لوگ نعرہ لگا کر خاموش ہوئے تو راج دلاری نے اپنی گروں سیدھی کر کے ایک ہاتھ پر لاش اور ساتھ ہی نامعلوم زبان میں کچھ الفاظ کہے جن کو سن کر نورانی مخلوق نے پھر نعرہ بلند کیا اور راج دلاری کے سامنے سجدے میں جھک گئے۔ اور پھر سجدے سے اٹھنے کے بعد جس طرح آئے تھے اسی طرح واپس ہو گئے۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد راج دلاری نے کچھ دیر کے لئے تمام رات بلیٹی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خاص بات اسے پریشان کئے ہوئے تھے۔ آخر وہ نکلنے پر اس نے ماں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ماں"

"میری بیٹی۔ میری لاڈلہ ماں نے بے قرار ہوتے ہوئے کہا "ماں" راج دلاری بے چین ہوتے ہوئے بولی اور پھر دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی۔

جب سے راج دلاری پیدا ہوئی تھی یہ پہلا اتفاق تھا کہ وہ اس طرح ماں سے لپٹی تھی۔ دونوں ماں بیٹی بڑی دیر تک ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی روتی رہیں۔ آخر جب کچھ آنسو تھکے تو ماں سے علیحدہ ہونے کے بعد راج دلاری نے باپ کے پیچھے پڑتے ہوئے کہا۔

"پتا جی"

"بیٹی" لنگ چمار نے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت خواس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

"پتا جی..... میرے جانے کا وقت آ گیا ہے"

"کیا وقت بیٹی؟" ماں باپ نے یک زبان

ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ماں" تمہیں معلوم ہے کہ میں دیوتا رہست کی بیٹی ہوں۔ البتہ دنیا میں دوبارہ آنے کے لئے میں تمہارے پیٹ میں رہی اور شہارے یہاں پیدا ہوئی اس لئے تم بھی میرے ماں باپ ہو سکتی ہو۔ اب تمہیں چھوڑتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے۔

رات کو دیوتا پتا اور دیوی ماتا کے پاس سے بلاوے کا سندیر آیا تھا۔ میں اگلے مہینے آج کی رات چلی جاؤں گی۔ لیکن وعدہ کرتی ہوں کہ ہر سال پورناشی کی رات تمہارے پاس آیا کروں گی۔ اس کے علاوہ جب بھی تم بلاؤ گی میں ہر حالت میں تمہارے پاس آؤں گی لیکن خواب میں۔ اور جب تم اس دنیا میں نہیں رہو گے تو بھی میں تمہاری سادھی پر آؤں گی۔

میرے جانے کے بعد بھی تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تمہاری حفاظت کے لئے میں ایک ایسی طاقت چھوڑ جاؤں گی جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی دوسری طاقت نہیں کر سکے گی۔

لیکن اس ایک مہینے میں راج دلاری کی عجیب حالت تھی۔ کبھی وہ خوش ہوتی اور کبھی روتی۔ ماں باپ کے ساتھ بھی وہ بہت زیادہ کھل مل گئی تھی۔ اب وہ اکثر ماں کے سینے پر سر رکھ کر سو جاتی۔

گھر کا کام بھی وہ بڑی محنت کے ساتھ کرنے لگی تھی۔ پورے مہینے اس نے کام میں ماں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ کھانا پکانی، برتن صاف کرنی، جھاڑو دیتی ماں کے کپڑے دھوتی۔ جس طرح اور گھر گرہست لڑکیاں گھروں میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی اور کام کاج کرتیں لیکن رونا اور ہنسا اب بھی اس کا بندھن نہیں ہوا تھا۔

آخر کار وہ رات آئی گئی جس کی آمد سے راج دلاری کے ماں باپ خوف زدہ اور پریشان تھے۔ کوئی دن پہلے سے ماں باپ نے کھانا پیتا چھوڑ دیا تھا۔ راج دلاری بڑی محنت سے کھانا تیار کرتی اور پھر بڑی چاہت کے ساتھ ماں کے منہ میں نوالہ ڈالتی۔



ناگ منی

سیماء امیر - امانگرہ

بین کسی آواز سنتے ہی نوجوان پر گھبراہٹ طاری ہوگئی، چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے اور پھر وہ زمین پر لیٹتے ہی ایک خوفناک ناگ میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن پھر ایک اور ناقابل یقین منظر رونما ہوا۔

خوف کے لبادے میں لپٹی خونی وادی کی طرف جو پرداز ہن پر سکتہ طاری کرتی انوکھی کہانی

لیکن میں رشی بننا چاہتا ہوں، میں نے تین سال دیران غاروں مندروں اور ناگ دیوتا کی تپا کی ہے تب یہ تعویذ حاصل کیا ہے۔" اس نے اپنے گلے میں بندھے ایک ترشول نما تعویذ کی طرف اشارہ کیا۔ "منی تو میں نے تجھ سے حاصل کر لی لیکن اس کو سیت کرنے کا منتر صرف تو جانتا ہے کیونکہ ناگیشور نے وہ منتر صرف تجھے بتایا تھا۔ اس ناگ منی کو حاصل کرنے کے لئے کتنے سادھو کتنے مہا پرش "ادے اب تو ناگ منی کو سیت کرنے کا منتر بتا ہے۔" پر تپا نہیں یہاں اس کھنڈرات میں قید کئے ہوئے چند سال ہو چکے ہیں۔ کیوں اپنے آخری عمر میں سیت آپ کو اور اپنی جتنی کوازیت دے رہے ہو۔" "نہیں تری کال! کسی نہیں، میں مر جاؤں گا لیکن منی کو سیت کرنے کا منتر تجھے بھی نہیں بتاؤں گا۔" "دیکھو پر تپا تمہیں اس منی سے کوئی فائدہ نہیں،

مگر گنگا چمار اور اس کی بیوی کو کسی حالت قرار نہیں تھا۔ پریشانی کی وجہ سے ان کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ جب دونوں یہ سوچتے کہ ان کی جوان بیٹی ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہونے والی ہے تو ان کے کلیجے پھٹنے لگتے۔ وہ انتہائی بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں تھے لیکن کچھ بھی نہیں کتے تھے۔

پورنماشی کی رات میں ایک بار پھر آسمان سے ہالے اترنا شروع ہوئے وہی سازوں کی آوازیں تھیں اور پہلے کی طرح آج بھی فضا معطر تھی۔

تخت اترنے کے بعد راج دلاری اپنی کوٹھری میں سے نکل اس وقت وہ نور میں نہائی ہوئی حریری لباس میں مایوس افسردہ لکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ نورانی لڑکیاں تھیں جو اس کے لباس کو تھامے ہوئے چل رہی تھیں۔

تخت کے قریب پہنچ کر وہ خاموشی سے نظر جھکائے ادب کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ دیوتا اور دیوی اپنے تخت سے اترے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بہت ہی خوبصورت تاج تھا جس کو انہوں نے راج دلاری کے سر پر رکھ دیا۔

تاج سر پر رکھتے ہی عورتوں مردوں کو ملا جلا کر کورس شروع ہوا۔ کورس کے خاتمہ پر راج دلاری دیوتا اور دیوی کے درمیان جا کھڑی ہوئی۔ چند منٹ خاموش کھڑے رہنے کے بعد تینوں آگے بڑھتے ہوئے اس جگہ پر پہنچے جہاں گنگا چمار اور اس کی بیوی بت بنے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ یہ لوگ پہلے تو ان کے پاس خاموش کھڑے رہے۔ اس کے بعد دیوتا اور دیوی نے اپنے اپنے سیدھے ہاتھ بٹھیرا کر ان سے کچھ کہنا شروع کیا۔ پھر بات ختم کرنے کے بعد گردنیں جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

ایک ایک راج دلاری آگے بڑھی اور پھر زمین دوز ہوتے ہوئے اس نے ماں کے پیڑ پکڑ لئے۔ ماں نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور پھر دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

ایک ایک راج دلاری آگے بڑھی اور پھر زمین دوز ہوتے ہوئے اس نے ماں کے پیڑ پکڑ لئے۔ ماں نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور پھر دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

پھوٹ کر رونے لگیں۔



اور کتنے اچھا داری سانپ آئے لیکن وہ مٹی نہیں لے جا سکے کیونکہ جہاں یہ مٹی قید ہے اس کے آس پاس کی جگہ کو میں نے اپنے منتروں سے کنڈل میں کر دیا ہے اس لئے جو بھی اس مٹی کے قریب جائے گا وہ جل کر جسم ہو جائے گا میں تجھے تیرہ دن اور دیتا ہوں سوچ لے، آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد ناگ پنجویں ہے، اس ناگ پنجویں کے دن ہی تجھے وہ ناگ مٹی سیت کرنی ہے۔“

چند گزھ میں ناگ دیوتا کا ایک بہت قدیم اور پرانا مندر ہے یہ تو ابھی تک کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ مندر کب بنا اور کس نے تعمیر کیا؟ اپنے وقت میں یہ مندر بہت خوبصورت رہا ہوگا لیکن اب تو اس مندر کے صرف کھنڈرات ہی باقی ہیں، اور مندر کے اندرونی ہال میں ایک بہت بڑے ناگ کا مجسمہ بنا ہوا ہے جو آج بھی اپنی اصل حالت میں ہے، ایسا لگتا ہے کہ گزرے ہوئے سے نے اس پر کوئی اثر نہیں چھوڑا، ہر ناگ پنجویں کو اس مندر میں ہزاروں سانپ پوجا کرتے آتے ہیں اس اچھا داری سانپ کی تپسیا سے ناگ دیوتا خوش ہو جائے وہ اسے مٹی دان کر دیتا ہے۔

ایسے ہی خوش نصیبوں میں ایک اچھا داری ناگ ناگیشور تھا جس کی سو سال کی تپسیا سے ناگ دیوتا اتنا خوش ہوا کہ اسے ناگ مٹی دان کر دی۔

☆.....☆.....☆

ایک دن ٹھاکر پر تاب سنگھ اس کی پتی رملہ دیوی اور سات سال کا بیٹا شام چندر گڑھ میں اپنے ایک عزیز کو ملنے جا رہے تھے کہ اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی جب وہ گھر سے چلے گئے تو گھر سے بادل چھائے ہوئے تھے لیکن انہوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی بارش کے ساتھ تیز ہوا بھی چلنا شروع ہو گئی تو ٹھاکر پر تاب کو گاڑی چلانا دشوار ہو گیا۔ موسم کے پھرے ہوئے تیزور کچھ کر ٹھاکر پر تاب نے اپنی پتی سے کہا۔ ”رملہ ایسا لگتا ہے کہ اس طوفانی بارش میں گاڑی آگے نہیں جاسکے گی۔ سامنے کسی عمارت کے آگے نظر آ رہے ہیں، وہاں کچھ دیر انتظار کر لیتے ہیں، جیسے ہی بارش میں کمی آئے گی تو ہم

آگے سفر کر لیں گے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ رملہ دیوی بولی۔

گاڑی مندر کے سامنے ایک جھنگ سے رکی۔ وہی ناگ دیوتا کا مندر تھا۔ جس میں سانپ پوجا کرتے آتے ہیں۔ وہ لوگ مندر کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے کہ بھائی صاحب کی آواز پر ٹھاکر پر تاب چونک کر پلٹ ایک آدی جس نے جھکدار لباس پہنا تھا۔ لباس ایسا ہی جیسے سانپ کی پچھلی ہو، اس کے سر پر ایک بڑا سا سہرا تاج چمک رہا تھا جو سانپ کی شکل کا تھا۔

”آپ کون ہیں؟“ ٹھاکر پر تاب نے گھرانے ہوئے کہا۔

”گھبراہٹ نہیں، بھائی صاحب!“ اس آدی نے کہا۔ ”میں ایک اچھا داری ناگ ہوں، میری سو سال کی تپسیا سے خوش ہو کر ناگ دیوتا نے مجھے یہ ناگ مٹی دان کر دی ہے،“ اس نے ٹھاکر پر تاب کو اپنی مٹی میں موجود مٹی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ جیسے ہی اس نے مٹی کو سامنے کیا اس مٹی سے اتنی تیز روشنی پھوٹ رہی تھی کہ ان کی آنکھیں چندھیا گئیں تو بے ساختہ ٹھاکر اور رملہ دیوی نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

”آپ میری بات سمجھیں؟“ اس آدی کی آواز میں اچھا تھی۔ ”آپ اس ناگ مٹی کو اپنے پاس رکھ لیں کیونکہ میرے پیچھے ایک پیر اتری کال لگا ہوا ہے وہ مجھ سے یہ ناگ مٹی لینا چاہتا ہے تاکہ وہ تری کال رکھی بن جائے اور اگر ایسا ہوا تو یہ انسانیت کے لئے ایک بڑا کشت ہوگا۔“

اس آدی نے جو دراصل ناگیشور تھا، وہ مٹی ٹھاکر پر تاب کے ہاتھوں میں تھما دی۔

ٹھاکر پر تاب جو ابھی تک سکتے کی ہی حالت میں تھے یک دم ہوش میں آ گئے۔

”بھائی صاحب یہ ناگ مٹی میری آپ کے پاس اس مٹی کو اکھنڈ مرتاحہ کے چرنوں میں رکھ دیتا۔“ ناگیشور نے کہا۔

اچانک ہی تین کی آواز سنائی دی۔ ”اچھا اب میں چلا ہوں تری کال یہاں پہنچنے والا ہے۔“

ایک دم سے ٹھاکر پر تاب نے کہا۔ ”اس مٹی کو سیت کرنے کا منتر کیا ہے؟“

ناگیشور نے جلدی سے ٹھاکر کو مٹی سیت کرنے کا منتر بتایا۔ ”یہ منتر پڑھ کر مٹی پر چھو کر مارو گے تو یہ سیت ہو جائے گی۔“ یہ کہتے ہوئے ناگیشور اچانک ایک سہرے سانپ میں تبدیل ہو کر ریٹکتا ہوا اچھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

تین کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی اور پھر تری کال تین سمیت مندر میں داخل ہوا، وہ ایک خوفناک شکل کا ناترک تھا۔ ایک ترشول سے مشابہہ تصویر تھا، جو اس نے کالی زوری میں پرو کر اپنے گلے میں ڈالا ہوا تھا۔ اس کے جیسے ہی نظر ٹھاکر پر تاب اور ان کی پتی رملہ پر پڑی تو اس نے تین، بھانا بند کر دی۔ ”اچھا تو تیرے پاس ہے وہ مٹی، وہ مٹی میرے حوالے کر دو۔“ تری کال نے ٹھاکر پر تاب سے کہا۔

”نہیں میں ایسا نہیں کروں گا یہ میرے پاس ناگیشور کی امانت ہے وہ پندرہ سال بعد مجھ سے واپس لینے آئے گا۔“

”ہا..... ہا..... ہا“ تری کال نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”ارے تو پندرہ سال کی بات کرتا ہے، میں اسے پندرہ منٹ بھی زندہ نہیں رہنے دوں گا میں اسے مار دوں گا میں پھر بھی ناگ مٹی تیرے حوالے نہیں کروں گا تو تم تنگ نہیں شیطان ہے۔“ ٹھاکر پر تاب نے کہا۔

”اچھا نہیں دے گا بھولو جنگلی۔“ اس نے ساتھ لے لے اپنے دو چیلوں سے کہا۔ ”اس کے ہاتھ سے ناگ مٹی نہیں کر ہمارے حوالے کر دو۔“ چشمہ زون میں وہ ٹھاکر پر تاب پر پل پڑی۔

نے جنگلی کے ہاتھ پر زور سے دانتوں سے کاٹا۔

”ارے کتے کے پلے۔“ جنگلی نے غصے میں آ کر شام کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا اور گھبرا کر ایک دیوار پر دے مارا شام کا سراسی زور سے دیوار سے ٹکرایا کہ اس کے سر سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

جنگلی اور بھولو نے مٹی تری کال کے حوالے کر دی تری کال مٹی کو پا کر خوشی سے ناچنے لگا ناچتے ناچتے اچانک اس کو ایک خیال آیا، اس نے ٹھاکر پر تاب سے کہا۔

”ناگ مٹی تو تم سے لے لی اب اس کو سیت کرنے کا منتر بھی بتا دو۔“

”نہیں تری کال نہیں!“ مٹی تو تم نے حاصل کر لی لیکن جب تک اس کو سیت کرنے کا منتر نہیں نہیں آتا یہ مٹی ایک پتھر کے موتی کے سوا کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور وہ منتر صرف میں جانتا ہوں، تم مجھ سے وہ منتر بھی نہیں اٹھوا سکتے، میں سر جاؤں گا لیکن منتر نہیں بتاؤں گا۔“ ٹھاکر پر تاب کا ٹھاکر کر دیا والا خون جاگ اٹھا۔

”اچھا یہ بات ہے، بھولو اور جنگلی اسے لے جاؤ ان دونوں کو کھنڈرات کی کال کوٹھری میں بند کر دو جب تک یہ منتر نہیں بتا دیتا یہ میری قید میں رہیں گے۔“

پہلے انہوں نے ناگ دیوتا کے مجسمے کو دودھ سے نہلایا پھر چھوٹی چھوٹی کنوئریوں میں دودھ بھر کر مندر کے ہر کونے کھوروں میں رکھ دیا جیسے ہی وہ مندر کی چھیل دیوار کی طرف آئے انہیں زمین پر ایک بچہ بے ہوش پڑا ملا جس کے سر سے خون بہت تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے بھگتوں کی مدد سے اسے جلدی سے اٹھایا اور وید کے پاس لے گئے اس کا علاج کرایا۔

ہوش میں آنے کے بعد شری رام نے اس بچے سے بہت پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ کون ہے اور اس ناگ دیوتا کے مندر میں کیسے پہنچا؟ مگر وہ بچہ صرف اتنا ہی بتایا کہ ”وہ مین والا میرے ماما پتا کو لے گئے ہیں۔“

شری رام نے اسے طور پر معلوم کر کے کوشش کی تو اس بچے کے باری میں کچھ معلوم نہ ہو سکا پھر انہوں نے یہ سوچ کر کہ ”شاید بھگوان اب ہمیں مزید بے اولاد نہیں رکھنا چاہتا۔“ انہوں نے اور ان کی جتنی راہنئی نے اس بچے کو اپنا بیٹا بنا لیا، یوں شام کی پردہیں سا دھو شری رام کے گھر میں ہوئے۔

ایک دن کالی ماما کے مندر میں پوجا ہو رہی تھی مندر کے بڑے ہال کے اندر سارے گاؤں کے لوگ جمع تھے۔ سا دھو شری رام آکھیں بند کر کے بھجن گارہے تھے کہ اتنے میں ایک سنبہرے رنگ کا سانپ مندر کے بیرونی دروازے سے اندر آیا اور آخر شری رام کے قدموں میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا جیسے وہ سا دھو شری رام سے آخر واد لیتا چاہتا ہو، جیسے ہی لوگوں کی نظر اس سانپ پر پڑی لوگ سانپ سانپ کہہ کر ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے مندر سے باہر جانے لگے شور شرابے کی آواز سن کر شری رام نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اپنے قدموں کے ساتھ اتنے بڑے سانپ کو دیکھ کر گھبرا گئے، اور قریب ہی پڑا ہینٹل کا لوٹا اٹھا کر سانپ پر دے مارا لوٹا جیسے ہی سانپ پر پڑا تو انسانی چیخیں گونجنے لگیں سا دھو کی نظر ایک دم زمین پر پڑے سانپ پر پڑی تو ان کے ہاتھ پکپکانے لگے کیونکہ جس سانپ کو انہوں نے لوٹا مارا تھا۔ اب وہاں ایک آدمی جس نے جھک کر لباس پہنا تھا اور جس کے سر پر سانپ کی

شکل کا شہزادی تاج تھا وہ دراصل ناگیشور تھا۔ ناگیشور نے اگلی ہوئی سانسوں کے درمیان شری رام کو مخاطب کر کے کہا۔

”میں ایک اچھا وادری ناگ ہوں، میں نے اپنی ناگ مٹی کسی کو امانت کے طور پر دی تھی اس سے وہ مٹی تری کال نے جھین لی ہے، مجھ میں اتنی شکلیاں نہیں تھا کہ میں تری کال کا سامنا کر سکتا اس لیے میں نے خود کو زمین کے پاتال میں چھپا لیا تھا۔ آج میں پہلی دفعہ 15 سال بعد دھرتی پر آیا تاکہ آپ سے آخر واد لے کر وہ ناگ مٹی حاصل کر لو، مگر آپ نے میری ہتھیا کر ڈالی۔“

سا دھو شری رام یہ سن کر ناگیشور کے پاؤں پر گر گئے۔ ”مجھے سمجھا کر دیں، مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی، میں آپ کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا، مجھے شک ہو رہا ہے، مجھ سے کیا پاپ ہو گیا، مجھے شکا کر دیں۔“ شری رام ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”آپ کے شکا مانگنے سے میری جان واپس نہیں آ سکتی۔ آپ کو ایک ہی صورت میں ناگ ہتھیا سے کٹی مل سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اب آپ میرے شرے کو اپنے پاس سنبھال کر رکھیں اور وہ ناگ مٹی لا کر میرے شرے کے اوپر رکھ دیں گے تو مجھے جیون دان مل سکتا ہے۔“ ناگیشور نے کہا۔

”مجھے آپ کی ہر بات منظور ہے۔“ شری رام نے کہا۔ مسلسل تین مہینے ہو گئے کہ سا دھو شری رام مختلف گاؤں بستیوں میں جا کر تیری کال کا پتہ معلوم کرتے رہے مگر ناکام واپس آ جاتے اب تو وہ بھی اپویں ہو چکے تھے، کہ ایک دن شری رام ایک پیروں کی بستی میں گئے وہاں جا کر انہوں نے ایک بوڑھے پیرے سے تری کال کا پتہ پوچھا۔ اس نے کہا۔ جنوب کی سیدھ میں پڑاؤں کے اوپر تری کال کی بستی ہے۔ ابھی سے چلتا شروع کر گئے تو شام سے پہلے وہاں پہنچ جاؤ گے۔“

تری کال اپنے بھگت جتنی کے ساتھ بیٹھا تھا کہ دور سے ایک سا دھو آتے ہوئے نظر آئے جب شری رام قریب پہنچے تو انہوں نے تری کال کے حلیے سے پہچان لیا

”یہ تری کال ہے۔ شری رام نے تری کال سے کہا۔“ وہ جتنی مجھے دے دو میں اس سے ایک شب کام لیتا ہاں۔“

ناگ مٹی کا نام بھی کوئی اپنی زبان پر لاتا ہے تو میں اس کی زبان کاٹ ڈالتا ہوں۔“ تری کال نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”جتنی اس کو مار ڈال۔“

شری رام یہ دیکھ کر وہاں سے بھاگے کوار ہاتھ میں لئے ہوئے جنگلی، ان کے پیچھے لپکا شری رام کھنٹی جاڑیوں میں لپکے بھاگ رہے تھے کہ ایک دم سے ان کا تیرا ایک جھاڑی میں ایک گیا اور وہ دھڑام سے زمین بوس ہو گئے، جیسے ہی جنگلی قریب پہنچا شری رام نے ایک دم کہا۔

”اے بھولے ہاتھ میری رکھشا کریں۔“ آسان میں ایک جنگلی جنگلی نے جیسے ہی جنگلی کی طرف دیکھا اسے دیکھائی دینا بند ہو گیا اور وہاں سے بھاگ نکلے گھر پہنچے تو ان کا برا حال تھا۔

شام نے جب اپنے پتا کی یہ حالت دیکھی تو اس نے کہا۔

”آج سے میرا آپ کو یہ وجہ ہے کہ وہ ناگ مٹی میں تلاش کروں گا۔“

”نہیں پتہ میرا جیون تو ڈھلتی دھوپ ہے اور تو چڑھتا سورج شری رام تے کہا۔“ ایسے سورج کا کیا فائدہ جو آکاش پر چمک نہ سکے میں وہ مٹی ضرور حاصل کروں گا بس آپ صرف اتنا بتا دیں کہ یہ تری کال رہتا کہاں ہے؟“

شام تری کال کے گاؤں کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہ بھی گاؤں سے تھوڑی دور تھا کہ راستے سے ہٹ کر جھاڑیوں میں زور کی نسونی چیخ سنائی دی۔ وہ آواز اس کے دائیں طرف سے آ رہی تھی وہ تیز قدم اٹھاتا کھنٹی جھاڑیوں کی طرف بڑھا شام نے جیسے ہی جھاڑیاں ہٹائی تو ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی جس کی عمر 16، 17 سال کی ایک آدمی نے وہ بوجھ رکھا تھا اور اس کے ساتھ دست دراز کر رہا تھا۔

شام نے اس آدمی کو پیچھے سے پکڑ کر کھینچا تو وہ

بري طرح بوکھلا گیا اور گھبرا گیا، شام نے اس پر خنجر اٹھایا تو اس آدمی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گیا۔

وہ لڑکی جو دراصل تری کال کی بیٹی میرو تھی کپڑی جھاڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اے اجنبی تم کون ہو؟ جو اس سے بھگوان بن کر میری عزت بچانے کے لئے آئے۔“

شام جو بڑی محویت سے میرو کو تک رہا تھا ایک دم چونکا۔ ”جی میں پر دیسی ہوں ماما پتا پر لوگ سدھار چکے ہیں، میں کام کے سلسلے میں ادھر آ نکلا تھا کہ آپ کی چیخوں سے ادھر آیا۔“

میرو بولی۔ ”آپ کا بہت بہت دھننے داؤ، میں یہاں کے بڑے ناتری تری کال کی اکلوتی بیٹی میرو ہوں، میں یہاں لکڑیاں چنے آئی تھی کہ اس دشت نے مجھے اکیلا پا کر میری عزت لوٹنی چاہی اگر تم نہ ہوتے تو آج یہ میری عزت لوٹ چکا ہوتا۔“

شام کا ذہن تو اس ایک بات میں اٹک گیا کہ یہ تری کال کی بیٹی ہے اس نے سوچا۔ ”اس لڑکی کو اپنے پریم جال میں پھنسا لو تو ناگ مٹی اسی کے ذریعے حاصل کر سکتا ہوں۔“ اس نے میرو سے کہا۔ ”آپ بہت سمندر ہیں، اس طرح اکیلی گھر سے نکلا کریں، آپ ہیں ہی اتنی سمندر کہ جو دیکھے گھٹل ہو جائے۔“

میرو اپنی اتنی تعریف سن کر شرما گئی اور ویسے بھی میرو کو شام ایک ہی نظر میں اچھا لگے تھا۔

”اجنبی میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں اپنے ہاپو سے ملاتی ہوں، وہ تمہیں ضرور کوئی کام دے دیں گے۔“

شام تو یہی چاہتا تھا تو رامیرو کے ساتھ چل پڑا۔

”ہاں بیٹی! مگر میرو یہ اجنبی کون ہے اور تم اسے کیوں یہاں لائی ہو؟“

”بابو جب میں لکڑیاں چنے گئی تھی تو بھولو نے میری عزت لوٹنی چاہی، یہ اجنبی کام کی تلاش میں ادھر آ رہا تھا کہ میری بیٹی سن کر میری مدد کی اور مجھے بھولو کے چنگل

سے آزاد کیا۔" اور میرا وسک پڑی۔

"بھولو کی یہ مجال کہ اس نے تری کال کی بجلی کی عزت پر ہاتھ ڈالا۔ جنگلی! تری کال نے جنگلی کو آواز دے کر بلایا۔" جنگلی بھولو کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ہمارے سامنے لے آؤں اسے ایسی سزا دوں گا کہ وہ جیون بھریا رکھے گا۔"

"جی سرکار! بھولو نے کہا۔

"جی تم اس ایچی کو پانی دانی پلاؤ میں اس سے بعد میں بات کروں گا۔" تری کال نے کہا۔

باپ کی بات سن کر میرا شام سے بولی۔ "اجنبی میرے ساتھ چلو۔" اور شام کو لے کر میرا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں پہنچ کر میرا بولی۔ "اجنبی تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام شام ہے۔" شام بولا۔

"جی تم جاؤ۔" تری کال نے شام کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

"اجنبی تم نے ہم پر جو احسان کیا ہے ہم سو بار بھی جنم لیں تو تمہارا یہ احسان نہیں اتار سکتے آج سے تم ہماری بہن بنی رہو گے اور میں کھنڈرات سے جنگلی کو ہٹا کر تمہیں وہاں کا پہرہ دار بناتا ہوں۔"

"ویسے تمہارا نام کیا ہے؟"

"جی میرا نام شام ہے۔" شام نے کہا۔

شام کی تو جیسے منی کی اگیا پوری ہوئی یہ وہی کھنڈرات تھے جن میں تری کال نے ناگ منی کو چھپا کر ایک خفیہ جگہ رکھا ہوا تھا۔

جنگلی بھی میرا دیکھ کر دل میں پسند کرتا تھا۔ جنگلی کبھی چکا تھا کہ شام سے میرا پریم کرے لگی ہے اور دوسری طرف تری کال نے کھنڈرات کی پہرہ داری بھی شام کے سپرد کر دی۔ جنگلی کے دل میں شام کے لئے نفرت پیدا ہوئی اور وہ اسکی ہتھیا کرنے کا منصوبہ بنانے لگا۔

ایک دن شام ایک درخت کے نیچے بیٹھا ناگ منی کو حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کر رہا تھا کہ جنگلی نے اپنے ایک خاص ناگ۔ پنی ناگ کو شام کو ڈنسنے کے لئے

بھیجا، پنی ناگ تیزی سے رینگتا ہوا شام کو ڈنسنے جا رہا تھا ناگ جیسے ہی شام کے پاس پہنچا اور اسے ڈنسنے کے لئے جیسے ہی اپنا بچن اٹھایا اچانک ایک سنہرے رنگ کے خوبصورت سانپ نے اس پر حملہ کر دیا دونوں سانپ زبردست چھنکاریں مارتے ہوئے ایک دوسرے پر ہل پڑے دان کی خوفناک چھنکار سن کر شام ایک دم اپنے خیالوں کی دنیا سے لوٹ آیا اس کے نظر جیسے ہی اپنے سامنے موجود لڑتے ہوئے دو سانپوں پر پڑی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ایک کالا خوفناک سانپ شام کی طرف بڑھتا اور جیسے اسے ڈنسا چاہتا ہو دوسرا سنہرا خوبصورت سانپ اس کا راستہ روک لیتا جیسے وہ شام کی حفاظت کر رہا ہو آخر کار سنہرا سانپ دکالے سانپ پر غالب آ گیا اور اس کا خاتمہ کر دیا۔ سانپ کو مارنے کے بعد سنہرا سانپ تیزی سے شام کی طرف بڑھا تو شام ڈر کے مارے بھاگنے اور چپخنے لگا۔

"اجنبی ڈرو نہیں میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔" اپنے پیچھے ایک نوالی کھتی آواز سن کر شام نے جیسے ہی پلٹ کر دیکھا اس کی آنکھیں جیسے پھٹ پڑی کیونکہ اب وہاں پر سنہری سانپ کے بجائے ایک بہت خوبصورت لڑکی کھڑی تھی۔ وہ بولی "اجنبی مجھ سے مت ڈرو میں ایک اچھا داری ناگمن ہوں میں اکثر یہاں آتی ہوں تری کال کو ڈنسنے کے لئے۔"

"لیکن تم کیوں تری کال کو ڈنسا چاہتی ہو ناگمن بہن۔" شام نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

"جب تم نے مجھے بہن کہہ دیا تو آج سے تم میرے بھائی ہو۔ میں تیری کال کو اس لئے ڈنسا چاہتی ہوں کہ اس نے میرے پنی ناگ شہ سے ناگ منی چھین لی ہے اور میرے پتی کے پاس اس وقت اتنی گھٹی نہیں تھی کہ وہ تری کال سے مقابلہ کر کے اپنی منی حاصل کر سکے اس لئے وہ دھرتی کے اندر خود کو چھپا لیا ہے۔ جیسے ہی وہ باہر آئیں گے وہ تری کال کو ختم کر کے منی حاصل کر لیں گے میں نے وہ منی حاصل کرنے کے لئے بہت کوشش کی لیکن

میں وہ منی موجود ہے اس کے آس پاس کی زمین کو تری کال نے اپنے منروں سے کنڈل قائم کر دیا ہے۔ جو بھی اس کنڈل کے قریب جاتا ہے جل کر ہضم ہو جاتا ہے۔" ناگمن نے پوری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ یہ سب سن کر شام کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اس نے کہا۔ "مجھے ابھی پتہ چلا ہے کہ ناگ شہر کہاں پر تھا۔"

"جی تم ناگ شہ کو کیسے جانے ہو کیا وہ دھرتی سے بھر آئے گئے ہے۔ بتاؤ یہاں کہاں ہیں؟" ناگمن جس کا نام موٹی تھا نے خوشی سے معقولہ لہجہ میں کہا۔

"موٹی بہن مجھے بہت افسوس ہے کہ میرے دھرم پرانے انجانے میں ناگ شہ کو تھپا ہو گئی ہے۔"

"کیا؟" موٹی ایک دم سے زمین پر بیٹھنے ہوئے بولی۔

"ہاں موٹی بہن! میں اس لئے یہاں تری کال کی اس بہن بنی آ یا تھا تا کہ وہ ناگمن منی لے کر ناگ شہ کو جیون دان دے سکے۔ تب ہی میرے دھرم پرانے انجانے میں ہوئے باپ سے چھٹکارا مل سکا ہے۔"

موٹی ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "اگر میرے ناگ شہ کو ناگ منی سے جیون دان مل سکا ہے تو وہ ناگ منی اب ہی تمہیں ملے گی۔"

"لیکن وہاں تو تری کال نے شام نے کچھ کوٹا چاہا لیکن موٹی ایک دم سے اپنی جگہ سے غائب ہو گئی۔ شام تیزی سے کھنڈرات کی طرف بھاگا کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ موٹی منی حاصل کرنے کے لئے کھنڈرات کی طرف گئی ہوگی جب شام وہاں پہنچا تو اور گرد آگ لگی ہوئی شام کچھ چکا خاکہ موٹی اس آگ کو بجھانے کی کوشش کرنے لگی ہے۔

جیسے ہی شام کی نظر اوپر اٹھتی ہوئی آگ کے شعلوں میں گھری ہوئی موٹی پر پڑی، اس نے جلدی سے بھاگ کر اس کو ایک پتلی بوری کے کنارے میں لپیٹ لیا، آگ کے شعلے بجھ گئے تو موٹی نے اکڑی ہوئی سانسوں کے درمیان شام کو منی دے دی۔" موٹی بہن یہ تم نے کیا کیا؟"

"بھیا اگر ایک منٹ ناری اپنے پتی کے لئے متی ہو سکتی ہے تو ایک ناگمن کیوں نہیں۔ اپنے پتی کے جیون کے لئے اپنا جیون تیاگ سکتی ہے۔ جا کر یہ منی میرے ناگ شہ کے پاس لے جا کر اسے جیون دان دے دو۔" یہ کہتے ہوئے موٹی کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

یہ سب باتیں کھنڈرات کی کال کٹھری میں بند پر تاب تھا کر اور ان کی پتی نے بھی سنی۔ شام جیسے ہی اس کال کٹھری کے پاس سے گزرا تو انہوں نے کٹھری کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ شام نے ادھر ادھر دیکھا تو اس کو کچھ آوازیں سنائی دی۔ اس نے غور کیا تو آوازیں کال کٹھری سے آرہی تھیں۔ اس نے ایک بڑا سیڑھا اٹھایا اور کٹھری کے دروازے کا تالہ توڑ دیا جیسے ہی تالہ توڑ کر شام اندر داخل ہوا تو گھبرا کر تاب اور دلہنوی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے تھے۔ دونوں کے بال جھاڑ جھاڑ میں تبدیل ہو گئے تھے اور مسلسل تری کال کی آوازوں نے ان کے حلیے لگاڑ دیے تھے۔

لیکن شام نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا کہ یہی میرے ماما ہیں۔ اس کے ذہن میں وہ سب کچھ تازہ ہو گیا جب مندر میں ناگ شہ سے ملاقات ہوئی تھی اور تری کال اس کے ماما پتا کو لے گیا تھا ان دونوں کو اس حال میں دیکھ کر شام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ شاکر پر تاب نے جو اس کی یہ حالت دیکھی تو اس کو شاکر پوچھا۔ "نو جوان تم کون ہو اور تمہیں کیا ہوا؟"

"کتنا خوش نصیب ہوں میں کہ آپ لوگوں کے درشن ہوئے۔"

"میں ہی آپ کا چندہ سال سے پیچھاڑا ہوا بیٹا شام ہوں۔"

"ماما پتا دونوں شام سے لپٹ کر زاد و قطار روانے لگے۔ شام بیٹے! میں نے تمہاری اور موٹی کی تمام باتیں سن لی ہیں اس سے پہلے کہ تری کال یہاں آ جائے ہم لوگوں کو یہ ناگ منی ناگ شہ کے پاس لے کر جانا چاہئے۔" جیسے ہی وہ کال کٹھری سے باہر نکلے تو



مہمان

غیرہ فاطمہ - کراچی

موسلا دھار بارش نے اس علاقے کے لوگوں کو ہلکان کر کے رکھ دیا تھا، دو لہٹکے ہوئے مسافر ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک بوڑھے نے دروازہ کھول دیا، وہ رات بھر اس گھر میں آرام کرتے رہے، مگر پھر صبح کا اجالا پھیلتے ہی وہ دھشت زدہ ہو گئے آخر کیوں؟

کیا برسوں پہلے مرے ہوئے لوگوں کی رو میں اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے سرگرداں رہتی ہیں

شدید طوفانی بارش تھی، اور آگے راستہ
 گاڑی کو یہاں سے موڑ لیں..... آگے جا کر سیدھے
 ہاتھ سے راستہ اندر جا رہا ہے..... میرا خیال ہے کہ وہ
 جگہ کچھ بہتر ہے گی۔“
 ”مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ واپسی میں اس قدر
 بارش کا سامنا ہوگا.....“ ڈاکٹر واصف بڑبڑایا۔
 حامد خاموش بی رہا تھا، بہر حال ڈاکٹر واصف
 نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور کار کو گھما کر تھوڑا راستہ

”میں کسی حد تک اس جگہ سے واقف ہوں۔“
 اسٹنٹ حامد نے اس کی نظریں بھانپ لیں۔ ”آپ

میر و کوکڑے ہوئے پایا۔“ میر و وہ ”شام نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”نہیں شام! کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے میں نے سب کچھ دیکھ اور سن لیا ہے، مجھے دشواں نہیں ہو رہا کہ میرا اپنا پتا اتنا پگھل چکا ہے میں اپنے پتا سے نفرت کرنے لگی ہوں، میں تم سے پریم کرتی ہوں اگر تم مجھے سوینکار کرتے ہو تو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“

ہاں میر و! پہلے تو میں نے تم سے پریم کا ناکہ کیا لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ میں بھی تم سے سچ سچ پریم کرنے لگا ہوں، آؤ ہمارے ساتھ۔“

وہ لوگ وہاں سے سیدھے کالی مانا کے مندر گئے کیونکہ سادھو شری رام نے ناگیشور کا شری رام کالی مانا کے مندر کے تہ خانے میں چھاپا ہوا تھا شری رام نے جیسے ہی ناگ مٹی ناگیشور کے سینے پر رکھی تو اس سے تیز روشنی کی صورت میں شعاعیں خارج ہو کر ناگیشور کے جسم پر پڑیں تو ناگیشور سکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اس نے شام اور پریتاب ٹھا کر کا شکر یہ ادا کیا۔

اور تری کال جب اپنے مخصوص وقت پر کھنڈرات میں پہنچا تو نہ ناگ مٹی بھی اور نہ ہی پریتاب اور اس کی جتنی یہ دیکھ کر تری کال غصے سے پاگل ہو گیا۔ ”جس بات کا ذکر تھا وہی ہوا۔“ پھر اس نے اپنے منستروں کے ذریعے سارے معاملات کا پتا کر لیا۔

اس نے اپنی بین الجھائی اور اس راستے پر چلا جو کالی مانا کے مندر کی طرف جاتا تھا۔ وہ بین بجاتا ہوا جارہا تھا جب وہ مندر کے قریب پہنچا تو بین کی آواز سننے ہی ناگیشور کی حالت غیر ہوئے لگی اور وہ زمین پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ ٹھا کر پریتاب نے کہا۔ ”شام بیٹے تم کسی طرح تری کال کے گلے میں موجود تعویذ اتار لو تو اس کی ساری شکستیاں ختم ہو جائیں گی اور پھر ناگیشور اس کو ڈس سکتا ہے نہیں تو یہ ناگیشور کو مار کر اس سے دوبارہ یہ مٹی حاصل کر لے گا اور اگر ایسا ہوا تو یہ انسان سے دشت بن جائے گا۔“

شام دوڑ کر مندر کے بیرونی دروازے کے پیچھے



ملے کرنے کے بعد سیدھے ہاتھ پر دکھائی دینے والی سڑک پر ڈال دیا۔

اس کے علاوہ اوکوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اتنی رات گئے ہونے والی موسلا دھار بارش نے تو راستے مسدود کر دیے تھے۔

وہ دونوں ایک دور دراز قصبے سے لوٹے تھے۔ انہیں وہاں ایک مریض کو دیکھنا تھا۔

موسم تو شام سے ہی ایراؤد تھا، لیکن کسی کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ بجلی بوند باندی سے شروع ہونے والی بارش آہستہ آہستہ طوفانی شکل اختیار کر لے گی۔

ویسے تو اس کا اسسٹنٹ حامد اچھی طرح جانتا تھا کہ بہت مقول قسم کی فیس ڈاکٹر واصف کو جہنم میں بھی جانے کے لئے تیار کر سکتی تھی۔

دونوں اطراف میں اونچے اور گھنے درختوں کی قطاریں تھیں، کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سامنے کا منظر دیکھنا کافی دشوار گزار ثابت ہو رہا تھا۔

کار ایک نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

”ایک منٹ!“ وفتا حامد تیز آواز میں بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب..... وہ دیکھیں..... وہ..... سامنے کوئی عمارت ہے شاید۔“

اس کی بات سن کر ڈاکٹر واصف نے بھی ذرا گردن آگے کر کے غور کیا۔

”ہاں بھئی..... کوئی عمارت ہی ہے۔ میرے خیال سے..... میں کا کو ادھر ہی لے چلا ہوں۔ بڑی اچھی بات ہے، اگر کوئی قحطی پناہ گاہ مل جائے۔“

عمارت کی وضع قطع بتا رہی تھی کہ وہ کوئی ریست ہاؤس ہے۔

اور وہ ریست ہاؤس ان کیلئے اندھیرے میں روشنی کی کرن ثابت ہوا تھا۔

دیے حامد کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ اس وقت ڈاکٹر واصف کی کوئی نیکی کام آئی تھی۔

وہ لالچی ضرور تھا، لیکن حامد جانتا تھا کہ کسی انسانی

جان کو خطرے سے نکالنے کے لئے ڈاکٹر واصف اپن خون پسینہ ایک کر دیتا تھا۔

اپنی کار کو درختوں کی آڑ میں کھڑی کرنے کے بعد دونوں جلدی جلدی قدم بڑھا کر ریست ہاؤس کے دروازے پر پہنچے۔

اتنی سی دیر میں ہی دونوں کے کپڑے پانی سے شرابور ہو چکے تھے۔

حامد نے آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکنا، بجلی دستک تو خالی ہی تھی، دوسری بار بھی نڈارو۔

”اندرونی موجود تو ہے۔“ ڈاکٹر واصف بریلا بولا۔ ”وہ دیکھو..... اندر روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ ذرا زور سے پٹی دروازے کو۔“

اب کی بار کوشش بار آور ہوئی اور اندر سے کھڑکی کی آوازیں آئیں۔

جلدی ایک یوزمی سی مردانہ آواز ان کے کانوں سے نکل آئی۔

”کون ہے.....؟“ ابھی دروازہ کھولا نہیں گیا تھا۔

”ہم مسافر ہیں.....“ ڈاکٹر واصف نے بلند آواز سے کہا۔ ”بارش بہت تیز ہے..... ہمیں بارش رکنے تک پناہ چاہئے۔“

”چور ڈاکو تو نہیں ہوتا.....؟“ سوال کیا گیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی، پھر حامد بولا۔

”جی نہیں.....“

”ٹھیک ہے.....“ آواز آئی۔

اور پھر دروازہ آہستہ سے کھلا چلا گیا۔

ان کے سامنے سفید لباس میں ایک دیلا پتلا سا بوڑھا آدمی کھڑا تھا۔ وہ فوراً ہی بولا۔

”آؤ..... آؤ..... آؤ..... آؤ..... اندر آ جاؤ۔“

کر بائیں جانب والے کمرے میں چلے جانا.....

تمہارے کپڑے تنگ ہیں۔ کمرے تو نہیں مل سکیں گے..... البتہ وہاں آتشدان موجود ہے۔ تمہارے گیلے کپڑے سکھانے میں وہ تمہاری مدد کرے گا۔ تم لوگ اہل جاؤ..... میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“

یہ ہدایات دے کر بوڑھا آگے بڑھ گیا، ڈاکٹر اور اس کے اسسٹنٹ نے دیکھا کہ یہاں کئی کچھ مبینہ لیب لگے ہوئے تھے جن کی روشنی اندرونی حصے کو جگمگا رہی تھی۔

نی الحال تو اندھے کو دو آنکھیں دستیاب ہو چکی تھیں۔ ان دونوں نے اسی کمرے کا رخ کیا، جس کے بارے میں بوڑھے نے بتایا تھا۔

یہاں بھی کیرسین لیب روشن تھا اور ایک کونے میں آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔

”واہ..... مزا آ گیا.....“ ڈاکٹر واصف کے منہ سے نکلا۔ ”سردی بھی محسوس ہو رہی تھی.....“

”آؤ..... ادھر ہی بیٹھے ہیں۔“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب.....“ حامد نے سر ہلایا۔

یہاں ایک بڑا سا چمک موجود تھا، قریب میں ایک میز بھی رکھی تھی۔

”یہ بڑے میاں کہاں غائب ہو گئے.....؟“ آگ کے قریب بیٹھنے کے بعد ڈاکٹر واصف بڑبڑایا۔

”کہہ تو گئے ہیں کہ تم لوگ بیٹھو..... میں آتا ہوں۔“ حامد نے یاد دلایا۔

ڈاکٹر واصف نے سر ہلایا بارش اب بھی زور و شور سے جاری تھی۔

پھر کالی دیر بعد دروازے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

بوڑھا کمرے میں داخل ہوا، لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔

سفید ہی رنگ کے لباس میں ملبوس اس کی ہم عمر

ایک بوڑھی عورت بھی اس کے ساتھ تھی۔

دونوں کے ہاتھوں میں کھانے کے برتن تھے۔ ”چلو بھئی..... تم لوگ بھوکے ہو گے..... کھانا بھی کھا لو۔“ بوڑھے نے کہا۔

واصف اور حامد بے بسا تھ کر کھڑے ہو گئے۔ ”ارے..... آپ نے یہ تکلیف کیوں کی.....؟“ ڈاکٹر واصف نے کہا۔

”تکلیف کیا بھئی.....؟“ بوڑھا مسکرایا۔ ”تم لوگ تو آج ہمارے مہمان ہو۔“

پھر ان دونوں نے برتن میز پر رکھ دیے۔ بوڑھی عورت کھانا لگا کر خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

”چلو بھئی شروع ہو جاؤ.....“ بوڑھے نے انہیں مخاطب کیا۔

کھانے کی بڑی اشتہا انگیز خوشبو میں کمرے میں پھیل رہی تھیں۔

”آپ بھی آئیں ناں.....؟“ ڈاکٹر واصف نے لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

”نہیں.....“ بوڑھے نے طویل سانس لی۔ ”میرے نصیب میں جو کچھ تھا..... میں کھا چکا۔“

”کیا مطلب.....؟“ حامد چونکا۔

بوڑھے نے بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ پھر یکدم ہی مسکرا کر بولا۔

”میں پہلے کھا چکا ہوں۔ اور یہ کھانا تم لوگوں کے لئے ابھی تیار کیا گیا ہے۔“

”اوہ..... اچھا.....“ حامد نے سر ہلایا۔

”پھر بھی..... آپ تھوڑا بہت تو ہمارا ساتھ دیجئے.....“ ڈاکٹر واصف نے کہا۔

”اجازت نہیں ملے گی.....“ بوڑھے نے مایوسی کے عالم میں سر ہلایا۔

”اجازت..... اکس سے نہیں ملے گی.....؟“

”پیٹ سے.....“ بوڑھا مسکرایا۔

”یہ سن کر وہ دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے

مشہور و معروف راسخو مسلم راہی کی مفید کتابیں

40/-	ابراہیم لودھی
40/-	بہلول لودھی
40/-	ظہیر الدین بابر
40/-	ہمایوں
40/-	شیر شاہ سوری
40/-	جلال الدین اکبر
40/-	چاند بی بی
40/-	نور الدین جہانگیر
40/-	نور جہاں
40/-	شاہ جہاں
40/-	اورنگ زیب عالمگیر
40/-	بہادر شاہ ظفر
40/-	سلطان حیدر علی
40/-	ٹپو سلطان
40/-	احمد شاہ ابدالی
40/-	حمورابی
40/-	سائرس اعظم
40/-	سکندر اعظم
40/-	یونی بال
40/-	کلو پترہ
40/-	چنگیز خان
40/-	ہلاکو خان
40/-	ہیلن آف ٹرائے
40/-	نپولین بوناپاٹ
40/-	ہٹلر اعظم

شیخ بک انجنی اردو بازار کراچی

فون: 32773302

چھ بے معنی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اور ان کا تعلق لاشعور سے ہوتا ہے۔ جب اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں تو 24 گھنٹے جاکنے والا ذہن کمزور پڑ جاتا ہے۔ میں بھی ان کی باتیں سن رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ یہ بے معنی کی بات ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے انہیں گریڈ انہیں۔ ورنہ وہ کسی قسم کی داستان لے کر بیٹھ جاتے۔

میں یہاں صرف یہ رات گزارنی ہے۔ اور میں اس لئے کوئی کھراک پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ شاید اس ماحول کا تم پر اثر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم خوف محسوس کر رہے ہو۔ ہر قسم کے حالات کو ذہن سے بخور دو۔ لیٹ جاؤ۔ اور سونے کی کوشش کرو۔ اوکے۔“

حامد نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا اور چنگ پر دراز ہو گیا بارش۔ اب بھی جاری تھی۔ دونوں بے خبر ہو کر سوئے تھے۔ صبح سب سے پہلے حامد کی آنکھ کھلی، اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح کے 9 بج رہے تھے، ذہن صبح طرح بیدار ہوا تو اسے جینی ہوئی رات کے مناظر یاد آئے۔ ساتھ ہی اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر پوچھا کہ ڈاکٹر واصف کی طرف چھٹا۔ وہ ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب!“

”آں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

”ہم کہاں سوئے تھے۔“

”جی ہاں۔“ حامد نے سر ہلایا۔ ”لیکن وہ جگ کہاں ہے؟ ہم تو فرش پر پڑے ہیں۔“

مری گیا ہے، تو اس کا علاج کیسے ہو سکتا ہے۔ موت کا تو کوئی علاج ہی نہیں ہے۔ کیونکہ موت کوئی مرض نہیں ہے بلکہ قدرت کا عمل ہے۔“ اس نے تفصیل بتائی۔ حامد خاموشی سے دونوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ بوڑھے کے چہرے پر ایسی چھا گئی۔“ پھر تو تم سے بات کرنا بیکار ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ اب تم دونوں بھی سو جاؤ۔ ظاہر ہے کہ اب اتنی رات گئے تو تم لوگ جاؤ گے نہیں۔ اسی چنگ پر لیٹ رہو۔ اب صبح ہی واپس جانا۔ ٹھیک ہے ہاں۔۔۔۔۔“

”جی بالکل۔“ ڈاکٹر واصف نے جلدی سے سر ہلایا۔ ”یہ بھی آپ کی مہربانی ہے۔“

”مہربانی کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ ”تم لوگ ہمارے مہمان ہو۔ اچھا اب میں جا رہا ہوں تم لوگ آرام کرو۔“

یہ کہہ کر بوڑھا کھانے کے خالی برتن اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔

”ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔۔!“ اس کے جاتے ہی حامد نے سرگوشی کی! ”مجھے مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔“

اسی وقت ایک زوردار دھماکہ کی آواز سنائی دی بہت غضب کی بجلی چمکی تھی۔ یہ دھماکہ بادلوں کی گڑگڑاہٹ کا تھا۔

ڈاکٹر واصف نے چونک کر حامد کی شکل دیکھی وہ واقعی خوف زدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

”کیوں۔۔۔۔۔ ڈر کیوں لگ رہا ہے تمہیں۔۔۔۔۔؟“ اس نے پوچھا۔

”آپ نے بوڑھے کی باتوں پر غور کیا؟ اور پھر۔۔۔۔۔ کچھ عجیب سا ہی احساس ہو رہا ہے مجھے۔ میں اس احساس کو کوئی نام دینے سے قاصر ہوں۔“ حامد کے لہجے میں الجھن تھی۔

”اوہ۔۔۔۔۔“ ڈاکٹر واصف بے ساختہ ہنسا۔ ”تو تم اس لئے ڈر رہے ہو۔ دیکھو۔ اس عمر میں اکثر لوگ

انہیں خاموشی سے کھاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

”کھانا تو بہت زبردست تھا۔“ حامد نے تعریف کی۔

ڈاکٹر واصف نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

”واقعی۔۔۔۔۔ آئی کا ہاتھ بہت باکمال ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ بات تو میں بھی مانتا تھا۔“

”بوڑھے نے جواب دیا۔

”مانتے تھے۔ کیا مطلب ہے؟“ ڈاکٹر واصف نے پوچھا۔

”بھئی گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ ”شادی سے پہلے جب میں اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے کھاتا تھا۔ تو خوب تعریفیں کرتا تھا۔ شادی کے بعد پھر کبھی تعریف نہیں کی۔“

دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔

”یہ بتاؤ۔ تم دونوں کیا کرتے ہو۔۔۔۔۔؟“

جواباً ڈاکٹر واصف نے اپنا اور حامد کا تعارف کر دیا۔ بوڑھے کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہو گئے۔

”واہ۔۔۔۔۔ بھئی واہ۔“ بوڑھے نے برسرِ تلخ میں کہا۔ ”میں کسی ماہر ڈاکٹر کی ہی تلاش تھی۔ اچھا ہوا تم مل گئے۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ آپ حکم کریں۔ ہم حاضر ہیں۔“ ڈاکٹر واصف نے خندہ پیشانی سے کہا۔

”اچھا۔ یہ بتاؤ۔ اگر کوئی کبھی حادثے میں مر جائے۔ تو تم اس کا علاج کر سکتے ہو۔؟ اسے دوبارہ زندگی دلوا سکتے ہو۔؟“ بوڑھے نے عجیب سا سوال کیا۔

”جی۔۔۔۔۔!“ ڈاکٹر واصف نے حیرت سے کہا۔ ”میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔“

”لیکن میں نے تو بہت آسان اردو بولی ہے۔“ بوڑھے کے لہجے میں بھی حیرت تھی۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی حادثے میں

”ارے..... واقعی.....“ ڈاکٹر واصف چونک اٹھا۔

وہ دونوں ہی ننگے فرش پر پڑے ہوئے تھے دونوں نے جلدی سے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ نہ پتک تھا نہ وہ کھانے کی ٹیبل اور..... آتشدان بھی اس طرح اجاڑ پڑا تھا جیسے اس میں برسوں سے آگ نہ جلی ہو۔

”کیا ہے؟“ ڈاکٹر واصف کے منہ سے نکلا۔
”حامد کے چہرے پر تو ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔“
”ہم نے رات کو خواب دیکھا تھا.....“ اس نے کہا۔
”دو انسان ایک ساتھ ایک ہی خواب کیسے دیکھ سکتے ہیں؟“ ڈاکٹر واصف نے اس کا خیال رد کر دیا۔ ”آؤ..... بڑے میاں اور ان کی بیگم کو دیکھتے ہیں.....“

دونوں کمرے سے نکل آئے اور آواز دینے لگے۔
”بڑے صاحب..... ابو بے صاحب.....! بڑے میاں.....“
لیکن سنتا کون.....؟ وہاں کون تھا.....؟ وہ عمارت تو اس طرح خالی پڑی تھی جیسے ان دونوں کے علاوہ کسی ذی روح نے برسوں سے یہاں قدم نہ رکھا ہو۔

رات کو جو کیروسین لمب جل رہے تھے، وہ تک غائب تھے۔ دونوں سر پھروں کی طرح عمارت میں چکر اکر رہ گئے۔

آخر کار ان کے پاس ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے علاوہ کچھ نہ بچا تھا۔ بارش رات میں نہ جانے کس وقت ختم ہو چکی تھی۔

”وہ دونوں آخر کہاں گئے.....؟ اور سارا سامان.....؟“ ڈاکٹر واصف بڑبڑایا۔

”جو احساس مجھے رات میں ہو رہا تھا۔ وہی اس وقت بھی مجھ پر حاوی ہو رہا ہے.....“ حامد نے پریشان کن لہجے میں کہا۔ ”یہاں سے نکلیں ڈاکٹر صاحب!“

ڈاکٹر واصف کچھ نہ بولا۔ اس کے سامنے پرہیز کی ٹکٹیں پڑ گئی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔
”یار..... کھانے کے برتن تک غائب ہیں.....“
”نکلیں یہاں سے.....“ حامد زور دے کر بولا۔ ”اب یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔“
”ہاں..... چلو.....“ ڈاکٹر واصف نے اثبات میں سر ہلایا۔

انہوں نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آئے۔ ان کی کار اسی حالت میں کھڑی تھی، جیسے رات انہوں نے اسے چھوڑا تھا۔
بارش کا پانی ابھی بھی ارد گرد موجود تھا، لیکن اب مطلع صاف تھا اور صوب میں بھی تیزی تھی۔
دونوں کار میں بیٹھ گئے، ڈاکٹر واصف نے ڈرائیونگ سنبھال لی۔

ڈاکٹر واصف نے وہی راستہ منتخب کیا، چنانچہ کار اب آگے بڑھ رہی تھی۔

”رات میں تم کہہ رہے تھے کہ اس جگہ سے واقف ہو.....“ ڈاکٹر واصف نے اسے یاد دلایا۔
”جی ہاں.....“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ عمارت میرے ذہن میں ہرگز نہیں تھی..... اور ایسے بھی یہاں اکثر اسی ٹائپ کے روڈ ہیں.....“

”تو پھر..... کیا گاڑی بیک کر لوں.....؟“
”نہیں..... اسی روڈ پر آگے بڑھتے رہیں.....“

ڈاکٹر واصف نے سر ہلادیا۔ انہوں نے ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ روڈ کے کنارے 2 مزدور ٹائپ کے بندے سامنے سے آتے دکھائی دئے۔
کچھ سوچ کر ڈاکٹر واصف نے کار کی رفتار کم کر دی، اور پھر ان کے قریب جا کر بریک لگا دیئے۔
دونوں چونک سے گئے۔

”کیا حال ہے آپ لوگوں کا.....؟ خیرت ہے.....؟“ ڈاکٹر واصف نے ہانک لگائی۔
”جی..... بالکل..... شکر ہے مانگ کا.....“

انہوں نے جواب دیا۔
”آپ لوگ یہیں رہتے ہیں.....؟“
”جی نیچے کے علاقے میں بستی ہے.....“

”ہاں.....؟“
”اُدھ..... پھر تو آپ لوگوں کو معلوم ہوگا.....“
”ڈاکٹر واصف کار سے باہر نکل آیا۔ حامد بھی دروازہ کھول چکا تھا۔

”جی..... پوچھیں.....“ ایک مزدور نے پوچھا۔
”یہاں سے تھوڑی دور ایک عمارت ہے.....“ ڈاکٹر واصف نے بات شروع کی۔ ”وہاں ہمیں ایک بوڑھا آدمی اور ایک بوڑھی عورت.....“
”اب وہ آپ کو کہاں ملیں گے؟“
”جناب.....“ دوسرے مزدور نے اس کی بات ہی کاٹ دی۔ ”ان کا تو پانچ سال ہوئے..... انتقال ہو گیا..... وہ بے چارے اس دنیا میں کہاں رہے۔“

”بہت نیک میاں بیوی تھے صاحب.....“ پہلے مزدور نے بھی اقرار دیا۔ ”خاندانی لوگ تھے..... بہت نیک راز اور مہمان نواز تھے۔“
”لیکن..... لیکن..... ہم تو.....!“ حامد بولنے لگے رک گیا۔

اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولے۔

خود ڈاکٹر واصف کو بھی گویا چپ سی لگ گئی تھی۔

رات کا منظر ان دونوں کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔
”اگر یہ سچ تھا..... تو پھر رات والا واقعہ کیا تھا.....؟“
”اگر وہ خواب تھا تو وہ ہوش مند انسان ایک جیسا خواب تو دیکھ نہیں سکتے۔“

”کیوں صاحب..... کیا ہوا.....؟“ پہلے مزدور نے تشویش سے پوچھا۔ ”آپ دونوں کچھ پریشان لگتے ہو.....؟“
”ان سے ملنے آئے تھے.....“

”یہ بتاؤ کہہ..... ان کا انتقال کیسے.....؟“ ڈاکٹر واصف نے کچھ سوچ کر اپنی زبان

کھولی۔ مزدور کا سوال اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔
”ایک خوفناک ٹریفک حادثے میں دونوں ہی دم توڑ گئے تھے۔“ اس نے بتایا۔
”اُدھ..... ان دونوں کے منہ سے نکلا۔“

بڑے میاں نے رات ان سے جو کچھ کہا تھا۔ اس کا مطلب اب سمجھ میں آ رہا تھا۔
ان دونوں کے جسم میں سسٹنی سی دوڑ گئی اور سامنے سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔

”اور صاحب..... ہمارا پورا علاقہ ان کی عزت کرتا تھا۔“ یہی وجہ ہے کہ ان کے گھر پر کسی نے قبضہ نہیں کیا۔ وہ گھر ان سے ہی آباد تھا، اور اب..... وہ نہیں رہے۔ تو ہم لوگ دیواروں کا کیا کریں گے۔“

”کیوں..... صاحب.....؟“
”ہاں..... ہاں.....“ ڈاکٹر واصف نے چونک کر کہا۔ ”ان کی زندگی میں ہم ان سے نہیں مل سکے، لیکن ہم یہ بات قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ لوگ واقعی بہت نیک اور مہمان نواز تھے۔ کیوں حامد..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں.....؟“

”جی..... جی.....“
”ہاں..... بالکل..... بالکل.....“ حامد بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

مزدوروں نے بڑی عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھا، جیسے انہیں نکل کر اندازہ کر رہے ہوں کہ وہ پاگل تو نہیں ہیں۔

پھر ڈاکٹر واصف اور حامد نے جلدی سے مزدوروں کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور گاڑی میں آ گئے۔
چند سیکنڈ میں ہی کار ہوائے باتیں کرنے لگی۔
ڈاکٹر واصف نے شاید کبھی زندگی میں اتنی رفتار سے اپنی کار نہیں چلائی ہوگی۔

مزدور اب بھی وہیں کھڑے ہو کر بڑی حیرت سے دور ہوتی ہوئی کار کو دیکھ رہے تھے۔



دہشت اور خوف کے افق پر جھلمل کرتی زیر زمین کے عجیب و غریب قانون کے لباب میں لپٹی ہوئی، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش، رگ و پے میں خون کو منجمد کرتی، لرزیدہ لرزیدہ تھرا دینے والی، خوف کا دریا بھاتی، دل میں کسک پیدا کرتی، اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کہانی۔

بجس اور سپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیں گے

دوسرے صاحب نے ہمدردانہ لہجے میں اپنائیت کے انداز میں پوچھا۔

”تم دونوں نے کچھ کھایا یا بھی؟ کہیں بھوکے تو نہیں؟“

”میں نے صرف چائے پی ہے۔ میرے شوہر نے چائے دو گھونٹ لے کر چھوڑ دی تھی۔“ عطیہ نے جواب دیا۔

ان صاحب نے اپنی بہو سے کہا جو ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ ”گتھ ان کے کھانے کے لئے کچھ لے آؤ۔ ان پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ دیکھو۔۔۔ ان کی کیا حالت ہو رہی ہے؟“

تھوڑی دیر میں ان کی بہو ڈیل روٹی کے سلاکس پر جام جیلی اور کھنن لگا کر۔۔۔ لے آئی اور تھرماس بھی جس میں چائے تھی۔۔۔ یوں تو رات کا کھانا بھی کچھ بچا ہوا تھا۔ چون کہ موسم خوش گوار تھا اس لئے خراب نہیں ہوا تھا۔ جب ایک اسٹیشن پر گاڑی رک کر مسافروں نے نہ صرف ناشتا کرایا۔ چائے پلائی، دل جوئی کی۔۔۔ پھر اسے سمجھایا اور اس کا دکھ اس طرح بانٹتے رہے جیسے ان سے ان خوبی رشتہ ہو۔۔۔ انہیں عطیہ پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کس قدر حوصلہ مند اور صابر و شاکر عورت ہے۔

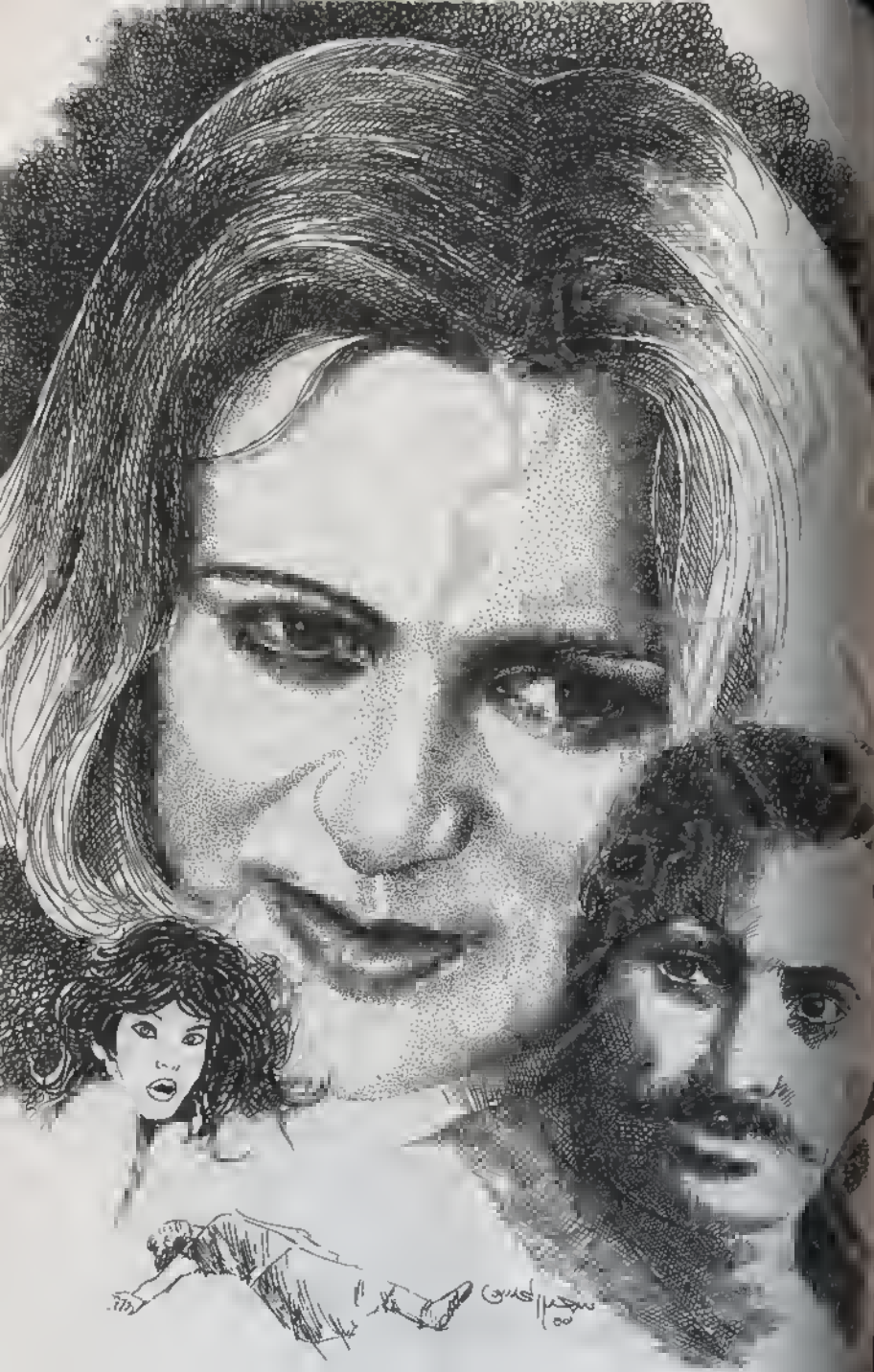
جسے زیورات چلے جانے سے زیادہ اپنے شوہر کی دل جوئی کی فکر ہے۔

یہ تو ٹائیگر جانتا تھا کہ یہ پراسرار لڑکی کیا چیز ہے۔۔۔ وال میں کتنا کالا ہے۔

☆.....☆.....☆

بنگور شہر سے دو تین گھنٹوں کی مسافت پر ویلور شہر کے ریلوے اسٹیشن پر ان کے ہمدرد ساعی اتر گئے۔ ان برتھوں پر صرف وہ رہ گئے تھے۔ کچھ دیر تک ان کے درمیان گہرا سکوت طاری رہا۔ جب گاڑی چل پڑی تو عطیہ نے کسی قدر ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”انکل۔۔۔ کیا آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں؟“ ٹائیگر مذہب میں پڑ گیا۔ اسے اندازہ نہ ہوسکا کہ وہ کس قسم کی مدد چاہتی ہے۔ وہ ان دونوں کی مالی مدد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ ان کی مالی مدد کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس لئے کہ عطیہ اسے نہ صرف پراسرار خطرناک اور فراڈ لگ رہی تھی بلکہ ایک زہریلی ٹائمن کی طرح ڈس نہ لے۔ ایک طرح سے اس نے سرفراز کو ڈس ہی تو لیا تھا۔ وہ عیار لڑکی جو کسی لومڑی سے کم بھی۔ ٹائیگر جواب دینے میں پس دیش کرنے لگا۔ کیوں کہ سفر کے دوران اس لڑکی نے اس کا بڑا خیال



کیا تھا۔

وہ ٹائیکر کو تذبذب میں دیکھ کر تہہ میں پہنچ گئی۔
اس نے ٹائیکر کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے کہا۔
"انکل..... ہمیں آپ کی مالی مدد کی ضرورت ہے۔"

پھر ٹائیکر نے متوجہ ہو کر پوچھا۔ "فرمائیے میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"ہمیں فقط آپ کا سہارا اور تعاون چاہئے۔"
"کیسا سہارا....." ٹائیکر پھر بھی اس کی تہہ میں پہنچ نہیں سکا۔

"ہم بنگلور پہلی بار جا رہے ہیں..... بنگلور ہم دونوں کے لئے اجنبی شہر ہے۔" عطیہ نے جواب دیا۔
"کل کر کبوتر تم دونوں مجھ سے کیا چاہتے ہو.....؟"

میں یہ کہہ رہی ہوں کہ اتنے بڑے شہر میں ہمارا کوئی بھی واقف کار نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کچھ دنوں کے لئے آپ کے ساتھ رہیں۔ ہم جلد ہی کوئی کرائے کے مکان میں منتقل ہو جائیں گے..... ہمیں یہ نہیں معلوم کہ کون سا محلہ اچھا ہے..... آپ کی رہنمائی میں مکان تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس ایڈوانس دینے کے لئے رقم موجود ہے۔"
ٹائیکر نے مشکوک ہو کر اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے پوچھا۔

آخر تم دونوں نے اس نئے شہر میں رہنے کا فیصلہ کس لئے کیا ہے جب کہ یہاں تمہارا نہ تو کوئی رشتہ دار اور واقف کار بھی نہیں ہے..... کسی سے مشورہ تو کیا ہوتا.....؟ اس لئے کہ کسی اجنبی شہر میں جا کر رہنا مذاق تو نہیں ہے.....؟ پہلے سرفراز کو جانچتے تھا کہ وہ یہاں آکر مکان تلاش کرنا..... پھر تمہیں بلا لیتا۔"

عطیہ نے جواب دینے سے پہلے سرفراز کی طرف دیکھا۔ اس کی دشمنی تھی کہ سرفراز ٹائیکر کے اس سوال کا جواب..... ٹائیکر نے جان لیا تھا کہ وہ سوال کا جواب کیا دیتا..... اس پر ایک گہری خاموشی طاری تھی۔

وہ اپنے غم اور سوچوں میں گم آنسو بہا رہا تھا۔

پھر عطیہ سرفراز کو چپ پا کر بولی۔ "یہ فیصلہ سرفراز نے کیا..... میں نے نہیں کیا انکل.....! میں پھر کیا کرتی؟"

"یہ فیصلہ سرفراز نے کیوں اور کس لئے کیا.....؟" ٹائیکر نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اس لئے کہ اسے اپنے شہر کے علاوہ میرے ماں باپ سے بھی سخت نفرت ہے۔" عطیہ بولی۔

"کیا بڑے بوجھوں سے بھی نفرت کی جاتی ہے.....؟ جب کہ وہ بزرگ کی حیثیت اور مقام رکھتے ہیں۔" ٹائیکر نے کہا۔

"جو بڑوں کی عزت اور ان کا احترام کرتا ہے۔ دنیا میں بھی وہ عزت اور احترام پاتا ہے۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" عطیہ کہنے لگی۔ "کوئی کسی سے نفرت کرتا ہے تو اسے سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں سرفراز سے کبھی رہتی تھی کہ وہ کچھ عجب بھی ایک جادو ہے۔ اس کے سامنے دنیا کا بڑے سے بڑا جادو بھی بچ ہے..... لیکن میری بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔"

"کیا عطیہ تمہارے بارے میں سچ کہہ رہی ہے.....؟" ٹائیکر نے غم زدہ سرفراز سے پوچھا۔

"جی..... جی ہاں....." سرفراز نے ایک سرواہ بھر کر جواب دیا۔ "وہ سچ بول رہی ہے۔ اس نفرت کے سبب میں نے بنگلور منتقل ہونے کا فیصلہ کیا..... ورنہ میں ہرگز اپنا شہر نہیں چھوڑتا....."

"یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔" وہ بولا۔ "کیا بنگلور شہر میں واقعی تمہارا کوئی واقف کار یا دوست نہیں ہے؟"

"دو ایک دوست اور کچھ دور کے رشتہ دار بھی موجود ہیں۔ لیکن وہ کیا کرتے ہیں کہاں رہتے ہیں۔ مجھے کچھ علم نہیں۔ وہاں سے چلتے وقت مجھے ان کے گھر والوں سے پتہ لیتا یا دیکھ لیتا رہا۔ اتنے بڑے شہر میں انہیں کہاں ڈھونڈوں.....؟ کیسے تلاش کروں۔" اس نے

دیا۔ "میں سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں۔"

"تم نے بڑی غلطی کی جو چلتے وقت ان کا پتا نہ لیا۔" ٹائیکر نے کہا۔ "جب بھی کسی نئے شہر میں جان بڑی کے ساتھ جاؤ تو واقف کار کا پتا ہونا چاہئے۔

جیسے جاؤ تو فکر کی بات نہیں ہوتی ہے..... میاں بوی کا بچہ بولی میں ٹھہرنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ لوگ مشکوک رہ جاتے ہیں۔ خیراب جو ہو سوا ہوا..... آئندہ ایسی غلطی نہیں دہرانا..... ورنہ بہت پریشانی اٹھاؤ گے۔"

ٹائیکر کو اس جوڑے کو اپنے ہمراہ لے جا کر کچھ جتن تک ساتھ رکھنے میں کوئی قیامت اور خوف نہیں تھا۔ وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے..... البتہ وہ ان باتوں کے لئے کسی بھی خطرے کے باعث بن سکتا تھا۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ان دونوں سے کسی بھی صورت سے رابطہ رکھے تاکہ قانونی حوالے پورے کرنے میں آسانی ہو..... وہ انہیں بغیر کسی ٹھوٹ کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔

آج کے کسی بھی اخبار میں ممبئی شہر میں ہونے والی ڈکیتی کی کوئی خبر نہیں چھپی تھی۔ جب کہ اس شہر میں بڑی ڈکیتی کی وارداتیں ہوتی تھیں..... اور پھر سرفراز نے جو ڈکیتی کی واردات کی تھی وہ لاکھوں کی تھی۔ اس نے سچ کا اخبار دیلو براڈ اسٹیشن پر خرید کر اس کا ایک ایک کونا دیکھا تھا۔ آئے دن جو چھوٹی بڑی وارداتیں ہو رہی تھیں اس قدر عام ہو گئی تھیں کہ اب اخبارات انہیں زیادہ نہیں دیکھتے دیتے تھے..... جرائم اور سیاسی خبریں چھاپتے تھے۔ لیکن یہ واردات سزا سزا لاکھ کی مالیت تھی جو معمولی جرائم کی خبریں کیوں شائع نہ ہوتی۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہ تھی۔ کیوں کہ بعض اوقات کسی مصلحت کی بنا پر بھی لوگ خبروں کو دبا دیا جاتا تھا۔

ایک ہی بات اس کے ذہن میں بار بار آ رہی تھی۔ وہ یہ تھی کہ اگر واردات ممبئی کی نہیں ہے تو پھر لڑکی نے اپنے گھر اس لڑکے کے ضرور صاف ہاتھ دئے ہیں۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ ضرور کسی کو بھی یا بنگلے پر

ڈاکہ مارا ہو..... یا کسی فلمی اداکار یا اداکارہ..... کسی کروڑ پتی کے ہاں ملازمت کرتے ہوں..... لڑکا ڈرائیور اور لڑکی ملازمہ ہو..... لیکن ایسا نہیں تھا۔ کیوں کہ دونوں مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور پھر کروڑ پتی لوگ اس قدر زور نہیں رکھتے..... اور پھر کسی فلمی اداکارہ کو چھوٹ دی گئی تھی تو اس نے اس لئے پولیس سے رسائی حاصل نہیں کی کہ انکس والے رسید طلب کرتے اور رقم کے بارے میں معلوم کرتے..... اگر اخبار میں ڈکیتی کی خبر ہوتی تو وہ انہیں انکسٹن پر ہی قانون کے حوالے کر دیتا۔

"انکل..... آپ کیا سوچتے گئے ہیں.....؟" عطیہ نے کہا تو اس کے خیالات کا سلسلہ بکھر گیا۔

اس نے چونک کر جواب دیا۔ "ممبئی میں میرے دوست کی ایک بیٹی ہے جو تمہاری ہم عمر ہوگی اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"آپ نے ہمارے بارے میں کیا سوچا اور فیصلہ کیا.....؟ آپ مجھے بھی اپنے دوست کی بیٹی کی طرح ہی سمجھتے۔"

"میں نے وہی سوچا ہے جو ایک دوست کی بیٹی کے بارے میں سوچتا ہے۔" ٹائیکر نے کہا۔ "بلکہ سوچنا بھی چاہئے۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا کہ میں ایک با اصول شخص ہوں۔ ذہبے دار شخص ہوں۔ کسی بھی ملک میں جاتا ہوں۔ وہاں کے قانون کا احترام کرتا ہوں..... قانون کی بالادستی پر نہ صرف یقین رکھتا ہوں بلکہ اس سختی سے عمل بھی کرتا ہوں..... تم دونوں جتنے دن جاؤ میرے ہاں رہ سکتے ہو۔ مجھے تم دونوں کی مہمان نوازی کر کے بہت خوشی ہوگی۔"

"انکل.....! آپ کس قدر سوچیت ہیں..... مجھے آپ سے اس خلوص اور محبت کی بالکل توقع نہیں تھی۔" وہ فرط مسرت سے بولی۔ "میں آپ کا احسان ساری زندگی بھلا نہ سکوں گی..... ایسا لگتا ہے کہ آپ ہمارے خاندان کے فرد ہیں۔"

بنگلور میں ٹائیکر کا ایک چھوٹا سا اثاثہ تھا۔ اس نے ایک کمرے میں دکان نکال کر اسے کرائے پر اٹھا دیا

”ٹھیک ہے۔ تم کہتی ہو تو میں انہیں اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دوں گا۔ لیکن یہ سب تم بھی تو بتا سکتی ہو۔“ سرفراز نے غمی سے کہا۔

”میں ایک لڑکی ہونے کے ناتے ان سے یہ سب کہنا نہیں چاہتی۔“

عطیہ نے تنک کر کہا۔ ”میں کسی بہانے سے تم دونوں کو تنہا چھوڑ دوں گی۔۔۔۔۔ پھر تم انہیں سکون و اطمینان سے سب کچھ بتا دیتا۔“

”ناشتے کے بعد میں ان سے کل کربات کروں گا۔ ابھی وہ گہری نیند سو رہے ہیں۔“

”تم سے ایک اور ضروری بات کہنا ہے؟“ عطیہ بولی۔

”کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟“ سرفراز کے لہجے میں حیرت عیاں تھی۔

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اسے آج ہی پورا کر کے دکھاؤ۔“ عطیہ کے لہجے میں سرانسی کی جھلک تھی۔

”زیورات اور کاغذات کی چوری نے میرا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا ہے۔ میں ساری رات ایک ہل کے لئے بھی سو نہیں سکا ہوں۔“ سرفراز نے بے رخی سے جواب دیا۔ ”میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔۔۔۔۔ ادھر تمہیں اپنی پڑی ہے۔“

”اب سوچ سوچ کر سید کوئی کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“ عطیہ نے اسے دلاسا دیا۔ ”اب تم غم کو دل سے نکال چھٹو۔۔۔۔۔ ہم دونوں مل کر حالات کا مقابلہ کریں گے۔۔۔۔۔ تم مجھے پیچھے نہیں پاؤ گے۔“

”میں یہ چاہتا ہوں کہ بریف کیس کی بازیابی تک شادی کو اتنا اسی ڈال دو۔“ سرفراز کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”وہ کس لئے۔۔۔۔۔؟“ عطیہ کا لہجہ تیر زردہ سا تھا۔

”تم مجھے عجیب و غریب شے ہو۔“ سرفراز نے جھلا کر کہا۔ ”تمہیں اپنے زیورات کے چوری ہو جانے کا ذرہ برابر بھی ملال نہیں۔ تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس نے زور دیا کہ اپنا برا حال کر لیا ہوتا۔ تمہیں صرف

اپنی شادی کی فکر پڑی ہے۔“ سرفراز کے لہجے میں زہر بھر گیا۔

”تم۔۔۔۔۔ یہ بات کیوں نہیں سوچتے کہ میں ایک لڑکی ذات ہوں۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ اپنے زیورات اور جان و مال سے کہیں۔۔۔۔۔ زیادہ عزت و آبرو کی فکر ہے۔“ عطیہ تنک کر کہنے لگی۔ ”میں نے تم سے پہلے بھی ایک بار نہیں

کئی بار کہا تھا کہ میں ایک بڑھی ہوئی لڑکی ہوں۔۔۔۔۔ بڑھی ہوئی لڑکیاں گھروں سے نکلتی جھاگتی ہیں۔ انہیں اپنے حقوق حاصل کرنا آتا ہے۔ کیوں نہ ہم اپنے اپنے دوستوں کی مدد سے باعزت طور پر شادی کر کے راستے

میں آنے والی مشکلات کے خلاف سینہ پیر ہو جائیں۔“ عطیہ نے شاید سانس لینے کے لئے توقف کیا تھا۔ پھر وہ چند ثانیوں کے بعد کہنے لگی۔ ”لیکن تم نے ہمیشہ میری اس تجویز سے اختلاف کیا کہ میرے گھر والے کہیں

تمہیں کسی کیس میں نہ پھنسا دیں۔“

”اس بات کا امکان تھا اس لئے تو میں شادی کے لئے تیار نہ ہوا تھا۔“ سرفراز نے درمیان میں کہا۔

”کیا یہ صرف یہ تمہارا خوف و خدشہ تھا؟“ عطیہ نے ہڈیانی لہجے میں کہا۔

”اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ میں اپنی سیکڑوں مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ تمہارے گھر والے تم پر جبر و زیادتی کر کے میرے خلاف جھوٹا بیان

دلا کر ان کا مقدمہ دائر کر دیتے۔“ سرفراز نے زہر خند لہجے میں کہا۔

”تم مجھے اپنی بات پوری کر لینے دو۔“ عطیہ نے بیجان زدہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد اپنا منصوبہ میرے سامنے رکھا۔ جب میں نے اس منصوبے پر عمل کرنے سے انکار کیا تو تم نے مجھے

خودکشی کی دھمکی دی اور میں تمہاری بات ماننے پر مجبور ہو گئی۔ میں تمہاری ایما پر گھر سے وہ سارے زیورات لے آئی جس میں نہ صرف میری اور میری چھوٹی بہنوں کے لئے جہیز کے لئے رکھے گئے تھے بلکہ ابو کی دکان کے بھی رکھے ہوئے تھے کہ آج کل دن و رات

دوسری پڑھتی کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔۔۔۔۔ تم نے مجھے منصوبے کے بارے میں بار بار بتایا تھا کہ ہم بنگلور چکر پہلے شادی کر لیں گے اور کچھ زیورات بیچ کر

مکان خریدیں گے۔ پھر ہم دونوں ملازمت کر لیں گے۔ اگر ملازمت نہیں ملے تو باقی بچے ہوئے زیورات

چکر کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیں گے۔ لیکن اب تم شادی کے لئے مکر رہے ہو۔۔۔۔۔ کیا شادی کے لئے زیورات کا ہونا اشد ضروری ہے۔۔۔۔۔ کیا اس کے

بغیر شادی نہیں ہوتی ہے؟“

”تم اپنی تقریر بند کرو۔“ سرفراز نے زنج مارتے ہوئے کہا۔ ”آخر میں نے پچاس ہزار روپے دیئے تھے ان زیورات کے حصول کے لئے؟“

”تو کیا وہ زیورات صرف پچاس ہزار کی مالیت کے تھے۔۔۔۔۔؟“ عطیہ تیزی سے بولی۔

”لیکن وہ ان پچاس ہزار کی بدولت ہی ہاتھ لگے تھے۔“ سرفراز نے جیسے یہ چمٹے ہوئے کہا

”نہ اس کی آواز اونچی ہو گئی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تم نے مجھے سے جھوٹ بولا تھا یا ج کہ میری بائی الہ آباد سے

اپنے سات عدد بچوں کے ساتھ اس گھر سے میں دھرتا مار کر رو رہی ہیں جہاں وہ الماری ہے جس کی تجوری میں

زیورات بھرے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ بائی۔۔۔۔۔ اب اسے مکان کی خریداری کے لئے مزید پچاس ہزار مانگ رہی ہیں

جب کہ اب انہیں دو ماہ پہلے دولاکھ دے چکے ہیں۔ ابو ہاں مول سے کام لے رہے ہیں۔ اگر بائی کو کسی

بہانے سے پچاس ہزار روپے دیئے جائیں تو وہ اسی دن لے جائیں گی۔ راستہ صاف ہو جائے گا اور۔۔۔۔۔“

عطیہ تیزی سے بات کاٹ کر بولی۔ ”کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ایک ماہ اور انتظار کر لو۔ اس

دست تک بائی چلی جائیں گی لیکن تم نہیں مانے اور فوراً پچاس ہزار کا بندوبست کر کے مجھے دینے اور کہا کہ اپنی

بائی کو آج ہی دفع کر دو اور کل زیورات لے آؤ۔ تنک کا لہجہ

نہیں تھا۔ میرا ایک قلی جاننے والا ہے۔ وہ اس گاڑی کا ریزرویشن چاہے صرف میں سنہ پہلے بھی

دلا سکتا ہے۔ جب کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ ہوائی جہاز سے چلتے ہیں۔ لیکن تم اس وجہ سے تیار نہ ہوئے کہ کہیں

کوئی چوری نہ ہو جائے۔ ہوائی جہاز سے سامان اتارنے والے چوریاں بھی کرتے ہیں۔ یہ شکایت عام ہے۔“

”مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ زیورات اس قدر منحوس ثابت ہوں گے۔۔۔۔۔ میری پچاس ہزار کی رقم لے ڈن میں

گے۔“ سرفراز غصے سے بولا۔

”یہ سب کچھ تمہاری غفلت کی وجہ سے ہوا ہے۔“ عطیہ کا لہجہ زہر خورہ تھا۔ ”لیکن میں نے پھر بھی کچھ نہیں کہا۔ اس لئے کہ تم میرے لئے ان لاکھوں کے

زیورات سے کہیں قیمتی ہو۔ میں تمہاری محبت میں اندھی ہو کر خود غرض بن گئی۔۔۔۔۔ میں نے نہ صرف اپنی بہنوں کے ساتھ سفاکانہ سلوک کیا۔۔۔۔۔ ان کا مستقبل تاریک

کر دیا بلکہ باپ کو بھی کوڑی کوڑی کا بھتا ج کر دیا۔۔۔۔۔ آخر کس لئے۔۔۔۔۔ صرف تمہارے لئے۔۔۔۔۔ کیا اب بھی

کوئی کسر رہ گئی ہے جو تم میری محبت آزمانے کے لئے میرا بڑا امتحان لیتا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ اب میرے پاس ہے

کیا جو ایسا رادہ قربان کروں۔۔۔۔۔؟“

”مگر عطیہ۔۔۔۔۔! یہ بھی تو سوچو کہ میرے پاس جو سات سو روپے رہ گئے ہیں۔۔۔۔۔ اس سے کیا ہوگا۔۔۔۔۔؟

کیا اس میں ہماری گزر بسر ہو جائے گی۔ یہ رقم کب تک ساتھ دے گی۔۔۔۔۔؟“ وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔

”اگر گزر بسر نہیں ہو سکتی ہے تو کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے۔۔۔۔۔؟“ عطیہ کی آواز رندھ گئی۔

”میں فاقے کر سکتی ہوں۔۔۔۔۔ بھوکے مرجاؤں گی۔۔۔۔۔ لیکن تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ کسی حالت میں بھی

نہیں۔۔۔۔۔ جہیں نہیں چھوڑوں گی۔۔۔۔۔ تم جس حالت میں بھی بھی رکھو گے اس میں خوش رہوں گی۔ تم میری آزمائش کر سکتے ہو۔“

سرفراز لا جواب ہو کر خاموش ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ ان دونوں کی گفتگو سے ان کی محبت بھری کہانی اور پس منظر

ٹائیگر کے سامنے آ گیا تھا۔۔۔۔۔ سرفراز کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ وہ عطیہ سے شادی کرنے سے کتر ا رہا تھا۔ لیکن

عطیہ ٹائیکر کے لئے اب بھی بے حد پر اسرار معر بنی ہوئی تھی۔ یہ موقع اس معر کو حل کرنے کا نہیں تھا بلکہ اب اسے اس ڈرامہ میں اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ اس نے اس لئے عطیہ سے ہمدردی اور اپنائیت کا اظہار کیا تھا اسے معاشرے کی لڑکیوں سے اس لئے اپنائیت سی تھی وہ مظلوم ہستی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔

☆.....☆.....☆

سرفراز..... عطیہ سے آج ہی شادی کرنے پر رضامند ہو گیا تھا۔ لیکن ٹائیکر بھی ایک شرط پر ان دونوں کا نکاح کرانے پر تیار ہو گیا تھا۔ لیکن اس شرط پر رخصتی کی تقریب ممی میں باپ کے گھر میں باعث طور پر منعقد ہوگی۔ عطیہ کے والدین اپنی بیٹی کو رسی اور روایتی طریقے سے دوا کر کریں گے۔ عطیہ کو سمجھانے کی ساری فوسے داریں اس نے اپنے سر لے لی تھیں۔ سرفراز کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ کیوں کہ وہ تنہا تھا۔ اس نے وقت یہ طے کیا تھا کہ مغرب کے بعد اس کے پڑوس کے رشید صاحب کے ہاں دلہا بن کر آئے گا۔ نکاح کے بعد اس کے اور دوست محمد احمد جو پچھلی گلی میں رہتے تھے انکے ہاں جا کر رہے گا۔ تیسرے دن وہ تینوں ممی روانہ ہو جائیں گے۔

مغرب اور عشاء کا وقت بھی گزر گیا۔ رشید صاحب سرفراز کو لے کر نہیں آئے۔ عطیہ سا دلی سے دلہن بنی اس کے پڑوس کی دوا کی شادی شدہ عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ سراپا انتظار تھی۔ رات دس بجے رشید صاحب گھبرائے ہوئے اور بے حد پریشان اس کے ہاں آئے اور بتایا۔

”سرفراز جو چھ بجے حجامت خانہ گیا تو لوٹ کر نہیں آیا۔“

وہ سمجھ گیا کہ اب وہ بھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اس نے عطیہ کے کمرے میں داخل ہو کر ان عورتوں اور لڑکیوں کو کسی جیلے بھانے سے رخصت کیا جو ولہا کے انتظار میں عطیہ کے ساتھ سوکھ رہی تھیں۔ ان

عورتوں کے چاتے ہی عطیہ نے اس کے چہرے پر نظریں کر کے جیسے سب کچھ پڑھ لیا تھا۔ وہ ایک لمحہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے قریب آ کر کہا۔

”انکل..... آپ میری خاطر پریشان نہ ہوں۔ سر راہ جو صحبت کی جاتی ہے اس کا انجام ایسا ہی عبرت ناک ہوتا ہے۔“

اسے عطیہ کی بات پر یک لخت غصہ آ گیا۔ جب وہ ایسی سمجھ دار اور دور اندیش لڑکی تھی تو اس نے گھر نہ کنوین میں چھلانگ کیوں لگائی۔؟“ وہ اپنا غصہ بند نہ کر سکا۔ ”جہیں جان بوجھ کر سرباب کے پیچھے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟“

عطیہ پر کئی غائبوں تک سوگواری غاری رہی۔

”آخر میں کیا کرتی انکل.....!“ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ”میری قسمت میرے چہرے سے کہیں بد قسمت ہے۔ کانی چلی۔ لڑکیوں کے ایک تو رشتے نہیں آتے ہیں۔ اگر بالفرض رشتے آتے ہیں تو جہیز کا سوال زہر بن کر ماں باپ کے بچے میں پیوست ہو جاتا ہے۔ جہیز کی وجہ سے میری شادی نہ ہو سکی۔ میرے والد جو لری شاپ کے مالک نہیں بلکہ سیکر میں ہیں۔ کمیشن ایجنٹ بھی ہیں۔ وہ بڑے گھرانوں کی سیکمات، لڑکیوں اور فلمی اداکاراؤں کے ہاں زیورات بھیجتے ہیں لیکن اپنی بیٹیوں کے لئے زیورات خرید نہیں سکتے ہیں۔ سرفراز میرے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ وہ میرے باپ کی دکان ہے۔ اس نے میرے ساتھ محبت کا فریب شخص اس لئے کیا تھا کہ وہ دکان کے زیورات کسی نہ کسی صورت سے بٹھا کر کسی غیر ملک فرار ہو جائے۔ اس نے ویزا ٹکٹ اور پاسپورٹ تیار کئے تھے۔ وہ مجھے بنگور میں تنہا چھوڑ کر فرار ہو جانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ تمام باتیں بعد میں میرے علم میں آئی تھیں۔ لیکن دوا لگی سے ایک دن پہلے ایک لڑکی نے بتائی تھیں جو میری سہیلی تھی۔ اس نے مجھے سرفراز کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ سرفراز کو بہت قریب سے جانتی تھی۔ سرفراز نے اسے محبت کے نام پر جانا

لیکن میں چاہتی تھی کہ سرفراز کسی طرح میرا بیچ بن جائے۔ لیکن میری آرزو پوری نہیں ہوئی۔ اس نے مجھے جیسی کی لڑکیوں کو اپنی وجاہت، اب سورتی اور دراز قد کے باعث تباہ و برباد کیا۔ میں اسی آئیڈیل پر بچھ کر برباد ہوئی رہیں۔۔۔۔۔ لیکن چوں کہ ان پڑھ اور سیدھی شخصیں اور زمانہ شناس نہیں تھیں اس لئے دھوکا کھا گئیں۔۔۔۔۔ اس دور میں ایک شادی کو اتنی برائیاں اور اسے لوٹ لینا آسان نہیں تھا۔ اس نے دو ایک مرتبہ موقع پا کر مجھے شکار کرنا چاہا لیکن میں اسے جل دے گئی۔ اس اتنی نے مجھے لے کر جو حال بچھایا تھا وہ خود ہی اس میں پھنس گیا۔۔۔۔۔ میں نے اس پچی کے تمام پرکاش دیئے۔“

”کیا تم اپنے آپ کو بھلانے اور فریب دینے کے لئے یہ سب کچھ تو نہیں کہہ رہی ہو؟“ اس نے کہا۔

”میں اپنے آپ کو فریب دے کر کیا کروں گی۔“ عطیہ نے بیگنی بیگنی نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں میں اس بات سے خوش ہوں کہ میری عزت اور شہرت ایک بھیڑیے اور شیطان سے محفوظ رہی۔“

”تم نہ صرف جھوٹ بول رہی ہو بلکہ مجھ سے بھی کچھ چھپا رہی ہو۔“ ٹائیکر اس پر برس پڑا۔ ”کیا یہ بات سن نہیں ہے کہ تم نے خواتین ہاتھوں سے بریف بس چلتی گاڑی سے باہر پھینکا تھا۔ جس میں گھر کے خزانے ہوئے زیورات تھے۔ تم نے پہلے سرفراز کے کلمات کا لفظ نہ بریف کیس سے نکال کر اپنی انچی لڑکی لیا تھا۔ آخر تم نے قیمتی زیورات باہر کیوں پھینک دیئے۔ کیا اس علاقے میں تمہارے منصوبے سے ملتی بریف کیس لینے کے لئے کوئی موجود تھا۔“

عطیہ اچھل پڑی اور حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ”تو کیا آپ اس وقت جاگ رہے تھے۔؟“

میں تو اس وقت بھی جاگ رہا تھا جب تم نے ان کے پاس سے بے ہوشی کی دوا ملائی تھی؟“

”انکل.....!“ جذبات سے اس کی آواز بھر گئی۔ ”آپ نے اس واقعے کی جو پردہ پوشی کی ہے میں اس کا احسان عمر بھی نہیں بھولوں گی۔“

”لیکن تم نے میرے اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ وہ بریف کیس پھینکا گیا تھا۔ کیا وہ زیورات اس کے اصل مالک کو مل گئے۔؟“

عطیہ کے لبوں پر ایک فاختانہ قسم ابھرا آیا۔ اس کی آنکھیں ہیروں کی طرح چمکنے لگیں اور چہرہ دکھ اٹھا۔

سرفراز کے دیئے ہوئے پچاس ہزار کی رقم میں سے صرف دو ہزار نکال کر کھلی زیورات خریدے گئے تھے۔ باقی رقم اس نے جہیز کے لئے رکھ لئے۔ اگر سرفراز مجھ سے شادی کر لیتا تو جہیز کی صورت میں واپس مل جاتی۔ اس کا پاسپورٹ جو تھا ساتھ میں امریکی ڈالر جو تھے تیس ہزار ڈالر تھے۔ وہ اسے بھی نہ دیتی بلکہ مستقبل کے لئے رکھ لیتی۔“

ٹائیکر دل میں عیش عیش کر اٹھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”انکل میرے پاس اتنی رقم ہے کہ ٹرین سے ممی جا سکوں۔ آپ ٹکٹ کا بندوبست کر کے سوار کراویں۔“

”میں تمہیں ریل گاڑی سے نہیں بلکہ ہوائی جہاز سے بھیجوں گا۔ ٹکٹ میری طرف سے ہوگا۔“ ٹائیکر نے کہا۔ ”اب جب کہ تم بنگور آئی ہو تو کیا بنگور شہر دیکھ کر نہیں جاؤ گی۔“ برا خوب صورت شہر ہے۔“

”بہت بہت شکریہ۔“ وہ ممنیت سے بولی۔

”آپ کتنے اچھے ہیں۔“

ٹائیکر نے اسے ہوٹل میں ٹھہرایا۔ تین دن تک اسے نہ صرف بنگور شہر کی سیر کرائی بلکہ وہاں کے کھانے بھی کھلائے اور اسے گاڑی بھی کرائے پر لے کر سرنگاٹم، ٹیپو سلطان اور حیدر علی کے مزاروں پر لے گیا۔ میوزیم دکھایا، برنداوان گارڈن لے جا کر رات روشنیوں کا نظارہ کرایا۔ بنگور کا میوزیم جو ہندوستان بھر میں مشہور تھا۔ پھر رام گڑھ سے میسوپاک پانچ کلومیٹر کر دیئے۔ ایسا میسوپاک ہندوستان بھر میں نہیں بنتا تھا۔ یہاں میسو

پاک بنانے والے مسلمان خاندان صدیوں سے آباد ہیں اور پھر اسے پانچ ہزار کی شاہنگ بھی کرائی اس سے وعدہ لیا کہ شادی پر وہ اسے ضرور مدعو کرے گی۔
 ”اٹھ!“ عتیہ نے کہا۔ ”آپ بھی میرے ہاں کیوں نہ مہینے چلیں۔۔۔۔۔؟“
 ”وہ کس لئے۔۔۔۔۔؟“

”اس لئے کہ میں آپ جیسے محسن کو۔۔۔۔۔ اپنے والدین سے ملانا چاہتی ہوں۔ آپ کی بدولت میری عزت محفوظ رہی۔“

”دیکھو بی عتیہ۔۔۔۔۔!“ ٹائیگر نے بڑے پیار سے اس کا گال تھپ تھپایا۔ ”میں تے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ نہ یہاں میرے دوستوں اور ملنے والوں کا ایک وسیع حلقہ موجود ہے جس میں نہ صرف شکاری دوست بلکہ میڈیا سے بھی تعلق رکھنے والے ہیں۔۔۔۔۔ چوں کہ ممبئی کی شہنی زندگی نہ صرف تھکا دیتی ہے بلکہ کلہو کا تیل بنا دیتی ہے۔ اس لئے میں سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں ایک بار چکر ضرور لگا دیتا ہوں۔ اس لئے جب بھی آتا ہوں میرے دوست شکار کا پروگرام بناتے ہیں اور میں ان کے ساتھ شکار پر جاتا ہوں۔ جس سے مجھے ذہنی اور جسمانی سکون اور آرام ملتا ہے۔ لہذا میں معذرت خواہ ہوں۔۔۔۔۔ ہاں جب میں واپس آؤں گا تب بھی تم سے اور تمہارے گھر والوں سے ملنے ضرور حاضر ہوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

”تو آپ شکاری بھی ہیں۔۔۔۔۔؟“ عتیہ خیریت سے بولی۔ ”آپ اپنی زندگی میں کتنی بار شکار کھیل چکے ہیں؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ شکار میرا شوق، میرا کاروبار اور میرا کام رہا ہے۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ ”میں شکار کھیلتا رہتا ہوں۔ ویسے جنگل میں متعدد مرتبہ شکار کھیل چکا ہوں۔“

عتیہ اس کی بات کی تہہ میں پہنچ نہیں سکی۔ اس نے مذاق سمجھا۔ پھر کہنے لگی۔

”میں نے افریقہ کے جنگلات میں بہت کچھ

بڑھا اور سنا ہے۔ کیا آپ کو آپ کا شوق افریقہ بھی گھسیا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ ٹائیگر نے سر ہلایا۔ ”ویسے کبھی زندگی میں موقع ملا تو ضرور جاؤں گا۔“

”کیا میسور کا جنگل بھی افریقہ کے جنگلات کی طرح ہے۔۔۔۔۔؟“ عتیہ نے پوچھا۔

”افریقہ۔۔۔۔۔ جنگل دیش کے سندور بن جنگل

برازیل اور جہاں جہاں بڑے جنگلات ہیں ان میں ایک قدر مشترک ہے۔“ ٹائیگر کہنے لگا۔ ”ویسے میری معلومات میسور کے جنگل کے بارے میں کچھ زیادہ ہیں۔۔۔۔۔ ایک تو یہ جنگل سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا ہے اور جنگل دیش میں جو سندور بن جنگل واقع ہے اس سے جا کر ملتا ہے۔۔۔۔۔ میسور کے جنگل میں انسانوں کی بستیوں بھی موجود ہیں۔۔۔۔۔ چھوٹی بڑی ندیاں جن پر دریا کا گمان ہوتا ہے۔ جادو گروں، شعبہ بازوں، وحشیوں اور آدم خوروں کے گاؤں بھی ہیں۔۔۔۔۔ قدم قدم پر میرا پر اسرار علوم سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ قاتل، چور اور ڈاکو بھی یہاں آ کر روپوش ہو جاتے ہیں تاکہ قانون کے ہاتھوں سے بچے رہیں۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ سرمایہ داروں نے یہاں عشرت کدے بنارکے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں جو ناسازی کا کارخانہ اور شاید دو ایک کارخانے بھی ہیں۔ کبھی ان سے سائیکل نہیں بڑا۔ وہ بڑے مرمریں، خوب صورت اور نفیس اور گداز ہوتے ہیں۔ وہ بڑے ماہر کاری گروں کے ہاتھوں تیار ہوتے ہیں۔ یہ جو تے بازداروں میں دستیاب ہیں اور غیر ممالک بھی بھیجے جاتے ہیں۔ اس قدر قیمتی ہوتے ہیں کہ ایک عام آدمی کی قوت خرید سے باہر۔۔۔۔۔ صرف سرمایہ داری خرید پاتے ہیں۔ ان کی پائیداری کا شاید ہی کسی غیر ملک کا ہونا جو ناقابلِ مبالغہ کر سکے۔“

☆.....☆.....☆

ٹائیگر اپنے دونوں دوستوں سے ملنے پریس کلب پہنچا۔ جہاں اس کے نہ صرف تمام دوست بلکہ شکاری دوست بھی موجود تھے جو ہر شام جمع ہوتے تھے۔ ان کے دم سے بڑی رونق رہتی تھی۔ ماحول بڑا سہانا، رنگین اور خوش گوشت ہوا جاتا تھا۔ وہ ان سے نہ صرف ملنے آیا تھا بلکہ شکار کا پروگرام بنانے۔ تین چار مہینے شکار کا موسم اس لئے ہوتا تھا ان میزوں میں پارش بالکل نہیں ہوتی تھی۔ برسات کے دنوں میں دلدلوں کا پتا نہیں چلتا۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ خصوصاً کالا ہرن کا شکار مقصود ہوتا تھا کہ جوان سب کو بہت مرغوب تھا کالا ہرن کا شکار میسور کے جنگل میں اس لئے ممنوع نہیں تھا کہ وہ بکثرت تھا اور حکومت کو ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ ٹیکس ادا کرنے کی صورت میں اس کی کھال لے جانے کی اجازت ہوتی تھی۔

جب وہ پریس کلب پہنچا تو اس نے اپنے تمام دوستوں کو کلب کے کینٹین میں جو ایک بڑے کشادہ اور خوب صورت ہال کی ایک میز پر جو ایک گوشے میں تھی اور ان کے لئے مخصوص ہوئی تھی براجمان دیکھا۔ وہ صبح معمول پیچہ سالہ ڈوسا کھا رہے تھے۔ ساتھ

”کیا حکومت ان چوروں، بد معاشوں اور ڈاکوؤں پر ہاتھ نہیں ڈالتی۔۔۔۔۔؟“ عتیہ بولی۔

”کوشش تو کرتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن اکا دکا ہی ہاتھ لگتے ہیں۔۔۔۔۔ کیوں کہ جنگل اس قدر گھنا، تاریک ہے اور

مادی جانوروں کی بہتات ہے اس لئے پولیس اندر جانے سے خوف کھاتی ہے۔“

آپ کا ساتھ شکار کھیلنے کے دوران مجرموں، ڈاکوؤں اور خوف ناک قسم کے جانوروں سے پڑنا رہتا ہوگا۔“

اتفاق سے نہیں۔۔۔۔۔ کیوں کہ ہم شمال جنوب

میں جاتے ہیں جہاں کالا ہرن۔۔۔۔۔ عام ہرن۔۔۔۔۔ بلیٹیں اور مرغیاں کثرت سے ملتی ہیں۔۔۔۔۔ پھر ہم ان کا شکار کر کے ایک طرح سے تفریح کا مقصد پورا کر کے چلے آتے ہیں۔“

جب وہ اسے رخصت کرنے ایئر پورٹ گیا تو عتیہ اس سے لیٹ کر ویرینک پھوٹ پھوٹ کر روئی رہی۔

☆.....☆.....☆

ٹائیگر اپنے دونوں دوستوں سے ملنے پریس کلب پہنچا۔ جہاں اس کے نہ صرف تمام دوست بلکہ شکاری دوست بھی موجود تھے جو ہر شام جمع ہوتے تھے۔ ان کے دم سے بڑی رونق رہتی تھی۔ ماحول بڑا سہانا، رنگین اور خوش گوشت ہوا جاتا تھا۔ وہ ان سے نہ صرف ملنے آیا تھا بلکہ شکار کا پروگرام بنانے۔ تین چار مہینے شکار کا موسم اس لئے ہوتا تھا ان میزوں میں پارش بالکل نہیں ہوتی تھی۔ برسات کے دنوں میں دلدلوں کا پتا نہیں چلتا۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ خصوصاً کالا ہرن کا شکار مقصود ہوتا تھا کہ جوان سب کو بہت مرغوب تھا کالا ہرن کا شکار میسور کے جنگل میں اس لئے ممنوع نہیں تھا کہ وہ بکثرت تھا اور حکومت کو ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ ٹیکس ادا کرنے کی صورت میں اس کی کھال لے جانے کی اجازت ہوتی تھی۔

جب وہ پریس کلب پہنچا تو اس نے اپنے تمام دوستوں کو کلب کے کینٹین میں جو ایک بڑے کشادہ اور خوب صورت ہال کی ایک میز پر جو ایک گوشے میں تھی اور ان کے لئے مخصوص ہوئی تھی براجمان دیکھا۔ وہ صبح معمول پیچہ سالہ ڈوسا کھا رہے تھے۔ ساتھ

”کیا حکومت ان چوروں، بد معاشوں اور ڈاکوؤں پر ہاتھ نہیں ڈالتی۔۔۔۔۔؟“ عتیہ بولی۔

”کوشش تو کرتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن اکا دکا ہی ہاتھ لگتے ہیں۔۔۔۔۔ کیوں کہ جنگل اس قدر گھنا، تاریک ہے اور

مادی جانوروں کی بہتات ہے اس لئے پولیس اندر جانے سے خوف کھاتی ہے۔“

ساتھ پاتیں کرتے جا رہے تھے اور ٹوک جھونک بھی کی جا رہی تھی۔ پیچہ سالہ ڈوسا اس ہول کی خاص ڈش تھی۔ یوں ہنگوڑ کے تقریباً تمام ہونٹوں اور ریسٹورنٹ اور کیفے میں بھی دستیاب ہوتی تھی۔ لیکن اس میں کینٹین والی بات نہ تھی۔ اس کا اپنا ایک مخصوص ذائقہ لذت تھی۔ اس لئے دو برسوں سے بلا ناغہ ہر سہ ہفتہ یہ کھانے کے لئے آتے تھے۔

ڈرون حملہ کا سنتے ہی سارے لوگ جو ہال میں موجود تھے حواس باختہ ہو گئے۔ ان سب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ یہاں اس حملے کا کوئی تصور تک نہ تھا۔ کویتا کی اور میزوں کے لوگ سبھی اپنی اپنی میزوں کے نیچے گھس گئے۔

”ڈرون حملہ۔۔۔۔۔؟“ رنگا سوای نے کویتا کی طرف دیکھا۔ وہ سنبھل چکا تھا۔ ”نہ تو میزائل داغا گیا اور نہ۔۔۔۔۔“

”ارے یہ ڈرون حملہ۔۔۔۔۔؟“ رنگا سوای نے کویتا کی طرف دیکھا۔ وہ سنبھل چکا تھا۔ ”نہ تو میزائل داغا گیا اور نہ۔۔۔۔۔“

”ارے یہ ڈرون حملہ نہیں تو کیا۔۔۔۔۔؟“ کویتا نے ٹائیگر کی طرف اشارہ کیا جو میز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سب کی جان میں جان نہ آئی۔۔۔۔۔ لوگ اپنی اپنی میزوں کے نیچے سے نکلی آئے۔ کچھ ہستے، مسکراتے اور غصے کی حالت میں سب نے بگڑ کر کویتا سے کہا۔

”تم اپنی شرارتوں اور حرکتوں سے باز نہیں آتی ہو۔۔۔۔۔ تم نے تو ڈراما دیا۔“

”ڈرانے والوں کو ڈراما جانا ہے۔۔۔۔۔ یہ ٹائیگر۔۔۔۔۔ کیا کسی ڈرون حملہ سے کم ہے۔۔۔۔۔ اسے دیکھو۔۔۔۔۔ آیا بھی ہے تو کسی ڈرون حملے کی طرح۔۔۔۔۔“

کویتا بولی۔

ٹائیگر جب میز کے پاس پہنچا تو تمام دوستوں نے کھڑے ہو کر بڑی گرم جوشی سے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ مصافحہ کیا۔ جو مرد تھے وہ نکل گئے۔ کویتا، رادھنا اور سرسوتی نے مصافحہ کیا۔ آخر میں کویتا

ٹائیگر جب میز کے پاس پہنچا تو تمام دوستوں نے کھڑے ہو کر بڑی گرم جوشی سے اس کا والہانہ

استقبال کیا۔ مصافحہ کیا۔ جو مرد تھے وہ نکل گئے۔ کویتا، رادھنا اور سرسوتی نے مصافحہ کیا۔ آخر میں کویتا

ٹائیگر جب میز کے پاس پہنچا تو تمام دوستوں نے کھڑے ہو کر بڑی گرم جوشی سے اس کا والہانہ

استقبال کیا۔ مصافحہ کیا۔ جو مرد تھے وہ نکل گئے۔ کویتا، رادھنا اور سرسوتی نے مصافحہ کیا۔ آخر میں کویتا

نے کیا تھا۔ ٹائیگر نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا، وہ ان تینوں میں سب سے خوب صورت، پرشباب گداڑ بدن کی تھی۔

”کیا تم نے میرا ہاتھ ساری زندگی کے لئے تھام لیا ہے؟“ کویتا شونی سے بولی۔

”کیا تم مجھے اتنا احق سمجھتی ہو کہ میں ایک حسین عورت کا ہاتھ ساری زندگی کے لئے تھام کر بیروں پر کھاڑی ماروں گا۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”لوگ میرا ہاتھ تھامنے اور جیون ساتھی بنانے کے لئے میرے سینے دیکھتے ہیں..... فنی کرتے ہیں.....“ وہ بولی۔ ”تم بھی تو دیکھتے ہو۔ اس لئے تو آئے ہو۔“

”دنیا میں احق کی کوئی کی نہیں ہے۔ اور پھر سینے کوئی نہیں دیکھتا ہے.....“ ٹائیگر بولا۔ ”میں جو سنا دیکھتا ہوں..... وہ تمہارا نہیں بلکہ کالا ہرن اور مرغابیوں کا.....“

”بلیک ٹائیگر ہو اس لئے..... کالا ہرن کا خواب دیکھتے ہو.....“ کویتا ہر جت بولی۔

”تم نے آتے ہی اس سے جھگڑا شروع کر دیا۔“ راہنما نے کر بولی۔ ”معلوم نہیں کیوں اس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا ہے.....؟“

”اس لئے کہ تم مجھے دیکھتے ہی بے ہوش نہ ہو جاؤ۔ اس لئے کہ بلیک ٹائیگر کو دیکھ کر اچھے اچھوں کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”ٹائیگر کی کویتا سے بے حد تکلفی تھی۔ کویتا کے برابر جو خالی کرسی تھی اس پر بیٹھنے سے پہلے اس کی عریاں ممر میں کمر میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت کالی ساڑھی اور کالے مختصر سے سیاہ بلاؤز میں تھی جس کی آستینیں تھیں اور گریبان بھی آگے پیچھے سے بے حد کھلا ہوا تھا۔

”ٹائیگر نے اس کا چہرہ اور سراپا نظروں کی گرفت میں لیا تو وہ ایک دم سے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

”تم اس طرح دیکھ رہے ہو جیسے میں اس سال

کی مس درلڈ ہوں۔“

”اگر تمہیں مس ورلڈ منتخب کر لیا گیا تو دنیا کی ساری بوڑھی اور عمر عورتوں میں خوشی کی لہر دوڑ ہو جائے گی کہ ان کی قسمت جاگ گئی ہے جو عورت اسی برس کی ہوگی وہ مس ورلڈ چینی لی جائے گی۔“

”کیا میں اتنی برس کی لگ رہی ہوں.....؟“

”نک کر بولی۔

”اس سے دو تین برس اور زیادہ..... ویسے تمہیں بوڑھی حسینہ کا خطاب مل جائے گا۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”میں جب سو برس کی ہو جاؤں گی تب میں تم سے ہر قیمت پر شادی کر کے رہوں گی۔“

”انگو رکھنے ہیں.....“ ٹائیگر ہنس دیا۔

”کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں بخش دوں گی؟“

”کون جیتا ہے تیرے سفید ریش سر ہونے تک۔“

”میری ریش سفید نہیں ہوئی ہیں بلکہ تمہارا خون سفید ہو گیا ہے۔“ کویتا نے کہا۔ ”میری سیاہ اور لمبی خوب صورت ریشی گھٹائیں..... کیا تمہیں ان میں سفیدی نظر آ رہی ہے..... ایک تار تک چاندی کا نہیں ہے۔“

”یہ کیوں نہیں کہتی ہو خضاب کا کمال ہے.....؟“ ٹائیگر کہنے لگا۔ ”کیا میں نہیں جانتا کہ تمہاری عمر کیا ہے..... تم نا امید نہ ہو..... یہاں ایسے احق بستے اور ملتے ہیں کہ..... بالوں کا دھوکا..... عرق کا دھوکا اور جسامت کا دھوکا کھا کر شادی کر لیں گے۔“

”سرسوتی نے ان کی نوک جھونک کے درمیان ویز کو بلایا اور اسے پیپر ڈوسا کا آرڈر دینے لگی تو ٹائیگر نے کہا۔

”کھوپے کے دودھ کی بگھار والی چٹنی بھی لانا..... میں تین سے کم نہیں کھاؤں گا..... پہلے کے بعد دوسرا..... دوسرے کے بعد تیسرا اگر گرم گرم..... ہر ایک کے ساتھ چٹنی ضرور آئے گی..... اس کا بل مس کویتا کے

کھانے میں جائے گا۔“

”ایسا کرو کہ چٹنی پانچ گھنٹن لا کر دے دیتا۔“

”تم بل کی پروا مت کرو..... دس نہیں دے دے گی کھاؤ کے تو بھی میں میں ادا کر دوں گی..... ایک بات بتا دوں..... بد بھٹی ہو جائے تو ٹکڑم کرنا..... میں اسور سے ہاشمولا کی شیشی منگوا دوں گی۔“

”ہانسی کی گولی کھانے کے بجائے ایک اور سالہ ڈوسا کھاؤں۔“ ٹائیگر بولا۔

”کیٹین کے بچے میں چار عدد اور چھیپیر سالہ ڈوسا تیار کر رہے تھے۔ اس لئے ویز فوراً ہی لے آیا۔

”ہم نے چھری کا ٹنا سنبھالا اور اس کے ساتھ انصاف کرنے لگا۔ سرسوتی نے کہا۔

”ٹائیگر.....! تم نے ممی میں بڑے زبردست ڈرون چیل کئے..... ایک ایک ڈرون حملے کو سننی خیر خبر بنا کر کویتا اپنے اخبار میں چھاپتی رہی ہے..... جس نے یہ صرف صوبہ میسور بلکہ سارے ہندوستان میں دھوم مچا دی ہے..... اور پھر رادھنا ٹیلی ویژن میں ان خبروں کو نام کیا اور لوگوں کو بتایا کہ کس طرح ٹائیگر اتنے بڑے گارڈے انجام دے رہا ہے۔“

”میں اپنی پلیٹی اس لئے پسند نہیں کرتا کہ مجھے شہرت کا شوق ہے نہ اس سے کوئی دلچسپی ہے۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”میں انسانیت کی خدمت کرتا ہوں۔ میرا شوق ہی یہ مشن رہا ہے کہ مجرموں کو کیفر کر داری تک پہنچاؤں..... دولت کی بھی ہوس اور خواہش کبھی نہیں رہی۔ اس لئے کہ دینے والا چھپر بھڑا کر دیتے جا رہا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اتنی دولت لے کر کیا کروں.....

”ایسے میں ضرورت مندوں کو بھٹاؤں اور غریبوں کی دل کوئل کر دے دیتا رہتا ہوں۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی.....؟“ کویتا نے سرخ ہو کر پوچھا۔ ”جب کہ تمہارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔“

”اس لئے کہ ایک سراغ رساں کو شادی کرنا بڑا بگاڑ پڑتا ہے..... اس لئے کہ وہ جہیز بانڈ کی طرح ہے

جس کی زندگی میں لڑکیاں عورتیں ہوا کے جھوکوں کی طرح آتی رہتی ہیں..... گو کہ میں اب تک برکا نہیں ہوں۔ شادی کے بعد بہک جاؤں تو اس کے ساتھ بد ویاتی ہوگی جو میں نہیں چاہتا۔ پارسانی پر دھبا ایک مرتبہ لگ جاتا ہے..... وہ ایک بار پھسل جاتا ہے تو پھسلنا ہی جاتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ سبراشیم نے سر ہلایا۔

”غلاطی کے دلدل سے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔“

”یہ سوال کویتا نے مجھ سے پوچھا ہے کہ تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی.....؟ میں یہی سوال اس سے پوچھنا چاہتا ہوں.....؟ اس کے امیدواروں کی کوئی کمی نہیں ہے..... اس جوڑی سے شادی کی تمنا میں لوگ بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔“

”ابھی میری عمر شادی کی کہاں ہوئی ہے.....“ کویتا شونی سے بولی۔ ”اگر شادی کی خواہش ہوئی تو صرف تم سے کروں گی۔“

”دیری گڈ..... میں انتظار کروں گا۔“ ٹائیگر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے قریب کر لیا۔

”کیا تم یہاں کسی خاص مشن پر آئے ہو.....؟“ سرسوتی نے دریافت کیا۔ ”کیا کسی نے تمہاری خدمات حاصل کرنے کے لئے بھیجا ہے؟“

”نہیں..... میں صرف شکار پر جانے کے لئے آیا ہوں..... کالا ہرن..... بلیٹیں اور مرغابیاں..... پھر تم سب کی یاد بے اختیار کھینچ لاتی ہے..... اس لئے کہ ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصہ ہو گیا۔“

”ایک شکاری نے دوسرے شکاری کو کھانے پر مدعو کر لیا۔“ رنگا سوای بولا۔

”یہ شکاری کہاں سے ہو گئے.....؟ اپنے اخبار کی نیوز ایڈیٹر..... میں ایک سراغ رساں جو درندہ صفت مجرموں اور جنگل کے جانوروں کا شکار کرتا رہتا ہوں..... ہم دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”شریکتی جی..... تم سے زیادہ خطرناک شکاری ہیں..... سیاست دانوں..... مفاد پرستوں..... مافیا اور

منشیات کا شکار کیمیائی رہتی ہیں۔ یہ لوگ جنگل کے درندوں سے کہیں خوفناک ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ ان سے مقابلہ سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔۔۔۔۔ جان کے دشمن ہوتے ہیں اور سر پر موت کی تلوار لٹکتی رہتی ہے۔۔۔۔۔ رنگا سواہی نہ کیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ سرسوتی نے سر ہلایا۔ ”میں نے کبھی اس پہلو پر غور نہیں کیا۔۔۔۔۔ جب کہ کویتا کو وہ ایک مرتبہ جان سے مار دینے کی دھمکیاں مل چکی ہیں۔ لیکن اپنے مشن سے باز نہیں آتی۔۔۔۔۔ اس نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال رکھی ہے۔“

زندگی کا کوئی مقصد تو ہونا چاہیے۔“ کویتا کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”وہی آدمی جیتتا ہے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیتتا ہے۔۔۔۔۔ ٹائیگر کارڈ گارسراخ رسائی ہے جہاں اس کے قدم قدم پر خطرات اور موت منہ کھولے کھڑی رہتی ہے۔۔۔۔۔ صحافت میں جو سچائی ہے ہر برائی کا مقابلہ کرتے ہیں وہ موت سے نہیں ڈرتے ہیں۔۔۔۔۔ میں بھی نہیں ڈرتی۔ ٹائیگر نے مجھ سے دو ایک مرتبہ کہا تھا کہ موت صرف ایک بار آتی ہے اور اس کا دن، لمحہ اور وقت لکھا ہوتا ہے۔ اس لئے میں انسانی درندوں سے بالکل نہیں ڈرتی۔۔۔۔۔ حق کی بات کرتی ہوں۔۔۔۔۔ اس لئے بھی کرنا چاہئے کہ یہ صحافت کا اصول ہے۔“

”تمہارے ان لگاؤ اور شیریں لبوں کو میں خراج پیش کر سکتا۔۔۔۔۔“ کاٹھ۔۔۔۔۔ یہ سنہرے الفاظ۔۔۔۔۔ تنہائی میں۔۔۔۔۔“

”تمہیں کیسے معلوم کہ میرے لب شیریں ہیں۔۔۔۔۔“ وہ بولی۔ ”یہ کڑوے کیلے اور زہریلے بھی ہیں؟“

”تصور میں اور انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔“

”تم بد معاشی سے باز نہیں آؤ گے۔۔۔۔۔“ وہ معذوری غصے سے بولی۔ ”چلو۔۔۔۔۔ وقت پر پہنچ جانا۔۔۔۔۔ کھانے پر نہ میں تمہارا انتظار کروں گی۔۔۔۔۔ اور نہ

کھانا۔۔۔۔۔“

سب نے اپنا اپنا بل ادا کیا۔۔۔۔۔ کویتا اس کا اور اپنا۔۔۔۔۔ سرسوتی کے منع کرنے کے باوجود۔۔۔۔۔ سب اس کے ساتھ پریس کلب سے نکلے۔۔۔۔۔ بازنگ لاٹ کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک کویتا نے اسے زوردار دھکا دے کر گرا دیا۔

ٹائیگر حیران تھا کہ کویتا نے اسے دھکا دے کر کیوں دیا۔۔۔۔۔ وہ اس معصوم کوٹل کر رہی رہا تھا کہ ایک نئی سن سنائی ہوئی اس کے اوپر سے گزر گئی۔۔۔۔۔ اگر اسے کچھ نے دھکا نہ دیا ہوتا تو وہ لقمہ اجل بن چکا ہوتا۔

ٹائیگر نے سنبھل کر دیکھا۔ حملہ آور پارکنگ لاٹ سے ایک گاڑی کی اوٹ میں کھڑا ہوا تھا۔۔۔۔۔ جہاں سے اس نے ٹائیگر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔۔۔۔۔ گوئی پریس کلب کی دیوار سے لگ کر زمین پر گر گئی۔۔۔۔۔ وہ اسے نشانہ بنانے کے لئے نشست باندھ رہا تھا کہ کویتا اس کی سرعت سے لپکی اور ٹائیگر پر گر کر اسے دو حال بنالیا۔ دوسرا فائر بھی اس نے داغ دیا۔ اس کے باوجود کویتا خوف زدہ نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ ٹائیگر نے اسے پست وکیل دیا۔ دوسرا فائر خالی گیا تھا۔۔۔۔۔ پھر وہ کھڑی ہو کر ٹائیگر کو پھر دو حال بنانا چاہتی تھی کہ وہ تیر دھکا کر زمین پر گرتے وقت اس کے منہ سے ایک دل خراش نچی نکلی۔۔۔۔۔ پھر وہ خوف و دہشت سے بے ہوش ہو گئی۔ کویتا سفید ساڑھی اور سفید بلاؤز میں تھی۔ گورا بدن تھا۔۔۔۔۔ گوئی اس کے شانے پر لگی تھی جس سے خون اگل پڑا تھا جس سے نہ صرف اس کا سفید لباس بلکہ اس کا دو دھیا بدن بھی خون سے نہانے لگا۔

ایک نہیں دو بد معاش تھے۔۔۔۔۔ ان کی گاڑی پارکنگ لاٹ پر کھڑی تھی۔۔۔۔۔ وہ یہ سمجھ کہ کویتا موت کی آغوش میں جا چکی ہے۔ انہوں نے ٹائیگر کو دیکھا جو اپنی موت کی پروا کے بغیر ان کی طرف کو غائب کر رہا تھا۔۔۔۔۔ اسے نشانہ بنایا۔ ٹائیگر کی قسمت اچھی تھی۔ ان کے ریوالور کی بال سے شعلہ نہیں نکلا۔ صرف کلب کی آواز گونج کر رہ گئی۔ ان کے ریوالور میں شاید تین ی

ٹالیاں تھیں۔ جب ان بد معاشوں نے ٹائیگر کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ان کی گاڑی جھٹکے سے بڑھی۔ اس کا بچن اشارت ہی تھا۔۔۔۔۔ وہ زنانے سے آگے بڑھی اور میں روڈ پر آ کر مخالف سمت بڑھ گئی۔ چند لمحوں میں غمزدگی سے اوجھل ہو گئی۔

ٹائیگر ایک دم سے رک گیا۔ اگر وہ اپنے ہاتھوں میں سے کسی کی گاڑی لے کر ان بد معاشوں کا توبہ کرنا تو لا حاصل تھا۔ کیوں کہ وہ گاڑی جس تیز رفتاری سے گئی تھی اس نے اب تک کئی میل طے کر لئے ہوں گے۔۔۔۔۔ اس کی گرد پاٹا اور کس سمت کی یہ معلوم کرنا دشوار تھا۔ اس کی رگوں میں نفرت اور غصے سے لہوا ملنے لگا۔ کاٹھ۔۔۔۔۔ اس نے سوچا۔ اس کی جیب میں ریوالور ہوتا تو وہ کویتا کو نشانہ بننے نہیں دیتا۔ ان دونوں کی کمر بڑوں میں سوراخ کر کے خون میں نہلا دیتا۔

یہ لرزہ خیز واقعہ جو دونوں حملہ تھا پٹیم زون میں پیش آیا تھا جس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔۔۔۔۔ پریس کلب کے گیٹ پر مسلح چوکیدار بھی تھا۔ لیکن اس وقت پریس کلب کے احاطے میں کھڑا ایڑی پی رہا تھا۔ جتنی دیر میں وہ بدوق اپنی گیسٹ والی کوٹھری سے نکال کر لے آیا وہ بد معاش فرار ہو چکے تھے۔ سرسوتی نے موبائل فون سے قریبی پولیس اسٹیشن پر رابطہ کیا اور یون آئی تو بد معاشوں کی گاڑی کا نام و نشان تک نہ تھا۔۔۔۔۔ پولیس دین ایک انداز سے ان بد معاشوں کے تعاقب میں روانہ ہوئی۔۔۔۔۔ رنگا سواہی پولیس پر بگڑ گیا تاکہ ان کی گاڑی جو شام کے وقت پریس کلب کے باہر کھڑی ہوئی ہے وہ کیوں موجود نہ تھی۔۔۔۔۔ اس نے صاف صاف سب انسپکٹر سے کہہ دیا تھا کہ۔۔۔۔۔ ”آپ لوگ رشوت چلے اور کسی بے گناہ آدمی کو گرفتار کر کے تھانے لانے کی کوشش نہ کریں۔“

ٹائیگر برقی سرعت سے کویتا کی طرف لپکا۔ وہ تین چار برسوں سے اس کی نہ صرف اس کی تکلیف دہی بلکہ بے حد بے تکلف بھی۔۔۔۔۔ اس کے سراغ دہانی کے کارناموں کی جذباتی حد تک رسائی تھی۔ ان

دونوں میں خوب ہنسی تھی۔۔۔۔۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی سوچ سکتا تھا کہ اس کی جان بچانے کے لئے اپنی زندگی کی پروا نہیں کرے گی۔۔۔۔۔ اسے اپنی زندگی عزیز نہیں ہوتی ہے۔ لیکن یہ کیسا جذبہ تھا۔۔۔۔۔ محبت تھی۔۔۔۔۔ اس قدر ایثار۔۔۔۔۔ وہ کویتا سے شادی کرنے سے اس لئے قاصر تھا کہ ان کے درمیان مذہب کی دیوار تھی، جسے وہ گرا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی ٹائیگر۔۔۔۔۔ وہ دونوں ابھی شادی بھی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس نے ایک لمحے میں یہ سب کچھ سوچ لیا تھا۔۔۔۔۔ کویتا نے اس کی جان بچا کر اسے بن مول خرید لیا تھا۔۔۔۔۔ اس پر ایک ایسا احسان کیا تھا جسے وہ ساری زندگی اتار نہیں سکتا۔۔۔۔۔ اس کی عظیم محنت۔۔۔۔۔ ان درندوں نے کویتا کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔۔۔۔۔ اس بات کا بھی خیال نہیں کہ وہ ایک عورت پر گولی چلا رہے ہیں۔

کویتا کو ڈھکی حالت میں بے ہوش دیکھ کر اندر سے صدمے، غصے اور نفرت سے اس کا دل جیسے پاش پاش ہوا جا رہا تھا۔ وہ کویتا کے پاس دوڑا تو ہو گیا۔ اس نے پہلو تو بغض دیکھی لگا جیسے ذوب رہی ہو۔۔۔۔۔ پھر اس نے سینے پر دل کی جگہ اپنا کان رکھ دیا۔ اسے آسجین کی ضرورت تھی۔ اس نے کویتا کے منہ پر اپنا منہ رکھ دیا۔۔۔۔۔ چند لمحوں کے بعد کویتا کے دل کی دھڑکن میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔۔۔۔۔ بغض خطرے سے نکل آئی تھی۔ خون ابھی بھی زخم سے بہہ رہا تھا۔

فائرنگ سے پریس کلب کے اندر اور باہر ایک بھونچال آ گیا۔ نو فوگرافر تصویریں بنانے لگے۔ لیکن ایک افرائقی اور چیچ و پکاری بچ گئی۔ پریس کلب کے سبزہ زار پر جو لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔۔۔۔۔ سالہ ڈوسا کھا رہے تھے۔ جھگڑتھی کہ قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ بد معاش فائرنگ کر کے فرار ہو گئے ہیں۔ ہر کسی کا خوف و دہشت سے برا حال تھا۔ سب سے زیادہ متاثر لڑکیاں اور عورتیں تھیں۔۔۔۔۔ وہ ایک تو بے ہوش ہو گئی تھیں۔ رادھنا اور سرسوتی ان سے کہہ رہی تھیں کہ اب خطرے کی

کوئی بات نہیں رہی..... لیکن خوف و ہراس نے انہیں حواس باختہ کر دیا تھا۔

رنگا سوامی ٹائنگر کے پاس آیا تو اس کا چہرہ بے لبو ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں نے اسپتال فون کر دیا ہے۔ بس ایسویٹس آنے والی ہے۔“ وہ غمزہ لہجے میں بولا۔ ”آپ کسی کو بھی قریب نہ آنے دیں۔ حالاں کہ ایسویٹس کو اب تک پہنچ جانا چاہئے۔“

سبرانیم بولا۔ ”شام کا وقت ہے..... ٹریک اکثر جام ہو جاتا ہے۔“

ایک پولیس وین جو اس وقت پریس کلب کے باہر آ کر رکھی تھی اس میں سے دو پولیس افسران اترے۔ اس وقت کویتا کے پاس بھیجنے ہونے لگی تھی۔ ان افسروں نے بھیڑ کو ہٹانے اور دور رکھنے کی کوشش کی۔

”اوہ..... یہ کس کویتا ہیں؟“ ایک افسر نے حیرت سے کہا۔ ”ان پر بد معاشوں نے گولیاں چلا دیں۔“

”میں کویتا پر نہیں بلکہ ٹائنگر پر.....“ رنگا سوامی بولا۔

”لیکن..... یہ نشانہ کیسے بن گئیں۔“ دوسرے افسر نے پوچھا۔

”میں کویتا نے ٹائنگر کو بچانے کی کوشش کی تھی..... وہ ڈھال بن گئی تھیں..... لیکن ان قاتلوں کو ایک عورت پر رحم نہیں آیا۔“

اس وقت ایسویٹس سائرن بجاتی ہوئی آتی دکھائی دی۔ ایسویٹس کے اندر ڈاکٹر بھی تھی۔ اس نے فوراً ہی کویتا کو اسٹریچر پر ڈال کر اندر لائے معائنہ کیا۔ اس کے منہ پر آکسیجن ماسک لگا دیا اور ڈرائیور سے کہا۔ ”فورا اسپتال لے چلو۔“

ٹائنگر رنگا سوامی کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسپتال پہنچنے ہی کویتا کو فوراً آپریشن کے لیے جایا گیا۔ کیوں کہ گوئی اس کے شانے میں اتر گئی تھی۔

سبرانیم نے موبائل پر کویتا کے گھر والوں کو اس خونی حادثے کی اطلاع دے دی تھی۔ ڈاکٹروں،

سرجنوں اور نرسوں کی ایک ٹیم کویتا کے اسپتال پہنچنے پہلے ہی موجود تھی..... کویتا پر قاتلانہ حملے کی خبر نہ صرف ریڈیو لیٹن بلکہ ٹی وی لیٹن پر بھی نشر کی گئی تھی۔ صحافیوں کے علاوہ ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے اور عوام میں ہر خاص و عام اسپتال پہنچ گئے تھے..... اس لئے کہ کویتا کوئی عام عورت نہ تھی۔ ایک بڑے معروف اخبار کی نیوز ایڈیٹر تھی۔ بے باک، نڈر اور بے خوف صحافی تھی۔ اس کی بڑی عزت و قدر تھی۔ بڑا رعب و دبدبہ تھا۔ اس کے علاوہ کالم نویس بھی تھی۔ وہ اپنے کالم میں کسی کو بھی نہیں بخشتی..... سیاسی رہنماؤں، سیاسی ہڈتوں اور صاحب اقتدار کی پول کھول کر رکھ دیتی..... بے ضمیر، مفاد پرست اور مافیا بھی اس سے ڈرتی اور اس کی جالی دشمن بھی تھی۔

اس پر جو قاتلانہ حملہ ہوا تھا اس کا یہ تاثر لیا گیا تھا کہ اس کے کسی دشمن نے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی..... لیکن اصل بات کیا تھی کسی کے علم میں نہ تھی۔ لیکن دوسرے دن سروسٹی نے جو دن ہیرالڈ کی ایڈیٹر تھی اس نے اپنے اخبار میں یہ خبر شائع کر دی کہ ممبئی کے مشہور پرائیویٹ سراغ رساں ٹائنگر میسور کے جنگل میں شکار کھیلنے آئے تھے۔ پریس کلب کی چار دیواری سے باہر آتے ہی وہ بد معاشوں نے ٹائنگر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تو کویتا نے ڈھال بن کر اپنے مہمان کو بچایا اور خود موت کی آغوش میں جاتے جاتے فوج لگی۔ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ اس کے شانے میں جو گولی بیوست ہوئی تھی وہ با آسانی نکال لی گئی۔ اس لئے کہ وہ زیادہ اندر نہیں گئی تھی۔

لیکن ٹائنگر دل میں حیران تھا کہ اس پر قاتلانہ حملہ کس نے کیوں اور کس لئے کیا تھا؟ اس کی آمد کی خبر ان جانے دشمن کو کس نے دی..... اس نے اچانک شکار پر جانے کے لئے پروگرام بنایا تھا اور کسی کو بتائے بغیر روانہ ہو گیا تھا۔

ٹائنگر نے جب اس بات کا اظہار سبرانیم سے کیا تو اس نے کہا۔

”تم جس روز بنگور پہنچے اور گاڑی یعنی ٹیکسی میں ایک جوان لڑکوں کے ساتھ اپنے گھر جا رہے تھے۔ تمہاری ٹیکسی کے مخالف سمت کویتا اپنی گاڑی میں اپنے دفتر جا رہی تھی اس نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ لیکن تم نے اسے نہیں دیکھا..... کویتا نے اخبار میں اپنی طرف سے خبر چھاپ دی کہ بلیک ٹائنگر میسور کے جنگل میں شکار کھیلنے پر برس کی طرح اس برس بھی آیا ہوا ہے حکومت کرناٹک کو چاہئے کہ اس کی خدمات حاصل کرے۔ بلیک ٹائنگر..... شیر بنگال سے کہیں خطرناک ہے۔ وہ بنگال کا ٹائنگر ہے۔ ایک پرائیویٹ سراغ رساں رہا ہے۔ اس نے ممبئی میں نہ صرف بڑے بڑے لڑناک مجرموں بلکہ کئی مافیا ز کو کفر کردار تک پہنچایا ہے..... حکومت کرناٹک بہت پریشان ہے کہ اب تک نہ صرف ملکی اور غیر ملکی شکاری بلکہ نو جوان لڑکیاں عورتیں اور مرد جو پراسرار طور پر غائب ہو گئے ان کا پتا نہیں چل سکا۔ یہ لڑکیاں اور عورتیں دو ماہ پیشتر میسور کے جنگل دو تین مردوں کے ساتھ کالا ہرن اور مرغابیوں کے شکار کے لئے گئی تھیں..... ان کی پراسرار گم شدگی ایک معما بن گئی ہے۔ اگر بلیک ٹائنگر کی خدمات حاصل کی جائیں تو یہ معما با آسانی حل ہو سکتا ہے۔ وہ انہیں بازیاب کر کے اور اس گروہ کے سرغنہ کو جس نے انہیں اغوا کیا اور گرد پا ہے اور خیال یہ ہے کہ اس کے گروہ میں وہ قاتل، مجرم اور غنڈے بد معاش ہیں جو مفرد رہیں جن کی حکومت کو بھی تلاش ہے انہیں کفر کردار تک پہنچا کر دم لے گا..... ٹائنگر سراغ رساں نہ صرف زبردست سراغ رساں ہے بلکہ شکاری بھی ہے..... ملایا، آسام اور بنگلہ دیش کے سندور بن کے جنگل میں اس نے خطرناک شکاری، تندر، شیر، ہیر، گینڈوں اور ریچھوں کا بھی شکار کیا ہے۔“

”لیکن ایک بات سمجھ سے بالا تر ہے کہ ایک گروہ نو جوان لڑکوں، مردوں اور نو جوان لڑکیوں عورتوں کے شکاریوں کو بھی کس لئے اغوا کر رہا ہے جو میسور کے جنگل میں موجود ہے..... کیا وہ ان سے دل بہلاتا ہے۔“

لیکن جوان لڑکوں اور مردوں کو کس لئے..... اس نے اب تک جو جوان لڑکیاں عورتیں اغوا کی ہیں اور کر رہا ہے..... کیا وہ عام قسم کی تھیں یا حسین..... یہ معما حل نہیں ہو سکا کہ وہ لڑکیوں، نو جوان لڑکوں، مردوں کو کس لئے اغوا کر رہا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے..... لیکن ہو سکتا ہے کہ انہیں کھلونا بنانے کے لئے..... اب تک جتنی بھی لڑکیاں اور عورتیں اغوا ہوئی ہیں وہ نہایت حسین، نو جوان، جوان سال اور بے حد پرکشش تھیں جیسے تگینے ہوں..... بہر کیف یہ ایک معما اور اسرار ہے۔“

”کیا یہ امکان نہیں ہے کہ وہ ان لڑکیوں عورتوں کو کسی غیر ملک میں لے جا کر فروخت یا غلام کر دیتا ہو..... دہلی..... قطر اور بھی کئی جگہ ایسی ہیں جہاں ہندوستانی حسن کی بڑی مانگ ہے۔“ ٹائنگر نے خیال ظاہر کیا۔

”اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا..... آج کا دور ایسا ہے کہ کون کی بات ناممکن ہے۔“

”کیا گائیڈ کی مدد سے بھی پتا نہیں چلا کہ وہ کون پراسرار شخص ہے؟ کیا تنظیم ہے جو اس قدر منظم ہے۔“ ٹائنگر نے کہا۔

”اب جب کہ میں آیا ہوں تو اس کا سراغ لگا کر رہوں گا۔“ ٹائنگر نے کہا۔

”ٹائنگر.....! تم ذرا ہوشیار، چوکنا اور محتاط رہنا..... میرا خیال ہے کہ اس شخص نے بہت سارے اپنے لوگوں کو خرید کر چھوڑ رکھا ہے۔ وہ تم پر کسی بھی وقت دوبارہ قاتلانہ حملہ بھی کر سکتا ہے۔“ رنگا سوامی بولا۔ ”اس حملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمہارے یہاں آنے سے سخت پریشان ہے..... خوف زدہ ہے..... اس لئے اس نے تمہاری جان لینے کی کوشش کی..... اپنی ناکامی پر بری طرح تمللا رہا ہو گا۔“

”یہ پراسرار نادیہ دشمن جو نہایت ذہین اور خطرناک ہے وہ قانون کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتا..... مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ جب

وہ محتاط و مہربان بن جاتا ہے تو بڑے سے بڑا اور خطرناک بھی بال بیکانیں کر سکتا..... اس نے ہمیشہ میری حفاظت کی ہے..... میں جانے کتنی مرتبہ موت کے منہ میں جا کر آیا ہوں..... اللہ کا کرم تھا کہ میرا بال تک بیکانیں ہوا۔ مجھ پر آج تک نہیں آئی۔ ہمارے مذہب میں موت کا ایک دن معین ہے۔ نہ موت پہلے آ سکتی ہے اور نہ بعد میں..... وہ دس مرتبہ قاتلانہ حملے کیوں نہ کرے اسے کامیابی نصیب نہیں ہوگی۔“

پھر وہ اور رنگ سوای اور سہراٹم کو دیکھنے اپنا ہاتھ پھینچے۔ سب سے پہلے رنگ سوای..... پھر سہراٹم نے باری باری اندر جا کر کویتا کی عیادت کی..... ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق نرس صرف ایک ملاقاتی کو اندر آنے دے رہی تھی۔ کویتا کے گھر والے بھی باہر راہ داری میں رکھی کرسیوں میں بیٹھے تھے۔ ان دونوں کے کویتا کو دیکھ کر آنے تک کویتا کے گھر والوں سے باتیں کرتا رہا کہ کویتا کا یہ احسان ایسا عظیم ہے کہ وہ ساری زندگی بھی اتار نہیں سکتا۔ کویتا کی ماں نے کہا۔

”اگر کویتا نے تمہاری جان بچانے کے لئے اپنی زندگی کی جینٹ بھی دے دی تو تم نہیں ہوتا خوش ہوتی..... میں تمہیں جانتی نہیں سکتی کہ اس کے کارن جو تمہاری زندگی بچ گئی ہم سب سکتے خوش ہوئے اور ہیں..... کیا ہم تمہارا وہ احسان بھول سکتے ہیں جو تم نے کویتا کو بچانے کے لئے اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالا تھا۔“

”میں نے کب کویتا کی خاطر جان کا خطرہ بھل لیا تھا.....؟“ ٹائیگر نے کہا۔ اس وقت اسے پاؤں نہیں آیا۔ ”جب تم پہلی مرتبہ تین برس پہلے بنگلہ آور آئے تھے اس وقت ایک سیاسی جڑت نے پانچ اجرتی بدمعاشوں کی خدمات حاصل کی تھیں کہ کویتا کو اغوا کر کے نہ صرف اس کے ساتھ اجتماعی زیادتی کر کے فلم بنا کر بازار میں پھیلا دیتا..... اس لئے کہ کویتا نے اس کے اور اس کی بہن کے خلاف اخبار میں لکھا تھا۔ دونوں کا کرپشن ظاہر کیا تھا جس سے وہ دوبارہ ایکشن جیت نہ

سکے تھے۔ کویتا جب لیکن پارک کے رستورنٹ سے مل کر پارکنگ پر آئی تھی پانچ مسلح بدمعاشوں نے اسے زرنے میں لے کر حکم دیا تھا کہ وہ خاموشی سے سائے کھڑی کالی دین میں سوار ہو جائے..... اتفاق سے ہم وہاں سے گزرے تو کویتا نے ہمیں ہمدردی سے دیکھا تھا..... کویتا حصار توڑ کر تمہاری طرف لپکی..... ان پانچوں بدمعاشوں کے پاس چاقو اور پستول تھے۔ انہوں نے چاقو والے بدمعاش کو جو ہمیں چاقو گھونپنے اور راستے سے ہٹ کر جانے کی دھمکی دیتا ہوا بڑھا تو ہم نے فضا میں اچھل کر چاقو والے ہاتھ پر ایک کلک لگائی تو اسے لٹو کی طرح گھوم کر پستول والے بدمعاش پر جا کر اسے بدمعاش کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر گر کر آ تو تم نے سرعت سے اٹھایا۔ دوسرے چاقو والے بدمعاش نے تمہارے بازو میں چاقو گھونپ دیا تو تم نے اس کی پیٹ میں لات ماری تو وہ اس کے ضرب کی تاب نہ لا کر لڑکھڑایا۔ زمین پر گر کر خاک چاٹنے لگا۔ دوسرے پستول والے بدمعاش نے ہمیں گولی چلانے کی ہمت نہیں دی اور اس نے فائر جھونک دیا۔ گولی تمہارے شانے کو زخمی کرتی نکل گئی۔ پھر تم نے ان بدمعاشوں پر گولیاں برسانا شروع کیں تو وہ چاروں اپنی دین کی طرف لپکے۔ چاقو والے زخمی کو چھوڑ کر فرار ہونے لگے۔ تم نے فائرنگ کر کے گاڑی کا شیشہ نشتر کر دیا۔ وہ چاروں گاڑی میں سے نکل کر مختلف سمتوں میں بدعنوانی اور دہشت زدہ ہو کر بھاگ نکلے..... فائرنگ کی آواز سن کر پولیس کی موبائل آ گئی۔ اس زخمی بدمعاش کو گرفتار کر کے لے گئی۔ اس نے بتایا کہ یہ کسی کی ایما پر ان بدمعاشوں نے کویتا کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ تم اسپتال میں تین دن زیر علاج رہے۔ کیا تمہارے اس احسان کا بدل کویتا کا احسان ہے..... نہیں کویتا کا احسان کوئی حیثیت نہیں رکھتا.....“

”وہ آہنٹی.....!“ ٹائیگر نے ہنس کر کہا۔ ”مجھے تو یاد بھی نہیں..... آپ نے اس معمول سے واقعہ کا ذکر کر کے شرمندہ کر دیا..... یہ خوشی کی بات ہے کہ کویتا

خبر سے بہا رہے۔ اسے سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹروں کی تاکید ہے کہ چوبیس گھنٹے تک اسے ملاقاتی نہیں لیں تو اچھا ہوگا۔“

جب ٹائیگر کویتا کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ بوش میں تھی۔ چہرے سے ظاہر تھا کہ اس کی طبیعت کافی مستحیل ہو چکی ہے۔ اسے خون دیا جا رہا تھا اور ذرپ بھی لگی ہوئی تھی۔ ٹائیگر نے محسوس کر لیا تھا کہ اس پر نقامت جاری ہے۔ اس لئے کہ خون خاصا بہہ چکا تھا۔ ٹائیگر کو دیکھ کر اس کے زرد چہرے پر دل کش مسکراہٹ کی سرخی دوڑ گئی۔

”آپ ٹائیگر ہیں۔ شیر بنگال.....“ نرس بولی۔ ”انہیں ہوش آتے ہی پہلے آپ کی نگر ہوگی۔ جب سے اب تک کوئی بیسوں مرتبہ آپ کے بارے میں پوچھ چکی اور مسلسل پوچھتے جا رہی ہیں..... میں نے بتایا کہ وہ خیریت سے ہیں۔ ان پر آج نہیں آئی..... لیکن شرمیتی کو یقین نہیں آیا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر خیریت سے ہیں تو مجھے دیکھنے کیوں نہیں آئے..... میں نے کہا کہ ڈاکٹروں نے ملاقاتوں میں کہا کہ آپ کے گھر والوں کو بھی مطلع کیا ہوا ہے۔ لیکن انہیں میری بات کا یقین نہیں آیا ہے..... کہا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں..... وہ بھی شاید اسی اسپتال میں زیر علاج ہیں..... شکر ہے آپ آ گئے۔“ وہ کہہ کر ہنس دی۔

”وہ اس لئے بار بار پوچھ رہی تھیں کہ اس بدمعاش نے مجھے نشانہ بنادیا ہوگا..... میں زندہ نہ بچ سکا ہوں گا۔“

”میں توہی دیر میں ڈاکٹر سے مل کر اور ہدایات لے کر آتی ہوں۔“ نرس بولی۔ ”آپ انہیں زیادہ بولنے مت دیں۔“

”ٹائیگر نے بستر کے پاس جا کر اس کا نرم دناؤک خوب صورت اور سڈول ہاتھ اپنے ہاتھ میں تمام لیا۔

”کویتا.....! تم نے میری جان بچانے کے لئے اپنی جان کی پروا نہیں کی.....؟ مجھے بن مول خرید لیا۔“ ٹائیگر اس کا ہاتھ چوم کر بولا۔

”مجھے تمہیں اپنے سامنے زندہ سلامت پا کر کتنی خوشی ہو رہی ہے کاش.....! میں الفاظ میں بیان کر سکتی۔“

”تم صحافی ہو..... تمہارے پاس الفاظ کی کیا کمی ہے.....“ ٹائیگر نے خوش دلی سے کہا۔

”میری آنکھوں کی زبان کیا کہہ رہی ہے تمہیں اندازہ نہیں ہو رہا ہے.....؟“ وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

”تم نے جب مجھے غنڈوں کے ہاتھوں اغوا ہونے سے بچایا اس دن سے تم میرے من کے خانے میں بسے ہوئے..... میں اس دن سے تمہاری.....“

”ٹائیگر اس کے چہرے پر جھک گیا تو اس کا جملہ ناکمل رہ گیا۔ اس کے ہونٹ دیر تک پوسٹ رہے اور بھی رہے..... باہر آہٹ سن کر ٹائیگر نے اپنا چہرہ اوپر اٹھالیا۔

”یہ کیا حرکت تھی.....؟“ کویتا نے حیا آلودہ ہو کر کہا۔

”تمہارے شرمیتی ہونٹوں کی شیرینی.....“ نرس نے دروازہ کھولا تو وہ خاموش ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ٹائیگر اپنے گھر میں اپنے بستر پر دراز اس نادیہ دشمن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آج دوسرا دن تھا۔ وہ اسپتال میں کویتا کے پاس بیٹھ کر بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ ابھی اس کی کمزوری پوری طرح دور نہیں ہوئی تھی۔ زخم منڈل ہونے میں بھی دو تین دن لگ سکتے تھے..... رنگا سوای اور سہراٹم بھی تھے۔ ان تینوں نے رات کا کھانا ایک ہوٹل میں کھایا۔ جب وہ گھر جا رہا تھا اس نے ایک مشکوک شخص کو تعاقب کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب اس نے رنگا سوای کو بتایا۔ رنگا سوای اپنی گاڑی میں اسے چھوڑنے جا رہا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ رنگا سوای نے اسے اپنے ہاں رکنے کے لئے کہا لیکن وہ نہ مانا۔ اس نے کہا کہ وہ اس تعاقب کرنے والے بدمعاش کی خبر لے کر گھر چلا جائے گا..... پھر وہ رنگا

سواہی کے مکان کے عقبی حصے سے نکلا۔ پھر گھوم کر آیا تو اس نے اس شخص کو رنگا سواہی کے مکان کے سامنے کھڑے سرگیت پتے دیکھا۔ جس مکان کے سامنے وہ کھڑا ہوا تھا۔ وہ زیر تعمیر تھا۔ اس میں سے گھپ اندھیرا جھانک رہا تھا۔ گلی میں نیم اندھیرا تھا۔ وہ قد آدرا تھا۔ جب وہ لمبا سا کس لیتا تو اندھیرے میں اس کی تضحی سی روشنی میں اس کا چہرہ کچھ دکھائی دیتا۔ جب اس نے دوسرا سرگیت نکال کر دیا سلائی دکھائی تو ساعت بھر کے لئے اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔ وہ کوئی پیشہ ور قاتل لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر انداز کی اور آنکھوں سے وحشتانہ پن جھانک رہا تھا۔ وہ اس زیر تعمیر مکان کے احاطے میں کھڑا اس کے رنگا سواہی کے مکان سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ گلی ویران اور سنسان بڑی تھی۔ چوں کہ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اس لئے کوئی آمد و رفت بھی نہیں تھی۔ ٹائیگر گھوم کر اس کی طرف بڑھا تو اس کے ہاتھ میں کرکٹ کی گیند کے سائز کا ایک پتھر تھا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو بد معاش نے اس کی طرف دیکھا۔ ٹائیگر نے چشم زدن میں پتھر اس کی پیشانی پر دے مارا۔ دوسرے لمحے وہ چکرا تا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

اس کی جیب میں ایک ریوالور..... اور پرس تھا اس کے اوپر کی جیب میں کچھ نوٹ تھے۔ پتھر ٹھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھر میں موجود تھا۔

ٹائیگر نے اسی پتھر سے اس کے سر پر ایک اور ضرب لگائی تھی کہ اس کی چوٹ و ماغ کے اندر تک اثر کر جائے تاکہ اس کا ذہن مفلوج ہو کر رہ جائے۔ دو دن تک ہوش میں آنے کے قابل نہ رہے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوئی اجرتی قاتل ہے۔ اس پر رحم نہیں آیا تھا..... پہلے تو اس نے ریوالور چیک کیا۔ اس کی نال پر سائی لیسنر نصب تھا..... اس کے جیب میں چھ گولیاں بھری ہوئی تھیں..... پھر پرس کھول کر دیکھا جو بہت پھولا ہوا تھا۔ اس میں چھوٹے بڑے نوٹ تھے۔ اس کے علاوہ پونڈ کرنسی بھی تھی۔ اس نے ہندوستانی کرنسی گئی جو تین ہزار تین سو اکیس روپے تھے..... سو سو پونڈ کے

چالیس نوٹ تھے جس سے اس نے قیاس کیا کہ کرکٹ انگریز سیاح سے اس بد معاش نے گمن پوائنٹ پر جیتا ہے۔ پرس میں جو ہندوستانی کرنسی تھی اس سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے کسی دکان یا گھر میں ڈکیتی کی وادرات و سر راہ ریزی بھی کی..... اس کے کاغذات سے پتا چلا کہ اس کا نام مہی پال ہے..... اس پرس میں ٹائیگر کی ایک تصویر تھی۔ ایک خط تھا جس میں تحریر تھا۔

”مہی پال!

میں میں ہزار کی رقم اور ایک انگریز سیاح جو میرے ہاں پر غائب ہے اس کی رقم جو تین پونڈ کی ہے وہ سو سو کے چالیس نوٹ ہیں میں تمہیں بھیج رہا ہوں۔ ساتھ میں ٹائیگر کی تصویر بھی۔

ٹائیگر کون ہے میں تمہیں بتا دوں..... بنگال کا شیر کہلاتا ہے اور ممبئی میں پرائیویٹ سرائی رساں کا دفتر کھولے بیٹھا ہے۔ یہ بہت ہی خطرناک، غدار اور بہادر شخص ہے۔ اس نے بنگال اور ممبئی میں بڑے بڑے خطرناک مجرموں اور سابقہ کا صفایا کر دیا ہے۔ وہ ہر برس بنگلور آتا ہے تاکہ شکار اپنے دوستوں کے ساتھ کیلے۔ اس بار بھی آیا ہے۔ لیکن اس مرتبہ کرناٹک صوبہ کا گورنر اس کی خدمات حاصل کرنے والا ہے تاکہ مجھے ختم کر دے۔ اس دنیا میں وہ واحد ایسا شخص ہے جو مجھے ختم کر سکتا ہے۔ ابھی ایسا کوئی مانی کا لال پیدا ہوا ہے نا ہوگا۔ لیکن یہ بلیک ٹائیگر ایسا مانی کا لال ہے جو مجھے موت سے ہمتا کر سکتا ہے۔ اس کے کارنامے میں اخبارات میں پڑھ چکا ہوں اور سن بھی چکا ہوں۔ اسے ہر قیمت پر موت کی نیند سلا نا ہے۔ تمہاری صوبہ کرناٹک میں بڑی دھماک ہے۔ تم سے نہ صرف بڑے بڑے خطرناک بد معاش کا پتہ ہیں بلکہ پولیس بھی..... میں تمہیں یہ رقم پیشگی ارسال کر رہا ہوں۔ میں تمہارے کارناموں سے واقف ہوں۔ تم اب تک تین آدمیوں کو قتل کر چکے ہو..... سولہ لڑکیوں عورتوں کی

آہروریزی..... اس کے بارہ عدد ڈکیتی اور ہروہی کی وارداتیں اسی طرح تمہارے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔

میں نے بنگلور کے دو خطرناک بد معاش چندر اور رمیش کی خدمات حاصل کیں۔ انہیں میں میں ہزار روپے بھی دیئے کہ ٹائیگر کو قتل کر دیں۔ لیکن درسیان میں وہ لوگ تھی کو بتا دی آگئی۔ وہ ڈھال بن گئی۔ میں نے ان حرام زادوں سے کہا تھا کہ درسیان میں عورت، بچہ اور بوڑھا ہی کیوں نہ آئے اسے اڑا دو۔ لیکن وہ ٹائیگر کا پال تک بیکا نہ کر سکے۔ لیکن تم ایسا نہ کرنا۔ ٹائیگر کو قتل کرنے کی صورت میں تمہیں دو لاکھ روپے انعام دیں گا۔

نیچے نام نہیں لکھا ہوا تھا۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد ٹائیگر کو اس بات سے خوشی ہوئی تھی کہ اس نے جس بد معاش مہی پال کا حشر نشر کیا اس کی یہی سزا تھی۔ یوں بھی اس نے اس بد معاش کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ ہوش میں آئے۔ ہوش میں آئے ابھی گیا تو وہ کسی قاتل نہیں رہے گا۔ اس خط سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ شیطان اس سے بہت زیادہ خوفزدہ ہے۔

ٹائیگر کو سوچتے سوچتے کہ اس شیطان کے علاقے کا کیسے پتا چلائے اچانک اسے روندا کا خیال آیا بوئیسور جنگل میں گائیڈ تھا۔

ٹائیگر کو اس کا خیال آتے ہی اس نے روندا کے ہاں جانے اور اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ اتفاق سے آج ٹولر کا دن تھا۔ وہ دن اچوں کے شش برس سے گائیڈ تھا اس کی معلومات اور تجربہ جتنا تھا کسی اور کو شاید ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے مچ روندا کے ہاں جانے سے سووا سلف اور پل خریدے اور گھر جا پہنچا۔

جب اس نے گھر کے دروازے پر دستک دی تو دروازہ نہیں کھلا..... البتہ اس نے گھر کے اندر کسر پھسر کی آواز سنی..... اس نے وقفے وقفے سے دو مرتبہ دستک دی..... اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دروازہ کھلنے میں دیر کیوں ہو رہی ہے؟

پھر اس نے چند لمحوں کے بعد دروازے پر دستک دیتے ہوئے آواز دی۔ ”روندا بچا..... میں ہوں۔ دسیم احمد.....“

چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا تو اس کی بیوی ساوہتا کا چہرہ نمودار ہوا..... ساوہتا بھی بڑی خوب صورت تھی۔ وہ اپنی بیٹیوں کی ہاں نہیں بڑی، بہن دکھائی دیتی تھی..... اس کی عمر چالیس برس کی تھی۔ لیکن چہرے سے مناسب بدن کی وجہ سے اس پر کسی دو شیزہ کا دھوکا ہوتا تھا۔ چہرے پر بڑی تازگی اور شادابی بھی تھی۔

لیکن اب اس وقت وہ اپنی عمر سے دس بارہ برس بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بڑی با حوصلہ عورت تھی۔ حالات کا پاروی سے مقابلہ کر رہی تھی۔ وہ اور اس کی تینوں لڑکیاں گھر پر سلائی کڑائی کا کام کرتی تھیں تاکہ لڑکیوں کی شادی بیاہ کے لئے جیزی جمع ہو..... ساوہتا کسی مر جھائے ہوئے پھول کی طرح لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سرتھی تھی۔ نہ شادابی..... وہ رخصت ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں ویران تھیں اور کناریوں میں آنسو بھرے بھرے تھے۔ وہ اسے دشت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑے زور سے چوکی اور حیرت زدہ لہجے میں بولی۔

”دسیم بھیا!..... آپ.....“ اس کی زبان حیرت اور خوشی سے لڑکھرائی۔ اس کا چہرہ دکھ اٹھا۔

”جی جی جی.....!“ ٹائیگر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کیا بات ہے.....؟ آپ لوگ اس قدر ہراساں، پریشان اور خوف زدہ کیوں ہیں کہ تین چار دروازے پر دستک دینے کے باوجود دروازہ نہیں کھلا..... کیا غنڈے بد معاش آپ کی لڑکیوں کو اٹھانے کے لئے گھر میں گھسنے والے تو نہیں تھے.....؟“

”نہیں..... نہیں.....“ ساوہتا نے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ ”اندر آئیں تو میں آپ کو بتاتی ہوں۔“

جب وہ اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ لڑکا دو رتیوں لڑکیاں ایک طرف سہی کھڑی ہوئی ہیں۔ ان

کے چہرے بے لہو ہو رہے تھے۔ آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے اسے دیکھا ان کی جیسے جان میں جان آئی۔

”انگل.....! سب سے بڑی لڑکی بولی۔“ اس وقت آپ نے یہاں آ کر بڑی کرپاکی..... میں بتائیں سکتی کہ آپ کے آنے سے ہمیں ایک نئی شہتی اور زندگی ملی ہے۔“ اس کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ دوسری لڑکیاں بھی جذباتی ہو گئیں۔

ٹائیگر نے سادھنا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”کیا بات ہے۔ مجھے بتائیں چاچی! رونا چچا کہاں ہیں؟“

وہ قریب آ کر اس کے کانوں میں سرگوشی سے آہستگی سے بولی۔ ”وہ اندر ہیں..... ان کی جان کو خطرہ ہے۔“

”کس سے.....؟“ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

”شیطان سے.....“

”شیطان سے.....؟ میں سمجھا نہیں..... شیطان کون ہے! کہاں ہے.....؟“

”تمہارے چاچا ہی تمہیں بتائیں گے کہ شیطان کون ہے.....“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا تو اس کی آواز طلق میں پھنس رہی تھی۔ ”دہواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“

”گھبرانے اور خوف زدہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں.....“ ٹائیگر نے جیب سے ریوا اور نکال لیا۔ ”شیطان آئے یا اس کا باپ..... میں اسے بھون دوں گا۔“ آپ لوگوں پر آنکھیں آئے گی۔“

”مٹھی لڑکی دوڑ کر اس کے سینے سے آگئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو ٹائیگر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”میری چھوٹی بہن..... اور روتی کیوں ہو؟ میں نے کہا نا کہ وہ تم میں سے کسی کا بال تک بیک نہیں کر سکتا۔ تمہارے پتا جی کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ تم

سب کی رکھشا بھگوان کرے گا۔“ ٹائیگر نے دلاسا دیا۔ پھر اس نے سودا سلف اور پھل کے تھیلے سادھنا کی طرف بڑھایا۔

”آپ لوگوں کے فقی چہروں سے ایسا لگ رہا ہے کہ کئی دنوں سے کھانا پینا چھوٹ چکا ہے۔ بھوک پیاس مر گئی ہے..... چولہا ٹھنڈا رہنے لگا ہے۔ اب آپ غم، فکر اور خوف بالکل چھوڑ دیں..... اب آپ بے سہارا اور لاوارث نہیں رہے..... آپ لوگ جلدی سے پہلے تو ناشتہ اور چائے بنا سیں۔ میں دو دو، اٹھنے۔ ڈبل روٹی، چائے پتی، چھنی اور ضرورت کی چیزیں لایا ہوں۔ تیل اور گھی بھی ہے..... چاول اور آٹا بھی..... پھل بھی..... کسی چیز کی ضرورت اور کمی رہ گئی ہے تو وہ منگوالیں.....“ اس نے بٹوے میں سے سوسو کے دل نوٹ نکال کر سادھنا کی طرف بڑھائے۔

سادھنا نے اس کے ہاتھ سے رقم نہیں لی۔ وہ جذباتی ہو کر منہ پر ہلو رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ لڑکیاں بھی ماں کو دکھ کر رونے لگی تھیں۔ اس نے بڑی لڑکی رتنی کے پاس جا کر اس کے ہاتھ میں نوٹ دینے۔

”رتنی! بہن..... تمہاری ماں بہت زیادہ خوف زدہ اور پریشان ہے..... لہذا تم نا بشتا تیار کرو اور کھانا بھی..... ہم سب ایک ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کریں گے۔ دوپہر کا کھانا بھی..... میں اس وقت تک یہاں موجود رہوں گا۔ جب تک اطمینان و سکون نہیں ہو جاتا۔“

پس تمہارے پتا جی سے ملنے اندر جا رہا ہوں۔“ وہ اپنی بات کا رد عمل دیکھنے کے لئے نہیں رکھا۔ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا۔ رونا چارپائی پر خوف زدہ حالت میں لیٹا ہوا اس کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ قدرے پرسکون اور اطمینان بخش سا نظر آیا۔ اس کے پیچھے سادھنا آ کر بولی۔

”ناشتہ میں دیر ہے..... میں پہلے چائے بنا لاتی ہوں۔“

رودنا اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں رکھی کرسی سادھنا

بارپائی کے پاس رکھ کر چلی گئی۔ ٹائیگر نے اسے ہاتھ اندہ نظروں سے دیکھا۔ وہ صرف گائیڈ ہی نہیں ایک طرح سے شکاری بھی تھا۔ دراز قند..... مضبوط کرسی جسم کا مالک..... وجہ یہ بھی..... ایک شیر کی مانند.....

صرف ایک ڈیڑھ برس کے عرصے میں ایک بوڑھے شیر کی طرح لگ رہا تھا۔ ڈھلک گیا تھا۔ وہ ٹائیگر کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں چنے اور آنکھوں سے لگنے لگا اور بولا۔

”بیٹا! تم اتنا رین کر آئے ہو..... مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں کوئی پینا دکھ رہا ہوں..... میری زندگی نہ صرف خطرے میں ہے بلکہ میری جتنی اور تینوں لڑکیاں اور لڑکے بھی.....“

”کس سے.....؟“ ٹائیگر نے حیرت سے پوچھا۔

”چاچی کس شیطان کے بارے میں کہہ رہی تھیں..... وہ شیطان کون ہے.....؟“

”یہ وہی شیطان ہے..... درندہ مفت..... جس کی زندگی اور شہی انسانی انسانیت کے لئے بدترین داغ بن چکی ہے..... نہ صرف حسین و جمیل لڑکیاں عورتیں..... نوجوان لڑکے مرد..... ملکی غیر ملکی سیاح مرد اور عورتیں اغوا کر کے بریغمال بنائے جا رہی ہیں..... میں اس شیطان کی قید میں دو ماہ رہا ہوں..... میں ایک ہفتہ قتل اس کی قید سے فرار ہوا ہوں۔ میرے تعاقب میں اس کے غنڈے بد معاش اور خون خوار کتے بھی لگے ہوئے تھے..... اپنی جان بچاتا کہ نہ کسی طرح یہاں پہنچے میں کامیاب ہوا ہوں..... رات کے دو بجے پہنچا ہوں..... اس نے میری رہائی کے لئے ایک شرط رکھی تھی میں لڑکیوں کو اس کے حوالے کر دوں..... ورنہ میرے آدمی انہیں اغوا کر کے لے آئیں گے..... دنیا کی کوئی طاقت انہیں بچا نہیں سکتی.....

رودنا نے سانس لینے کے لئے توقف کیا۔ سادھنا چائے اور بسکٹ لاکر رکھ گئی۔ جب وہ چلی گئی تو ٹائیگر نے پوچھا۔

”یہ جنگل میں کہاں رہتا ہے..... اس کی سکونت

کا آج تک پتا نہیں چل سکا کوئی کھوج نہیں لگا سکا۔“

”مجھے بھی اس کا علم بالکل نہ تھا۔ حالاں کہ میں تیس برس سے اس جنگل میں گائیڈ ہوں اور اس کے چپے سے واقف ہوں..... لیکن یہ جنگل سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا نہ صرف گنجان بلکہ تاریک اور چاروں سمتوں تک ہے..... اتفاق سے مجھے بھی اس جزیرے پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا جو جنوب کی مغربی سمت واقع ہے۔ وہ جزیرہ گھنے درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کا علم مجھے اس وقت ہوا جب مجھے قید کر کے لے جایا گیا.....

اس جزیرے کا علم شاید ہی کسی کو ہو..... ایک بہت بڑی حویلی اور ایک شان دار اور وسیع و عریض کوشی بھی ہے..... مجھے جس حصے میں قید کیا ہوا تھا وہاں سے اس لئے نکل کر فرار نہیں ہو سکا تھا کہ خون خوار شکاری کتے دن رات چہرہ دیتے ہیں..... صرف وہی آمد و رفت کر سکتا ہے جن کے پاس شیطان کا دیا ہوا ایک چری نشان ہو..... اس سے ایک ایسی خوشبو پھوٹی ہے اور وہ نشان دن رات میں ایسا چمکتا ہے کہ کتے دیکھ کر ڈرنا تک بھول جاتے ہیں۔ اس کی روک ٹوک نہیں کرتے ہیں۔ وہ کہیں بھی آ جا سکتا ہے..... یہ خون خوار کتے جو جسامت میں گینڈے نما ہیں تربیت یافتہ ہیں۔

اس حویلی میں ایک جدید ترین فلم اسٹوڈیو بنا ہوا ہے۔ ایک کمرے میں میں نے سو سے زائد طاقت ور اور جدید ترین قسم کے جزیرہ دیکھے..... وہاں کسی کو بھی سگریٹ پینے اور دیا سلائی اور لائٹر رکھنے کی اجازت نہیں..... اس کے آدمی جو تمباکو نوشی کے عادی ہیں وہ ایک مخصوص کمرے میں آ کر کر سکتے ہیں..... اس کے علاوہ نہ صرف خفیہ کمرے بھی نصب ہیں اور ٹی وی سیٹ بھی آتی ہیں۔ وہاں میری عمر کے دو آدمی تھے جنہیں رنگا پٹم سے اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ ہم تینوں کا کام اسٹوڈیو میں صفائی اور لائٹنگ درست کرنا ہوتا تھا..... تقریباً روز ہی منوعہ فلم کی شوٹنگ ہوتی تھی..... تیرہ چودہ اور سولہ برس کی لڑکیاں اور جو اس سال عورتیں بھی ان فلموں کا کردار

دارپائی کے پاس رکھ کر چلی گئی۔ ٹائیگر نے اسے ہاتھ اندہ نظروں سے دیکھا۔ وہ صرف گائیڈ ہی نہیں ایک طرح سے شکاری بھی تھا۔ دراز قند..... مضبوط کرسی جسم کا مالک..... وجہ یہ بھی..... ایک شیر کی مانند.....

صرف ایک ڈیڑھ برس کے عرصے میں ایک بوڑھے شیر کی طرح لگ رہا تھا۔ ڈھلک گیا تھا۔ وہ ٹائیگر کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں چنے اور آنکھوں سے لگنے لگا اور بولا۔

”بیٹا! تم اتنا رین کر آئے ہو..... مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں کوئی پینا دکھ رہا ہوں..... میری زندگی نہ صرف خطرے میں ہے بلکہ میری جتنی اور تینوں لڑکیاں اور لڑکے بھی.....“

”کس سے.....؟“ ٹائیگر نے حیرت سے پوچھا۔

”چاچی کس شیطان کے بارے میں کہہ رہی تھیں..... وہ شیطان کون ہے.....؟“

”یہ وہی شیطان ہے..... درندہ مفت..... جس کی زندگی اور شہی انسانی انسانیت کے لئے بدترین داغ بن چکی ہے..... نہ صرف حسین و جمیل لڑکیاں عورتیں..... نوجوان لڑکے مرد..... ملکی غیر ملکی سیاح مرد اور عورتیں اغوا کر کے بریغمال بنائے جا رہی ہیں..... میں اس شیطان کی قید میں دو ماہ رہا ہوں..... میں ایک ہفتہ قتل اس کی قید سے فرار ہوا ہوں۔ میرے تعاقب میں اس کے غنڈے بد معاش اور خون خوار کتے بھی لگے ہوئے تھے..... اپنی جان بچاتا کہ نہ کسی طرح یہاں پہنچے میں کامیاب ہوا ہوں..... رات کے دو بجے پہنچا ہوں..... اس نے میری رہائی کے لئے ایک شرط رکھی تھی میں لڑکیوں کو اس کے حوالے کر دوں..... ورنہ میرے آدمی انہیں اغوا کر کے لے آئیں گے..... دنیا کی کوئی طاقت انہیں بچا نہیں سکتی.....

رودنا نے سانس لینے کے لئے توقف کیا۔ سادھنا چائے اور بسکٹ لاکر رکھ گئی۔ جب وہ چلی گئی تو ٹائیگر نے پوچھا۔

”یہ جنگل میں کہاں رہتا ہے..... اس کی سکونت

کا آج تک پتا نہیں چل سکا کوئی کھوج نہیں لگا سکا۔“

”مجھے بھی اس کا علم بالکل نہ تھا۔ حالاں کہ میں تیس برس سے اس جنگل میں گائیڈ ہوں اور اس کے چپے سے واقف ہوں..... لیکن یہ جنگل سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا نہ صرف گنجان بلکہ تاریک اور چاروں سمتوں تک ہے..... اتفاق سے مجھے بھی اس جزیرے پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا جو جنوب کی مغربی سمت واقع ہے۔ وہ جزیرہ گھنے درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کا علم مجھے اس وقت ہوا جب مجھے قید کر کے لے جایا گیا.....

اس جزیرے کا علم شاید ہی کسی کو ہو..... ایک بہت بڑی حویلی اور ایک شان دار اور وسیع و عریض کوشی بھی ہے..... مجھے جس حصے میں قید کیا ہوا تھا وہاں سے اس لئے نکل کر فرار نہیں ہو سکا تھا کہ خون خوار شکاری کتے دن رات چہرہ دیتے ہیں..... صرف وہی آمد و رفت کر سکتا ہے جن کے پاس شیطان کا دیا ہوا ایک چری نشان ہو..... اس سے ایک ایسی خوشبو پھوٹی ہے اور وہ نشان دن رات میں ایسا چمکتا ہے کہ کتے دیکھ کر ڈرنا تک بھول جاتے ہیں۔ اس کی روک ٹوک نہیں کرتے ہیں۔ وہ کہیں بھی آ جا سکتا ہے..... یہ خون خوار کتے جو جسامت میں گینڈے نما ہیں تربیت یافتہ ہیں۔

اس حویلی میں ایک جدید ترین فلم اسٹوڈیو بنا ہوا ہے۔ ایک کمرے میں میں نے سو سے زائد طاقت ور اور جدید ترین قسم کے جزیرہ دیکھے..... وہاں کسی کو بھی سگریٹ پینے اور دیا سلائی اور لائٹر رکھنے کی اجازت نہیں..... اس کے آدمی جو تمباکو نوشی کے عادی ہیں وہ ایک مخصوص کمرے میں آ کر کر سکتے ہیں..... اس کے علاوہ نہ صرف خفیہ کمرے بھی نصب ہیں اور ٹی وی سیٹ بھی آتی ہیں۔ وہاں میری عمر کے دو آدمی تھے جنہیں رنگا پٹم سے اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ ہم تینوں کا کام اسٹوڈیو میں صفائی اور لائٹنگ درست کرنا ہوتا تھا..... تقریباً روز ہی منوعہ فلم کی شوٹنگ ہوتی تھی..... تیرہ چودہ اور سولہ برس کی لڑکیاں اور جو اس سال عورتیں بھی ان فلموں کا کردار

جتی تھیں..... کم سن اور نوخیز عمر کی معصوم لڑکیاں جب ہدایت کار کی بات نہیں مانتی تھیں جبر و زیادتی سے عکس بندی کی جاتی تھیں..... وہ شیطان بھی شوٹنگ پر موجود ہوتا تھا..... ان فلموں کے مرد کردار حیوانوں کی طرح تھے جنہیں دیکھ کر لڑکیاں کانپ جاتی تھیں..... ان کے لئے فرار کی راہ نہیں ہوتی تھی۔

ایک اور بات جو میرے علم میں آئی تھی وہ یہ کہ میسور کے جتنے بھی اسپتال تھے..... سرکاری بھی..... لاوارث مردوں کو مردہ خانوں سے لایا جاتا تھا..... جو سڑکوں پر حادثے کی نذر ہو کر موت کے منہ میں چلے جاتے تھے وہ پراسرار طور پر عائب ہو کر یہاں پہنچ جاتے تھے..... اس کے علاوہ جو بارش، طوفان اور سیلاب سے مرنے والوں کو بھی.....

اس نے حویلی کے ایک سرے پر مردہ خانہ بنا رکھا ہے..... یہ مردہ خانہ ایئر کنڈیشن ہے۔ وہ ان مردوں کا کیا کرتا ہے علم نہ ہو سکا..... میں نے اس بات کی کوشش کی..... نہ تو مجھے منوعہ فلموں کی عکس بندی سے کوئی دلچسپی تھی نہ لڑکیوں اور عورتوں سے..... میں تو وہاں فرار ہونے کے لئے منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس تاک میں تھا کہ وہ منقش چری سچ کسی طرح حاصل کروں۔ اس کا حصول آسان نہیں تھا۔

وہ بظاہر ایک مہذب انسان دکھائی دیتا تھا..... اسے کوئی شیطان کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیوں کہ اس کی باتوں سے اندازہ لگانا مشکل تھا۔ جب اس نے بھی پال کے سامنے میری رہائی کی شرط رکھی کہ میں اپنی لڑکیوں کو اس کے حوالے کر دوں ورنہ یہی پال اور اس کے آدمی انہیں اغوا کر کے لے آئیں گے تو میری نیند حرام ہو گئی۔

دوسرے دن اتفاق سے شوٹنگ سے واپس آتے سے بھگوان نے میرے حال پر ترس لیا۔ میرے پیروں سے فرش پر گر گئی کوئی چیز ٹکرائی۔ میں نے جھٹک کر دیکھا۔ وہ منقش چری سچ تھا۔ جانے کس کا تھا..... کسی کا بھی تھا مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی۔

حیرت اور خوشی سے میرا برا حال تھا..... فرار ہوئے سنہرا موقوف تھا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ یہ تو میں نے دیکھا تھا کہ عدی کنارے موٹر بوس وغیرہ ہوتی تھیں۔ پھر میں عدی کنارے جانے کے لئے راہ داری سے گزر رہا تھا کہ ایک سنوائی سچ سنی راہ داری میں انحصار تھا..... کمرے میں اتنی روشنی ہو رہی تھی کہ اندر کا ذرہ ذرہ دکھائی دیتا تھا۔ بستر پر میں نے اس شیطان کو ایک چوہہ برس کی لڑکی کے ساتھ دیکھا۔ آخر اس بھیجنے نے درندگی سے اس پر سچ پالی۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ پھر اس نے خنجر اٹھا کر اس کو بے ہوش میں دیکھ کر اس کے سینے پر اس کی ٹوک سے سینے سے لے کر ناف تک ایک گھیر ڈالی..... جب اس زخم سے خون رسنے لگا تو اسے سینے اور چائے لگا۔ پھر اس نے یک لخت اس کی نبض دیکھی اور بڑبڑایا۔ ”ارے..... یہ تو مر گئی۔“ بے ہوشی کی حالت ہی میں..... اس لئے اس کا گرم گرم خون سرد ہونے لگا..... اس کا گوشت کیسا نرم اور ملائم ہے۔“

پھر اس نے اس لڑکی کو بازوؤں میں اٹھالیا۔ پھر اسے لے کر کمرے سے باہر آیا۔ اور پھر ایک دوسرے کمرے میں محسوس کیا، اس کمرے میں بھی روشنی ہو رہی تھی۔

میں ایک ستون کی آڑ میں چھپ گیا تھا اس لئے اس کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ جب میں آگے بڑھنے لگا تو معا میری نگاہ میز پر پڑی جس میں ایک پھولا ہوا بیڑا اور دو بڑا ڈانگوٹھیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جانے مجھے کیا خیال آیا..... ہمت آئی کہ میں نے اسے اٹھالیا۔ مجھے اس کمرے کے سامنے سے گزرتا ہوا..... جس میں وہ لڑکی کی لاش لے کر گھسا تھا۔ میں نے اس کمرے کے سامنے جو ستون تھا۔ اس کے عقب میں کھڑے ہو کر جھانکا۔ میری رگوں میں خون نجد ہو گیا۔ وہ مذبح خانہ تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ لڑکی کا سر فرش پر گر رہا ہوا تھا۔ اس نے اس لڑکی کو زنج کر دیا تھا۔

(جاری ہے)

قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

ہونٹوں کی مسکراہٹ ہوں یا فقط دعا ہو جاؤں
بھی تو میں بھی تیرے ہونٹوں سے یونہی ادا ہو جاؤں
بھی دل کرے تو وضو طے لیتا آواز دے کر مجھے جاناں
یونہی بے خیالی میں اگر تم سے میں دور ہو جاؤں
(مریم ماہ منیر..... لاہور)

ہم تو سمجھے تھے دل گلی ہوگی
اس کو الفت نہیں کبھی ہوگی
کیا سے کیا ہو گیا ہے پل بھر میں
اب تو ہر حال میں خوشی ہوگی
(عابد یگنیو..... کراچی)

نیری نظروں کے تیروں نے میرے دل کو گھائل کر دیا
کچھ کہہ نہ سکا تجھ کو تیری قربت نے پاگل کر دیا
(عثمان غنی..... پشاور)

ہم سے بندھے تھے دونوں وہ غم نہیں رہے ہیں
تم تم نہیں رہے ہو، ہم ہم نہیں رہے ہیں
نکر معاش نے تو جذبوں کو روند ڈالا
ہاش درگتہ ہم بھی کچھ کم نہیں رہے ہیں
(رابعہ باسط مظہر..... گوبر خان)

ٹھہر کر خوش رہتے ہو میری طرح سے تم جھوٹے ہو
اک ٹہنی پر چاند لگا تھا میں یہ سمجھا تم بیٹھے ہو
ٹھہ کو شام بتاوتی ہے تم کیسے کپڑے پہنے ہو سحر
تم تھا دنیا سے لڑ گئے بچوں سی باتیں کرتے ہو
(احسان سحر..... میانوالی)

ہم تیرے ہر بات ادھوری گنتی ہے
تیرے برسات ادھوری گنتی ہے
کھو جاتاں ہو جب بھی تیری یادوں میں
تو کو میری ذات ادھوری گنتی ہے
(بلیس خان..... پشاور)

شدت غم سے مری ہر سانس پوچھل ہوگی
اس قدر لئے کی تم سے آرزو کل ہوگی
(آستر..... کراچی)

پیارا وہ تھی، کہ ”سمندر“ سے بھی نہ بچنے پاتی
اور وہ تھا، کہ اک ”نقرہ“ بھی نہ دیتا تھا
خود ہی مائل تھا، اپنے بھی ورمیان وہ دعا
کسی اور سمت جانے کا رستہ بھی نہ دیتا تھا
(سائل دعا بخاری..... بصیر پور ادا کاڑہ)

اے میرے احساس جنوں کیا مجھے دینا
دریا۔ اسے بخشا ہے صحرا مجھے دینا
اک درد کا میلہ کہ لگا ہے دل و جاں میں
اک روح کی آواز کو رستہ مجھے دینا ہے
(شرف الدین جیلانی..... ٹنڈوالیار)

ہوئی شام تو آنکھوں میں بس گیا تو
کہاں گیا ہے میرے شہر کے مسافر تو
میں جانتا ہوں کہ وینا تجھے بدل دے گی
میں مانتا ہوں کہ ایسا نہیں۔ بظاہر تو
(مونا جاوید..... حیدر آباد)

رسم سجدہ بھی اٹھا دی ہم نے
عظمت عشق بڑھادی ہم نے
دل کو آنے لگا بسنے کا خیال
آگ جب گھر کو لگاؤنی ہم نے
(فائزہ..... کراچی)

میری آوارگی لوگو نہیں بے جا قسم لے لو
اگر تم دیکھتے اس کو، تو میرے ہم قدم ہوتے
(خاقان شیر..... لاہور)

سنا ہے ریت پہ چل کے تم اکثر مسکراتے ہو
کہو تو اب کی بار میں زمیں کی دھول بن جاؤں
(عمر علی..... لاہور)

اے کہنا کہ حق اور طارق کا نہیں ہم سے واسطہ کوئی
ہمیں تو جب بھی گلی صرف گلی، بس تقسیم ہوئے
(احمد علی..... لاہور)

☆☆



مگر ہماری تمنا کو سر ہی بنا
(رانا حنیف عاطر۔۔۔۔۔)

ساحل دل سے یادوں کی کشتیاں بھی لے جانا
طن کی خوشیاں فرقت کی تنہائیاں بھی ساتھ لے جانا
وہ رنگ و بو اور سندیے جو قید ہیں کتابوں میں
وہ خط و وہ گلاب اور وہ تلیاں بھی لے جانا
تیری پلکوں پہ چمکتے ستارے اور ان آنکھوں میں چھلکی
ٹوٹے ہوئے سپنوں کی کرچیاں بھی لے جانا
سانسوں میں بس گئی ہیں جو لبو میں رچ گئی ہیں
رنگ و جاں میں پلٹی یہ دیرانیاں بھی لے جانا
تیرے غم میں پلٹی ہوئی یہ اداسیوں پہرہاں اس رکتی ہے
دکھ درد کی وہ سبھی نشانیاں بھی لے جانا
تمہارے جھوٹے سہارے کہیں اور مفرد نہ کروں مجھے
لفظوں کی یہ ناتواں سی بیساکھیاں بھی لے جانا
(انتخاب: نوشین خان۔۔۔۔۔ کوٹ مظهر علی)

اب جو درد ہوا ہے تو احساس ہوا ہے ہم کو
کہ وہ شخص میرے دل کے قریب کتنا تھا۔۔۔۔۔
جو وہ کہتا تھا وہی عکس ابھرتا تھا اس میں
میرے دل کا آئینہ بھی عجیب کتنا تھا۔۔۔۔۔
اس کی آنکھوں میں دھنک رنگ خواب تلے جس کے
وہ شخص بھی لوگو! خوش نصیب کتنا تھا
شب بھر کئی، اپنی تو۔۔۔۔۔ تارے گھٹنے۔۔۔۔۔
اس کے پہلو میں خوش، رقیب کتنا تھا
جب اس نے مجھے چھوڑا تو دل میں اترا آنیا سکوت مرگ
روح میں جو پھیلا تھا، سناٹا مہیب کتنا تھا
ہر دعا فلک سے، بے نسل و مرام لوٹ آئی تھی دعا
نصیب بھی اپنا اس شب بد نصیب کتنا تھا
(ساحل دعا بخاری۔۔۔۔۔ بصیر پور۔ ادا کاڑہ)

مجھے یاد رکھو گے یا تم بھلا دو گے؟
اس جرم محبت کی بولو کیا سزا دو گے؟

اور سارے منظروں میں روشنی پھیل جاتی ہے
کلی، جیسے لرزتی اوس کے قطرے پہن کر سکراتی ہے
تو خوشبو باغ کی دیوار سے روکے نہیں رکتی
اسی خوشبو کے دھاگے سے مرا ہر چاکر سلتا ہے
تمہارے نام کا تارامری سانسوں میں کھتا ہے
تمہیں میں دیکھتا ہوں جب سفر کی شام سے پہلے
کسی موسم کے دامن میں کسی خواہش کے پہلو میں!

تو اس خوش رنگ منظر میں تمہاری یاد کا راستہ

نجانے کس طرف سے پھونٹا ہے

اور پھر ایسے مری راہ راہ کے ہم راہ چلتا ہے

کہ آنکھوں میں ستارے کی گزر گاہیں بنتی ہیں

دھنک کی کھلنا نہیں ی

تمہارے نام کی ان خوشنما حرفوں میں دھلتی ہیں

(انتخاب: نائیک محمد عظیم رضوی۔۔۔۔۔ کھاریاں)

آج کچھ سو مجھ سے کہ دل کی حالت عجیب ہے
غمگین ہے طبیعت دل رنگ و چاہت عجیب ہے
اس کی باتیں اس کی آنکھیں بدل رہی ہیں
لگ رہا ہے شب بھر قریب ہے
توڑ کر قسمیں وہ بدل رہا ہے نگاہیں
میں سمجھ گیا اب اس کے پاس رقیب ہے
بھلا کر مجھے اب رہتا ہے وہ اب خوش
اور مجھے وہ فرض دیا جس کا نہ کوئی طیب ہے
مسلسل میرے دل پر غم یار کے ستم ہیں
یوں لگتا ہے، احسان کہ اب میری موت قریب ہے
(احسان سحر۔۔۔۔۔ ڈاؤن خیلانوالہ)

تعلق ٹوٹ جائے گا میرا سارے زمانے سے
میرے اپنے خفا ہوں گے تجھے اپنا بنانے سے
تمہارے ساتھ رہنے سے مجھے تسکین ملتی، تنہی
بہت تکلیف ہوتی ہے تمہارے دور جانے سے
میرے گھر کو جلا دینا مگر یہ ذہن میں رکھنا
اجالا مل نہیں سکتا کسی کا گھر جلانے سے

لے کر آتے ہیں دامن میں امید کے گلاب
کیا تم ان سب گلابوں کو جلا دو گے؟
قون جگر سے لائے ہیں چہرے پہ نکھار
کیا میری ہر نگاہ کو آج تم بھلا دو گے؟
نہارا دل تو وہ حقیقت گھر ہے ہمارا
اب ہمارے گھر میں کسی اور کو بسا دو گے؟
(اقصی رباب۔۔۔۔۔ فیصل آباد)

بن ہی نہیں اہل روح بھی مرا کرتے ہیں
خون کے گھر میں موٹی بھی پلا کرتے ہیں
بن جاتے ہیں جو الاؤ میں مثل کوہ
برسات میں اکثر وہی گھر جلا کرتے ہیں
ہاتھ نہیں پھیلاتے جو سفید پوش
پلے میں بھیک کے وہ موت لیا کرتے ہیں
وہ قطرہ نہ سنبھالا جاسکا تم سے
دیرا آنسوؤں کا ہم پیا کرتے ہیں
(انوری رمضان۔۔۔۔۔ پنڈو افغان)

آج پھر اس کی یاد آئی ابھی ابھی
دل پھر بے قرار ہوا ابھی ابھی
اپنا تو سب کچھ لٹا چکے ہیں ہم
لے لے وہ بھی سر بازار ابھی ابھی
جنوں عشق کی بات نہ کرے کوئی
نہیں بیک سرکار ابھی ابھی
وہ جو ہمیں زخم دے چکے تھے
ہو کے کامل آئے ہیں ابھی ابھی
بازوں کے پھول سوکھ چکے ہیں فارسیہ
انکھوں نے آب کسے ابھی ابھی
(فارسیہ تبسم۔۔۔۔۔ شعیب مودقصور)

تمہارا نام کچھ ایسے میرے ہونٹوں پہ کھتا ہے

اکبر مری رات میں جیسے

اچانک چاند بادل کے کسی کونے سے باہر جھانکتا ہے

ہماری جان جائے گی تو پھر یہ جان جاؤ گے
کہ حاصل کچھ نہیں ہوتا کسی کا دل دکھانے سے
(عاقب شیر..... لاہور)

جو تجھے پسند آئے جو تیرے قریب ہو
یارب کوئی تو ایسا سجدہ نصیب ہو
یہ معجزہ بھی دیکھوں گے تیرا ہو کرم
میری شفاعت کو کھڑا تیرا حبیب ہو
اس راہ اطاعت میں یہ مرتبہ عطا کر
ہو تیرا جو رقیب دہی میرا رقیب ہو
جب تک یہاں رہوں حمد و ثناء لکھتا رہوں
پھر کے اور مدینے میں پڑھنا نصیب ہو
(امیں امتیاز احمد..... کراچی)

سنبھال رکھا تھا جن کو دل میں خزیں کی طرح
ڈبو گئے جاتے ہوئے دل ناتواں وہ سفینوں کی طرح
رات ساری وہ بن کے پٹا رہا مرے ساتھ ساتھ
رہی کیا ہوئی چھپ گیا پردہ نشینوں کی طرح
سیلاب درد گزر ہی جاتے ہیں مگر بعد اس کے
رہ جاتی ہے غلش کوچہ جاناں میں یکینوں کی طرح
چیمبریں جو کبھی مست ہوا میں تیرے رشتی آجکل کو
تو زلف لہرائے گالوں پہ ترے نازینوں کی طرح
اے عہد وفا کی دھلی بھتیجی بے رنگ سی شام
تو کبھی حسین تھی نگاہوں میں مری ماہ جینوں کی طرح
تم ہونا کے خار میں تو ہم جابوں کے حصار میں
دونوں ہیں اپنے عاز پر پختہ عازینوں کی طرح
ہم نے جو کیس بے گئی کی حرکتیں بے ارادہ سی گنگو
کر لیں روشن دل صحرا وہ آب گھوں کی طرح
(عصمت اقبال..... منٹکا ڈیم)

بات جو دل کی سنو گے تو ہار جاؤ گے
ہم جیسا چاہنے والا پھر کہاں سے لاؤ گے
جان دینے کی بات تو ہر کوئی کرتا ہے

زندگی بنانے والا کہاں سے لاؤ گے
جو اک نظر دیکھو گے تم میرے
تو ہر طرف صرف ہم ہی کو پاؤ گے
یقین اپنی محبت پہ اتنا ہے مجھے
میری چاہت کو دیکھو گے تو لوٹ آؤ گے
میری آنکھوں کے سمندر میں ڈوب جاؤ گے
تم کہیں جانا بھی چاہو تو جانہ پاؤ گے
(نورین اعظم..... لاہور)

خود اپنے لئے بیٹھ کے سوچیں گے کسی دن
یوں ہے کہ تجھے بھول کے دیکھیں گے کسی دن
بھٹکے ہوئے پھرتے ہیں کئی لفظ جو دل میں
دنیا نے دیا دقت تو لکھیں گے کسی دن
اے جان تیری یاد کے بے نام پرندے
شاخوں پہ تیرے درد کے اتریں گے کسی دن
جانی ہے جمیل کی گہرائی کہاں تک
آنکھوں میں تیری ڈوب کے دیکھیں گے کسی دن
خوشبو سے بھری شام میں جگنو کے قلم سے
ایک نظم تیرے واسطے لکھیں گے کسی دن
سوئیں گے تیری آنکھ کی صورت میں کسی رات
سائے میں تیری زلف کے جاگن گے کسی دن
(شرف الدین جیلانی..... ٹنڈوالہ پار)

بے وفاؤں سے ہل لگانا مجھے اچھا نہیں لگتا
ہر بات پر کرنا بہانہ مجھے اچھا نہیں لگتا
پہلے تو کہہ کر اپنا دل جیت لیتا اس کا
پھر کہہ کر بیگانہ مجھے اچھا نہیں لگتا
دعہ کر کے جانا کہ میں واپس آؤں گا
بعد جانے کے واپس نہ آتا مجھے اچھا نہیں لگتا
یہ دنیا دیکھ نہیں سکتی دو دوستوں کو نوری
اس لئے تو کہتا ہوں کہ زمانہ مجھے اچھا نہیں لگتا
(غلام نبی نوری..... کھڈیاں خاص)

☆ ☆

نڑتوں کے بچ
بھیش تلاش کرنا
شکل تو ہے

برج من نہیں ہے
زندگی کی اندھیرا راتوں میں
روشنی کی خواہش کرنا
پتہ چلے کے موسم میں
ایسہ ہار کھنا
دشمنوں کے چہرے میں
روشنی کی تلاش کرنا
شکل تو ہے

پرمان نہیں ہے
(مریم ماہ شیر..... لاہور)

دکھ نہ ہوتے تو مر گئے ہوتے
ہم نہ روتے تو مر گئے ہوتے
شب گزاری ہے آسمان تلے
گھر جو ہوتا تو گھر گئے ہوتے
حق کا پرچم اگر اٹھا لیتے
کچھ لوگوں کے سر گئے ہوتے
دشمنوں نے کیا کرم، درنہ
یار اپنے ہی کر گئے ہوتے
پھر نہ ملتا سراغ اپنا ابھی
حوصلے جب بکھر گئے ہوتے
اوڑھ رکھا ہے بھوک کو ہم نے
درد نفاقت سے مر گئے ہوتے

ساتھ دیتا جو ناخدا اپنا
بار ہم بھی اتر گئے ہوتے
جب اٹھانا نقاب رخ سے وہ
بھول سارے سنو گئے ہوتے
ایہ ہوتی نہ گر حکیم اس کی
غواب آنکھوں سے مر گئے ہوتے
(حکیم خان حکیم..... کمال پور موٹی)

کون ہے جو غم سے دو چار نہیں
دل ٹوٹ کے ریزہ ریزہ ہو گیا آخر

زندگی ریت کی دیوار نہیں
نفرتیں ملتی ہیں دنیا میں ہمیں
ایک ملتا ہی ہمیں پیار نہیں
جو مرے گھر کو جلا دے آکر
میرا ایسا تو کوئی یار نہیں

تیرے لئے سے قرار آتا ہے
دل کسی کا بھی طلب گار نہیں
بات رانا ہے سمجھنے کی ایسی
زندگی سچ ہے وفادار نہیں
(قدر رانا..... راولپنڈی)

مجھے یہ دعا ہی دیا کرو
کبھی بے بسی نا تمام ہو
تجھیں بھولنا کہاں بس میں ہے
میں یہ چاہوں، چاہو مجھے صنم
مجھے خود سے تم نہ جدا کرو
تیرے بن میں زندہ نہیں صنم
میرے جسم میں تم بسا کرو
مجھے لمحہ نہ موت دو
مجھے لمحہ نہیں فنا کرو
دشمنوں نے کیا کرم، درنہ
یار اپنے ہی کر گئے ہوتے
پھر نہ ملتا سراغ اپنا ابھی
حوصلے جب بکھر گئے ہوتے
اوڑھ رکھا ہے بھوک کو ہم نے
درد نفاقت سے مر گئے ہوتے

کھل میرے گھر جو آیا چاند
ایک سے کو ٹھہرا چاند
درد کے گھرے دریا میں
ڈوب نہ جائے میرا چاند
تارو تم تو ٹھیک ٹھیک
تم نے تو دیکھا ہوگا چاند
جھانک رہی تھی سوچ میری
کروں، کروں، کروں رويا چاند
سوزج ہم کو چھوڑ گھٹیا
پیلے آگن، پیلے چاند
گتے آئو ساتھ گرے
تجھ جب لکھا چاند
آنکھیں کھلتی جاتی تھیں
چاندنی بن کر اترا چاند
ہم نے ساتھ قمر تیرے
پہلی بار یہ دیکھا چاند
(چوہدری قمر جہاں علی پوری..... ملتان)

☆ ☆

ما فوق الفطرت

عمران قریشی - کونینہ

اسٹینڈیم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا، تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی کہ اچانک دونوں مدمقابل رنگ میں آگئے اور ایک دوسرے کو فتح پانے اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لئے زور آزمائی شروع کر دی کہ پھر اچانک ایسا ہوا کہ.....

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی اور جاندار، اشرف المخلوقات انسان پر سہقت لے سکتا ہے

گزشتہ کچھ دنوں کے دوران جانور نے دنیا کے مقبول ترین باکسروں زولو اور بنگلہ کو شکست دے دی۔ اب یہ نیویارک کے سب سے بڑے ہڈن ہال میں دنیا کے عجیب و غریب مقابلے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ کروڑوں پر مشتمل شائقین بلیک میں ٹکٹ خریدنے کو تیار ہیں۔ لیکن ہڈن ہال کا ٹکٹ دستیاب نہیں ہو رہا۔ گزشتہ کچھ دنوں کی چپقلش کیا رنگ لائی ہے۔ اس کے نتیجے کے لئے صرف ایک دن باقی رہ گیا ہے۔ کیا جانور انسان کو ہرا کر چیمپئن شپ کا اعزاز حاصل کر پائے گا۔ شاید ایسا ہو جائے اور اگر ایسا ہو گیا۔ تب اشرف المخلوقات کہلانے والے انسان پر ایک جانور سہقت حاصل کر لے گا۔ یاد رہے گزشتہ کچھ ایام کے دوران یہ جانور انسانوں پر سہقت حاصل کرتا چلا آیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کل چیمپئن شپ کا اعزاز رکھنے والے ہارڈی ڈوم کو ہرا پاتا ہے..... یا نہیں..... لیکن گزشتہ روز شائع ہونے والے انٹرویو میں ہارڈی ڈوم کچھ نروس دکھائی دیتا تھا۔ انٹرویو کے دوران متعدد بار اس کی زبان لڑکھڑا گئی اور وہ جانور کے تذکرے پر ہنچھٹا اٹھا۔ عوام جانور کو ما فوق الفطرت قرار دے رہی ہے۔ بلکہ ایک افریقی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جانور میں ڈما

ویوتا کی روح حلول کر گئی ہے اور اب انسانوں کو جتنی شکست سے ہمکنار کر دے گی۔ بہر کیف کل کے مقابلے سے پہلے مزید کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن مقابلہ جیتنا سنسنی خیز ثابت ہوگا۔ ہڈن ہال والوں کا کہنا ہے کہ ”آج سے پہلے بھی اتنی زیادہ تعداد میں کسی بھی مقابلے کے ٹکٹ فروخت نہیں ہوئے۔ یہ ریکارڈ سیل ہے۔ اس لئے مقابلے کا اہتمام بھی معیار کے مطابق ہوگا۔“

نیویارک ٹائمز 1970ء

یہ گدھانما جانور ایک پاکستانی نژاد جعفر کی تخلیق تھا۔ جعفر جسے عرف عام میں امریکی جیف کے نام سے پکارتے تھے۔ پچیس سالہ نوجوان تھا۔ اس کا باپ مسلمان جو کہ پاکستان کا رہنے والا تھا۔ جبکہ ماں انگریزی تھی۔ اور اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ افریقہ کے ایک چھوٹے سے ٹاؤن میں جعفر کی پرورش ہوئی۔ اس کا بوڑھا باپ چاول کی کاشت کا کام کرتا تھا۔ لیکن زمین کسی اور کی ہونے کی وجہ سے آمدنی محدود تھی۔ شادی سے پہلے جعفر کے باپ نے مختلف جگہ نوکری تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن شہریت نہ ہونے کے بدولت مقصد میں ناکام رہا۔ پھر اس کی ملاقات سیاہ فام

لڑکی ڈینی سے ہوئی۔ کچھ ہی ملاقاتوں کے بعد جعفر کے باپ نے جس کا نام جہانگیر تھا۔ ڈینی سے شادی کر لی اور اس کے آبائی ٹاؤن لوئی ٹاؤن شفٹ ہو گیا۔ جہاں جعفر کے علاوہ دو لڑکیاں سونی اور عینی پیدا ہوئیں۔ جانور کی تلاش کا آغاز کرنے سے پہلے یہ بتانا چلوں کہ کہانی کے کرداروں کے نام اور رہائی علاقوں کے نام مکمل طور پر تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔

بہر حال جانور کی تلاش کے دن آسان سیاہ بادلوں سے مکمل طور پر گھرا ہوا تھا۔ غنڈی ہوا بارش کی پیشین گوئی کر رہی تھی۔ جعفر اپنے ٹاؤن سے کچھ دور کھاو کی مختصر منڈی میں موجود تھا۔ اس کے پاس زمیندار کا ٹریکٹر کھڑا تھا۔ جس میں کھادی بوریوں وھری جا چکی تھیں۔ ٹریکٹر کے پیچھے مختصر ٹرال بھی نصب تھا۔ بارش ہونے کے پیش نظر جعفر نے آنے سے پہلے بڑی سی تریال ٹرال میں رکھ دی تھی۔ یہ احتیاط اب کام آ رہی تھی۔ اس نے کھادی رقم ادا کرنے کے بعد تریال کو کھاو کی بوریوں کے اوپر ڈال دیا۔ اور ٹریکٹر کی جانب چل دیا۔ ٹریکٹر کی سیٹ کے اوپر لوہے کی مختصر چھت بنی ہوئی تھی۔ اور سامنے کی جانب بارش سے بچنے کے لئے مختصر شیشہ بھی موجود تھا۔ بارش موسلا دھار انداز میں برسنے لگی۔ دور موجود پہاڑوں پر بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ لیکن جعفر مطمئن تھا۔ بارش اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ کھادی بوریوں کے اوپر تریال بنی ہوئی تھی۔ اور اس کی سیٹ کے اوپر لوہے کی چھت بنی ہوئی تھی۔ وہ بارش سے مکمل طور پر محفوظ تھا۔ ابھی وہ انکیشن میں چابی گھومانے نہیں پایا تھا کہ اچانک قریبی پڑچون کی دکان سے اس کے ٹاؤن کا لڑکا نمودار ہوا۔ اس نے چلاتے ہوئے جعفر کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اور ہاتھوں میں موجود راشن کے خیلے سنبھالا ہوا اس کی جانب بھاگتا چلا آیا۔ جعفر نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ پھر انکیشن میں چابی گھما کر ٹریکٹر کو اسٹارٹ کر دیا۔ لڑکا قریب آ چکا تھا۔ اس کا نام ڈونی تھا۔ بارش طوفانی انداز اختیار کر لی جارہی تھی۔ اس مختصر بھاگ دوڑ

کے دوران ڈونی مکمل طور پر بیگ گیا تھا۔ اس نے قریب پہنچے ہی جعفر سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم ٹاؤن داپس جا رہے ہو؟“ جعفر نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”تو اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ابھی میں بھی تمہارے ہمراہ ٹاؤن کی جانب جا سکتا ہوں۔ بس ملنا ممکن نہیں ہے۔“ جعفر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے خوش اسلوبی کے ساتھ جواب دیا۔

”کیوں نہیں..... پیچھے ٹرال میں بہت بھلا خالی پڑی ہے۔ تم ٹرال کے اندر بیٹھ کر تریال کو اپنے اوپر اوڑھ لو۔ طوفانی بارش اور سرد ہوا تمہارا کچھ بھی نہیں لگاڑ سکے گی۔“ ڈونی نے مسنونانہ نگاہوں سے جعفر کی جانب دیکھا۔ پھر راشن کے خیلے اٹھائے ٹرال کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ ٹرال کے اندر کھادی بوریوں کے درمیان کافی جگہ خالی پڑی تھی۔ اس نے کھادی بوریوں کو ترتیب دیا اور ان کے درمیان بننے والے مختصر جگہ کے درمیان اپنا سامان رکھ کر تریال کو اچھی طرح اوڑھ لیا۔ جعفر نے مسکراتے ہوئے ٹریکٹر کی سیٹ پر ڈال کر کھڑک چھوڑ دیا۔ ٹریکٹر جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ کھادی منڈی سے لوئی ٹاؤن تک باقاعدہ سڑک موجود نہیں تھی۔ یہ سڑک کچی کچی تھی۔ بارش کی بدولت کچڑ سے بھری جارہی تھی۔ لیکن طاقتور ٹریکٹر کو کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ سڑک پر ہلکی رفتار میں با آسانی آگے بڑھنے لگا۔ کھادی منڈی سے کچھ آگے مختصر گھروں اور دکانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ پھر میدانی علاقہ شروع ہوا اور اس کے بعد فریقہ کا گھنا جنگل..... جنگل کے درمیان مختصر پگھلڈی پر ٹریکٹر آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بارش کی سایڈزوں سے پڑنے والی پھوار سے جعفر کو سردی کا احساس ستانے لگا۔ اس نے ٹریکٹر کی رفتار کو آہستہ کیا۔ پھر نیچے موجود سیٹ پر سے گرم شال نکال کر اوڑھنے کی کوششیں کرنے لگا۔ وہ شال کو جسم کے گرد لپیٹنے کے دوران ایک ہاتھ کے ساتھ اسٹیرنگ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس طرح اس کا دھیان دو جانب بٹ جاتا تھا۔

اچانک درختوں کے درمیان میں سے کوئی چیز تیر کی مانند باہر نکلی اور ٹریکٹر کے فرنٹ شیشے کے ساتھ ٹکرائے کے بعد ای تیز رفتاری کے ساتھ دوسری جانب موجود درختوں کے درمیان غائب ہو گئی۔ جعفر نے گھبرا کر بریک پر پاؤں رکھ دیئے۔ اچانک بریک لگنے کی بدولت ٹریکٹر کچڑ سے بھری پگھلڈی سے پھسلتا ہوا پگھلڈی سے نیچے اترا چلا گیا۔ پھر ٹریکٹر کا پچھلا پیہر کچڑ سے بھرے ہوئے بہت بڑے دلدل نما کڑھے کے درمیان پھنس گیا۔ جعفر نے پریشان نگاہوں سے کڑھے کی جانب دیکھا۔ پھر ایسی لیٹر پر دباؤ دھانے لگا۔ ٹریکٹر کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے لگے۔ پھر اچانک ہی پیہر کڑھے سے باہر نکل آیا۔ جعفر نے طویل سانس لیتے ہوئے پیچھے ٹرال کی جانب دیکھا۔ ڈونی تریال کو اٹھائے قریبی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جعفر نے چلا کر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی جاندار چیز ٹریکٹر کے فرنٹ شیشے سے ٹکرائی ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ کیا چیز تھی۔ تم باہر آؤ۔ اسے قریبی درختوں میں ڈھونڈتے ہیں۔ وہ یقیناً کہیں قریب ہی چھپ گئی ہوگی۔“

ڈونی نے اثبات میں سر ہلایا اور تریال کو ہٹا کر ٹرال سے نیچے اترا آیا۔ اس کے بعد ان دونوں نے طوفانی بارش کے درمیان تمام ارد گرد کا جنگلی چھان بار لکھیں وہاں کسی بھی قسم کا کوئی جاندار موجود نہیں تھا۔ کچھ دیر کی تلاش کے بعد دونوں مایوس قدموں کے ساتھ ٹریکٹر کی جانب چل دیئے۔ جعفر نے ٹریکٹر کو اسٹارٹ کیا اور ڈونی تریال کو ہٹا کر اپنی جگہ پر بیٹھ کر باہر کا جائزہ لینے لگا۔ اب کی دفعہ وہ دونوں کسی بھی دشواری کے بعد لوئی ٹاؤن پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

جعفر کا گھر لوئی ٹاؤن کے درمیان میں چند گھنٹے درختوں کے درمیان بنا ہوا تھا۔ اس نے گھر کے سامنے ٹریکٹر کو روکا۔ اور نیچے اتر کر لکڑی کا دروازہ کھولنے لگا۔ ڈونی بھی ٹرال سے نیچے اترا آیا۔ لکڑی کے دروازے کے ساتھ کھاو۔ بیج اور کھجی پاڑی کے اوزار

رکھنے والا کمرہ بنا تھا۔ جعفر اور ڈونی نے تریال کے نیچے سے کھادی بوریاں نکالی شروع کر دیں۔ بارش کا زور ٹوٹنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اب بوند باندی کی صورت اختیار کرنے لگی تھی۔ تقریباً دس کے قریب بوریاں نیچے اتارنے کے بعد جب جعفر نے آگے کی بوریاں ختم کرنے کے بعد پیچھے موجود بوریوں کا رخ کیا۔ تب ”اؤک اؤک“ کی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس نے حیرت بھری نگاہوں سے تریال کے نیچے موجود مختصر بوریوں کی جانب دیکھا۔ کھجے اندھیرے کے درمیان اسے ایک ننھا منھا گدھے کا بچہ بوریوں کے درمیان بیٹھا نظر آیا۔ وہ حیرت انگیز طور پر اپنے منہ سے ”اؤک اؤک“ کی آواز نکال رہا تھا۔ اتنی دیر میں ڈونی اپنی بوری کمرے میں چھوڑ کر واپس آ گیا اور استغنامیہ نگاہوں سے جعفر کی جانب دیکھنے لگا۔ جعفر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میرے دوست..... یہاں تو ایک ننھا منھا گدھے کا بچہ موجود ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ تمہارے راشن کے خیلے کے اندر سے گھر نکال کر کھانے میں مصروف ہے۔“

”گدھا اور گاجر.....“ ڈونی حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ پھر چھلانگ لگا کر ٹریکٹر پر چڑھ گیا۔ اس نے جھٹکے کے ساتھ تریال کو ہٹا دیا۔ مختصر بوریوں اور راشن کے بکھرے ہوئے خیلوں کے درمیان نکل کر کچھوٹا سا بچہ اپنے اگلے دونوں ہاتھوں کے درمیان گاجر تھامے معصوم نگاہوں سے دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”اؤک اؤک.....“ اس نے ڈونی اور جعفر کی جانب دیکھتے ہوئے منہ سے آواز نکالی۔ جعفر نے زور دار قہقہہ لگایا۔ پھر بولا۔ ”کیوں میرے ننھے مہمان..... تم کب خاموشی کے ساتھ ٹرال میں گھس آئے۔ یہ غیر قانونی بات ہے۔ اور تم نے ڈونی کے راشن کا تھیلہ بھی تباہ کر دیا۔“ کھجے کے بیچ نے حیرت بھری نگاہوں سے جعفر اور ڈونی کی جانب دیکھا۔ پھر ہاتھ میں موجود گاجر کو ایک جانب پھینک کر آگے بڑھ کر جعفر کے ہاتھ کو

اپنے اگلے چھوٹے ہاتھوں میں تھام کر لمبی تھوٹھنی کے ساتھ چومنے لگا۔ جعفر نے اس عمل کے دوران گہرا کر پیچھے ہٹنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے ہر اقدام میں جارحانہ پہلو کے بجائے محبت کا سمندر موجزن تھا۔ جعفر نے مسرت بھرے انداز میں جانور سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ اور اس کے سر پر ہاتھ بھیرنے لگا۔ ننگرو نے حلق سے ”اؤک اؤک“ کی آواز نکالی۔ اور آگے بڑھ کر ڈوٹی کے راس سے بھرے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر گارباہر نکالی اور کھانے لگا۔ اس کی جسامت بمشکل ایک فٹ سے کچھ زیادہ رہی ہوگی۔ کان گدھے کی مانند بڑے تھے۔ اور گلے میں سنہرے رنگ کی مضبوط زنجیر پھنی ہوئی تھی۔ جس پر اوڈین سرکس کا نام تحریر تھا۔ جعفر نے ڈوٹی کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

”میرے نئے دوست کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟“ ڈوٹی بولا۔

”یہ سرکس کا سدھایا ہوا ننگرو دکھائی دیتا ہے۔“ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو۔ تب اسے واپس اوڈین سرکس والوں تک پہنچا دیتے ہیں۔“

جعفر نے انکار میں سر ہلایا اور بولا۔ ”اب یہ ممکن نہیں رہا۔ جب میں کھادی بوریوں لینے مڑی کا رخ کروں گا۔ تب میں نے سرکس والوں کے قافلے کو شہر کی جانب جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب تک تو وہ شہر پہنچ بھی گئے ہوں گے۔ بالفرض اگر انہوں نے دوبارہ لوٹی ٹاؤن کا رخ بھی کیا۔ تب بھی اپنے معصوم دوست کو ان کے حوالے نہیں کر دیں گا۔ اب یہ میرے ساتھ رہے گا۔“ ڈوٹی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ننگرو کے بچنے کے گارنٹیسم کرنے کے بعد تھیلے کے اندر ہاتھ مارا اور دوسری گارنٹی نکال کر چپانے لگا۔ جعفر اور ڈوٹی اس کی اس حرکت پر کھلکھلا کر ہنس دیے۔

کھادی کی بوریوں کو گودام کے اندر ایڈجسٹ کرنے کے بعد جعفر اور ڈوٹی نے گودام کے ایک کونے کو اچھی طرح صاف کیا اور ننگرو کے بچے کو زنجیر کی مدد سے کھونٹے کے ساتھ باندھ دیا۔ ڈوٹی نے سامان کے تھیلے

اٹھائے اور اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ جبکہ جعفر اپنے گھر کے رہائشی حصے کی جانب چل دیا۔ باپ کو بھی اس رقم اور کھادی کی بوریوں کا حساب کتاب دینے کے بعد اس نے ٹریکٹر کو اسٹارٹ کیا اور زمیندار کے گھر پر آنے کے بعد جب اس نے دوبارہ ڈوٹی کے ہمراہ گودام کا رخ کیا۔ تب انہوں نے ننگرو کو بے تاب پایا۔ وہ بیوکا دکھائی دیتا تھا۔ ڈوٹی اپنے ہمراہ گارباہر نکالی اور اس نے گارباہر جانور کے آگے ڈال دیں۔ پھر جعفر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ یہ گارباہر کے علاوہ اور کیا کچھ کھا سکتا ہے؟ آج تو میرے پاس صرف گارباہر ہی موجود ہیں۔“

جعفر بولا۔ ”جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ ننگرو آسٹریلیا کے جنگلات میں پایا جاتا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے ٹاؤن میں آسٹریلیئن نژاد باکسریلی بیکر ہائٹس پذیر ہے۔ ننگرو کو اس کے پاس لے چلتے ہیں۔ وہ ہمیں اس کی پرورش سے متعلق مفید مشاورات سے نواز سکتا ہے۔“ ڈوٹی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور ننگرو کی زنجیر تھامے گودام سے باہر ٹاؤن کی جانب چل دیا۔ باہر مطلع مکمل طور پر صاف ہو چکا تھا اور اب شدید جس کی بدولت دم گھٹنا محسوس ہونے لگا تھا۔ بیلی بیکر کا ٹکڑی سے بنا مختصر گھر ٹاؤن سے کچھ ہٹ کر دریا کے کنارے واقع تھا۔ وہ اپنے وقت کا ہیوی ڈیوٹ جنٹلمین رہ چکا تھا۔ اب بوڑھا ہونے کے بعد ریٹائرمنٹ کی پرمردہ اور گمنام زندگی افریقہ کے اس مختصر ٹاؤن میں بسر کر رہا تھا۔ یہاں اس کی زندگی گزر بسر کا کوئی معقول ذریعہ موجود نہیں تھا۔ وہ ٹاؤن کے بچوں کو باکسنگ کی مشق کروا رہا تھا۔ جس کا اسے ناموں کے برابر معاوضہ مل جاتا تھا۔ جب ان دونوں لڑکوں نے بیلی بیکر کے ٹکڑی سے بچے گھر کے احاطے میں قدم رکھا۔ تب مکان کا احاطہ ٹاؤن کے لڑکوں سے بھرا پڑا تھا۔ وہ باکسنگ کی پریکٹس کرنے میں مصروف تھے۔ جعفر اور ڈوٹی کے ہمراہ ننگرو کو اچھلتے کودتے گھر کے احاطے

داخل ہوتا دیکھ کر سب لڑکے ان کی جانب متوجہ ہوئے۔ ان کے چہروں پر حیرت کے علاوہ جوش کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ بیلی بیکر نے بھی حیرت کی نگاہوں سے ننگرو کی جانب دیکھتے ہوئے جعفر سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

”جف اسے کہاں سے پکڑ کر لائے ہو؟ مجھے یہ سرکس کا سدھایا ہوا ننگرو دکھائی دیتا ہے۔“

”آپ کا اندازہ درست ہے۔“ جعفر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میرا معصوم دوست اوڈین سرکس کا سدھایا ہوا ننگرو ہے۔ اس کے گلے میں سرکس والوں کا پتہ موجود ہے۔ یہ وہاں سے فرار ہو کر ہمارے پاس چلا آیا ہے۔“

بیلی بیکر نے آگے بڑھ کر ننگرو کے سر پر ہاتھ پھرا۔ اس نے فوراً بیلی بیکر کے دونوں ہاتھوں کو تھام اور بیلی تھوٹھنی کے ساتھ چومنا شروع کر دیا۔ لڑکوں نے زوردار ہتھکڑیاں لگایا۔ اور ننگرو کے بچے کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

جعفر بولا۔ ”انگل بیکر ہمیں ننگرو کے متعلق کچھ معلومات درکار ہیں۔ مثلاً یہ کیا کھاتا ہے۔ کہاں رہائش رکھتا ہے۔ اس کے وقتوں میں آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ آپ کا تعلق اس کے دیس سے ہے۔ اس لئے ہمارے خیال کے مطابق آپ کو ضرور معلومات ہوں گی۔“ بیلی بیکر نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولا۔

”اس میں کوئی شک نہیں۔“ ننگرو کا تعلق آسٹریلیا سے ہے اور میں اس کے متعلق کافی معلومات رکھتا ہوں۔ یہ کھانے میں گھاس، سبزی، کیلے اور بسکٹ کا پیسٹ وغیرہ سب کھا سکتا ہے۔ رات کے علاوہ دن میں تقریباً پانچ گھنٹے آرام کرتا ہے۔ علاوہ ازیں لمبی دوڑ گانے کا شوقین ہے۔ ایک بات مزید جو تم میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگی۔ وہ بھی بتائے دیتا ہوں۔ ننگرو پیدائشی باکسر ہوتا ہے۔ میں جوانی میں جب ہیوی ویٹ باکسر تھا۔ تب میرے پاس سدھایا ہوا ایک ننگرو موجود تھا۔ میں اس کے ہاتھوں میں گلوڑ باندھ دیتا تھا۔ اور وہ

میرے ساتھ باکسنگ کا کھیل کھیلتا تھا۔“ بیلی بیکر نے ہاتھوں کو کونوں کی صورت دیتے ہوئے بتایا۔ ”لیفٹ ہک۔ پرائٹ ہک۔ اس کے بعد زپ۔“ لڑکوں کے چہرے خوشی سے تھمتانے لگے۔ جعفر کے ساتھ موجود ڈوٹی نے پوچھا۔

”یہ زپ کیا ہوتا ہے؟“ بیلی بیکر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”رائٹ اور لیفٹ ہک کے بعد آخری زوردار وار کو زپ کرنا کہتے ہیں۔ یہ ہک وار آخری وار کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر حریف کو بچ پڑ جائے تب وہ زپ ہو جاتا ہے اب میں تمہیں پریکٹس کر کے دکھاتا ہوں۔“ پھر اس نے اپنے شاگردوں کی جانب گھومتے ہوئے ایک لڑکے سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اپنے گلوڑ مجھے دو۔“ لڑکے نے ہاتھوں میں موجود گلوڑ اسے تھما دیے۔ بیلی بیکر نے آگے بڑھ کر دونوں گلوڑ تھوڑی سی محنت کے ساتھ ننگرو کے ہاتھوں میں باندھ دیے۔ ننگرو کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ابھرنے لگے۔ پھر اس کے منہ سے ”اؤک اؤک“ کی آواز ابھری۔ اور وہ پرفیشنل باکسروں کی طرح اپنے پچھلے دو پاؤں پر اچھلتے لگا۔ بیلی بیکر نے مسکراتے ہوئے اپنے دوسرے شاگرد بے گلوڑ مانگے۔ اور ہاتھوں میں پہن کر ننگرو کے بچے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ پھر بولا۔

”آؤ میرے نئے ساتھی۔ ایک ہلکا سا مقابلہ ہو جائے۔ لیکن خیال رکھنا میرے ناک کی ہڈی کمزور ہے۔ کہیں اسے توڑ نہ دینا۔“ لڑکوں نے دل کھول کر ہتھکڑیاں لگایا اور ماضی کے ہیوی ویٹ باکسر نے بھی اپنے پاؤں پر اچھلتا شروع کر دیا۔ لڑکے مکمل دلچسپی کے ساتھ جانور اور انسان کو دیکھنے لگے۔ بیلی بیکر مسکراتے ہوئے بولا۔

”آؤ میرے دوست میاں سامنے آ جاؤ۔“ لڑکوں نے ادھر ادھر ہٹ کر جگہ خالی کر دی۔ اور ننگرو اچھل کر بیلی بیکر کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر مسرت کے تاثرات ابھرنے لگے تھے۔ بیلی

نیکرے آگے بڑھ کر لیٹ یک اس کے چہرے پر سید کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کنگرو نے چہرہ بائیں جانب گھما کر وار خانی کر دیا۔ پھر پھر کی کے ساتھ رات ایک کب کا استعمال کرتے ہوئے سابقہ ہوی ویٹ کی دہائی پسیوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ یہ خطرناک داؤ تھا۔ لیکن اس کے سامنے اپنے وقت کا بہترین باکسر موجود تھا۔ اس نے وہ جھکاؤ دے کر صاف بچ گیا۔ کنگرو اپنے ہی زور میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ تب بنلی نیکرے ہلکا سا گھونہ جانور کے چہرے پر رسید کر دیا۔ کنگرو نے اس کے گلوز میں پوشیدہ ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھا ماور "اوک اوک" کی آواز نکالنے سے چومنا شروع کر دیا۔ تمام لڑکے مکمل بحویت کے عالم میں یہ سفسی خیر مقابلہ دیکھنے میں مصروف تھے۔ کنگرو کی اس حرکت پر کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

بنلی نیکر پر جوش لہجے میں بولا۔
"یہ واقعی حیرت انگیز طور پر خدا داد صلاحیتوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن اسے پالش کرنے کی ضرورت ہے۔ اور وہ میں بخوبی کر سکتا ہوں۔ پہلے اس کا نام تجویز کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں مللڈ اٹھیک رہے گا۔ یہ جنگلی جانور ہے۔ اور مللڈ اٹھیک کے مقدس دیوتا کا نام ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے جعفر کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جعفر نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولا۔
"انگل نیکر کیا ہمارا کنگرو باکسنگ کھیلنا سیکھ جائے گا۔" نیکر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بے شک۔۔۔۔۔ یہ ایک اچھے باکسر کی تمام صلاحیتوں کا مالک دکھائی دیتا ہے۔ لیکن بہر حال اسے کچھ نہ کچھ مزید سیکھنا ہوگا۔ جس کے لئے میری خدمات حاضر ہیں۔"

پھر مللڈ اٹھیک تربیت کا آغاز ہو گیا۔ چھ بجے سے لے کر رات آٹھ بجے تک جعفر اور ڈوئی فارغ ہوتے تھے۔ وہ اس فارغ اوقات کے دوران مللڈ اٹھیک کو ہمراہ لے کر نیکر کی تربیت گاہ کا رخ کرتے وہاں سخت تربیت کا آغاز ہوتا۔ بنلی نیکر کو یہ جان کر بہت حیرت

ہوتی کہ مللڈ اٹھیک مجھے ہوئے باکسر سے کم حیثیت میں رکھتا تھا۔ وہ باکسنگ کے پیشتر اسرار دور موز سے ہمارا طور پر آگاہی رکھتا تھا۔ کونیش دو ہفتوں کی تربیت کے دوران مللڈ اٹھیک نے بنلی نیکر کے ایک سال سے تربیت لیتے تمام لڑکوں کو ہرا دیا۔ وہ ایک مجھے ہوئے تربیت یافتہ کھلاڑی کے طور پر اپنا نام نمایاں کرنے لگا۔ لونی ٹاؤن میں سالانہ میلے کا آغاز ہونے والا تھا۔ اس موقع میلے میں باکسنگ کے کھیل کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔ باکسنگ کے کھیل میں ارد گرد کے تقریباً پندرہ ٹاؤن کے لڑکے حصہ لیتے تھے۔ بنلی نیکر کا ارادہ اس کھیل میں شرکت کرنے کا تھا۔ وہ اس کھیل کا چوری کا ممبر تھا۔ لیکن اس سال اس کی نظر انتخاب مللڈ اٹھیک کے چہرے تک محدود تھی۔ وہ اسے کھیل کا دوز بنانے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ پھر وہ دن بھی آ گیا۔ جب ٹاؤن سے باہر گئے درختوں کے درمیان بنے وسیع و عریض میدان کے درمیان میلے کا افتتاح ہوا۔

لونی ٹاؤن کے تمام افراد میلے میں شرکت کر رہے تھے۔ میلے کے ایک دن پہلے جعفر اور ڈوئی نے مللڈ اٹھیک کو نیلے رنگ کی مختصر بنیان زیب تن کی۔ اور بیلے والے میدان کی جانب چل دیے۔ بنلی نیکر کے مختصر شاگردوں کی بدولت یہ بات تمام ٹاؤن میں پھیل چکی تھی کہ کنگرو کا وہ بچہ جو گزشتہ کچھ دنوں سے تمام لونی ٹاؤن کی توجہ کا مرکز بننا ہوا تھا۔ وہ ٹاؤن کے سب سے بڑے میلے میں باکسنگ کے کھیل میں شرکت کرنے والا ہے۔ اس دن تمام بیلے والوں کی توجہ کا مرکز باکسنگ کا کھیل رہا۔ درختوں کے درمیان رسیاں باندھ کر کلوئی کے اسٹیج کی منظر کشی کی گئی تھی۔ مقابلے کا آغاز صبح دس بجے ہوا۔ مختلف ٹاؤن کے مختلف لڑکے آتے گئے اور ہار کر رنگ سے باہر نکلتے گئے۔ شام چار بجے جس لڑکے کا انتخاب ہوا۔ اس کا نام ہنری تھا۔ اور اس کا تعلق قریبی ٹاؤن سے تھا۔

ہنری جسامت کے لحاظ سے چار فٹ چھ انچ جبکہ مضبوط بدن کا مالک ہونے کے علاوہ سٹاک

لیٹ کا حامل لڑکا تھا۔ اس کے مقابلے میں مللڈ اٹھیک تربیت چھوٹا اور طبیعت میں انکسار پایا جاتا تھا۔ ظاہری طور پر مللڈ اٹھیک کے قابل نہیں تھا۔ لیکن باکسنگ کا یہ مقابلہ فنی اسٹائل تھا۔ یہاں قانون وغیرہ کا کچھ زیادہ دخل نہیں تھا۔ صرف طاقت کا استعمال زیادہ تھا۔ اور طاقت کسی کے پاس بھی ہو سکتی تھی۔ ہنری کے نمایاں پوزیشن لینے کے بعد جب کمپیر نے اعلان کرنے والے انداز میں مجھے میں موجود مزید باکسروں کو آگے لانے کے لئے اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ تب مجھے پچھیر خاموشی طاری رہی اور کسی نے بھی رنگ پر آنے کی کوشش نہیں کی۔

تب بنلی نیکر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ تمام مجھے کی نااہلی اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ مللڈ اٹھیک کے ہراؤ نہیں تھا۔ اسے مجھے کے درمیان بیٹھنا ناممکن نہیں تھا۔ وہ درختوں کے جھنڈے سے کچھ دور کھلے میدان میں جعفر اور ڈوئی کے پاس بیٹھا چوک بار کھارہا تھا۔ بنلی نیکر نے رنگ میں داخل ہو کر مائیک ہاتھوں میں تھا۔ پھر حمیدہ لہجے میں مجھے سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میں ہنری کو آج کی شاندار کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ یقیناً یہ ایک اچھا اور منجھا ہوا باکسر ہے۔ لیکن میں آج کے دن تجربے کے طور پر ایک مختلف مقابلے کا اہتمام کرنا چاہتا ہوں۔ جسے آپ سب بھی یقیناً پسند کریں گے۔ سب سے پہلے میں مقابلہ جینے والے دوز کے لئے انعام کا اعلان کرتا ہوں۔ وہ انعام پچاس ڈالر کی صورت میں بری جب کے اندر موجود ہے۔ اس کے علاوہ اب ہنری کے حریف کا نام مللڈ اٹھیک ہے۔ جو جنگوں کے دیوتا کا باہر نام ہے۔ نام کی مناسبت سے ہنری کا حریف انسان نہیں بلکہ جانور ہے۔"

مجھے میں چہ میگوئیوں کا آغاز ہو گیا۔ لونی ٹاؤن کے تمام لوگ مللڈ اٹھیک شخصیت سے واقفیت رکھتے تھے۔ اگر کچھ لوگ نہیں رکھتے تھے۔ تو وہ باہر کے مختلف ٹاؤن کے لوگ تھے۔ بنلی نیکر بولے جارہا تھا۔ "وہ میرا سدھایا ہوا کنگرو ہے اور ہمارے ٹاؤن کے مختلف لڑکوں کے

ساتھ مقابلے میں اول نمبر حاصل کر چکا ہے۔ میں باکسنگ کے کھیل کی چوری اور خاص طور پر ہنری سے اجازت طلب کرتا ہوں کہ وہ مقابلے کا آغاز کرنے کے لئے مجھے اجازت دیں۔ تاکہ ایک ایسے مقابلے کا آغاز کیا جائے۔ جو آج کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ دیکھا گیا اور نہ ہی سنا گیا۔ چوری کے سرکردہ افراد میں پہلے کا درجہ میں خود رکھتا ہوں۔ لیکن بقایا دو کی منظوری کی بھی ضرورت کو لازمی قرار دیتا ہوں۔" چوری کے دو ارکان اٹھ کر اسٹیج پر چڑھتے چلے آئے۔ ان دونوں کا نام جون اور ڈین تھا۔ دونوں کا تعلق باکسنگ کے شعبے سے رہ چکا تھا۔ جون مائیک ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔

"کیا یہ مقابلہ صرف تفریح طبع کے لئے ہوگا۔ یا پھر مکمل مقابلے کی حیثیت کا اختیار رکھتا ہوگا۔ میرے خیال میں صرف تفریح کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔ مقابلہ سخت اور مکمل ہونا چاہئے۔"

بنلی نیکر بولا۔ "صرف تفریح کے لئے میں تمیں قصبوں کے دادہ دوز کا مذاق نہیں بنانا چاہتا۔ یہ مسلم حقیقت ہے کہ میرا سدھایا ہوا کنگرو ایک مکمل حریف ثابت ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس مقابلے کو مستقل سلسلے کے لئے منتخب کر لیا جائے۔ بہر حال میزبانوں میں ایک دلچسپ مقابلہ ہوگا۔" جون نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اپنے دوسرے ساتھی ڈین کی جانب دیکھنے لگا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔۔۔۔۔" ڈین بولا۔ "ہنری باکسنگ کا مقابلہ جیت چکا ہے۔ اب اگر تجربے کے طور پر ایک جانور سے مقابلہ کرنے کو تیار ہوتا ہے تب کچھ مضائقہ نہیں ہوگا۔ ہنری تم کیا کہتے ہو؟" اس نے ہنری کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

"اگر چوری اقرار میں فیصلہ دے چکی ہے تب میرے کچھ کہنے کے لئے باقی کیا بچا ہے۔" اس نے غصیلے لہجے میں جواب دیا۔ وہ ایک جانور کے ساتھ مقابلے کرنے کو اپنی ہتک سمجھتا تھا۔ لیکن چوری کا فیصلہ بہر حال آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ اس لئے اقرار کرتا ہوں۔ بنلی نیکر نے اگلی رو میں بیٹھے اپنے شاگرد کو اشارہ

کیا کردہ جعفر اور مغللہ اکو اسٹیج کی جانب لائے۔ پھر مجھے سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”مجھے یقین ہے کہ آپ اس دلچسپ مقابلے سے ضرور لطف اندوز ہوں گے۔ یہ یقیناً نوعیت کے لحاظ سے منفرد مقابلہ ہوگا۔ میں جیوری کے ارکان کو اپنی سیٹوں پر واپس بیٹھنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اور ہنری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جس نے ہماری بات مان کر ایک ایسے مقابلے کے لئے ہاں کر دی۔ جو آج سے پہلے نہیں منعقد نہیں ہوئے۔“

مجمع زور دار تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ اتنی دیر میں بنی بیکر کا شاگرد جعفر ڈوئی اور مغللہ کے ہمراہ مجھے میں داخل ہوا۔ لوگوں کی نظریں بے اختیار مغللہ کی جانب اٹھ گئیں۔ جو مجھے میں داخل ہونے کے بعد شوق بھری نگاہوں سے رنگ کی جانب دیکھنے میں لگن تھا۔ اس نے ہاتھوں میں گلوڑ پہنے ہوئے تھے۔ اسٹیج پر اب صرف بنی بیکر اور ہنری موجود تھے۔ جیوری کے ہتھیلیا دونوں ارکان اپنی سیٹوں کی جانب واپس جا چکے تھے۔

”حاضرین..... میں آپ کا بہت مشکور ہوں گا۔ اگر آپ میرے تربیت یافتہ کنکڑ کو اسٹیج پر آنے کے لئے راستہ دیں گے۔ تاکہ مقابلے کا باقاعدہ افتتاح کیا جاسکے۔“ لوگوں نے فوراً راستہ چھوڑنا شروع کر دیا۔

ہنری حیرت بھری نگاہوں سے مغللہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ رنگ کے پاس پہنچ کر مغللہ اٹھ بھی چلا گیا۔ لگائی۔ اور تقریباً ہوا میں اڑتا ہوا رنگ کے درمیان میں آکھڑا ہوا۔ بنی بیکر دوبارہ ہنگام ہوا۔ ”میں یہاں یہ بتانا ضروری خیال کرتا ہوں کہ عام مقابلوں کی طرح یہ مقابلہ مختلف راؤنڈز پر مشتمل نہیں ہوگا۔ ہار اور جیت کا فیصلہ دونوں حریفوں میں سے ایک کے ناک آؤٹ ہونے پر ہی ہوگا۔ اب یہ سلسلہ طوالت اختیار کرتا ہے۔ یا پھر منٹوں کے اندر مکمل ہوتا ہے۔ اس کا آنکھار دونوں حریفوں پر ہوگا۔ مغللہ اصراف پر یک کہنے پر الگ کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اصولوں کی پاسداری کرنا چاہتا ہے۔“ بنی بیکر نے نائیک کو نیچے موجود لڑکے کے حوالے کیا۔

اور رنگ سے باہر نکل کر اگلی رو میں موجود ایٹمی کریم بیٹھا۔ ریفری نے پہلے ہنری کے دونوں گلوڑ چیک کر کے اس کے بعد جھجکتے ہوئے مغللہ کی چیکنگ کی۔ چہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے راؤنڈ شروع کرنے کی دہل بجادی۔

ہنری نے اپنے پاؤں پر پنچوں کے بل اچھلنا شروع کر دیا۔ اس کے دونوں گلوڑ چہرے کا محاصرہ کرے ہوئے تھے۔ پھر جیسے بجلی چمکتی ہے۔ اس طرح اپنا کھڑا ہی اس نے آگے بڑھ کر لیفٹ ہک مغللہ کی پٹیلیوں کے درمیان مارنے کی کوشش کی۔ مغللہ نے پھرتی کے ساتھ ایک جانب ہٹتے ہوئے وار خالی جانے دیا اور اپر کٹ اس کے چہرے کے دائیں جبڑے پر رسید کر دیا۔ ہنری کو رنگ گھومتا ہوا دکھائی دیا۔ اور وہ زکھرا کر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ مجھے والوں کے منہ سے تحسین آمیز آوازیں خارج ہوئیں اور ریفری نے گنتی گنتی شروع کر دی۔ ابھی گنتی چھ تک پوری نہیں ہوئی تھی کہ ہنری سنبھل کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے منہ کے دانے کے پاس سے خون کی لکیر بہہ کر سفید بنیان کو سرخ کرنے لگی۔ اور چہرہ بڑکریا ہوا۔ اب اس نے دوبارہ پچھلے پنچوں پر اچھلنا شروع کر دیا۔ اس دفعہ پچھلے مغللہ اٹھنے کی۔ اس نے اچھل کر لیفٹ ہک ہنری کی پٹیلیوں پر رسید کیا۔ پھر ہاتھ روکا نہیں۔ بلکہ لگا تار بارش کی طرح اس کی پٹیلیوں پر برساتنا شروع کر دیا۔

ہنری کی ہمت پہلے ہی پلچ کے ساتھ ہی ختم ہوئی تھی۔ چار پانچ پنچ لگا تار لگنے کی بدولت وہ دوبارہ گھٹنوں کے بل زمین پر گرنا چلا گیا۔ اس کے ناک سے خون بہہ کر رنگ کی زمین کو سرخ کرنے لگا۔ مجھے میں تحیر آمیز خاموشی طاری ہو گئی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک سرس کا سدھایا ہوا جانور تربیت یافتہ باکسر کو ناک آؤٹ کر دے گا۔ یہ بات بنی بیکر کے دہم و گمان سے بھی پرے تھی۔ اتنی جلدی مقابلے کا اختتام..... اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس مختصر لڑائی کے دوران وہ یہ بات اچھی طرح جان چکا تھا۔ کہ مغللہ اخلاصاً جیتوں کا

کے کرتا دھرتا کا نام میری جوتن تھا۔ وہ ایک ایڈیٹر اور تجربہ کار انسان تھا۔ مختصر سلام دعا کے بعد اس نے اپنے آنے کا مدعا یوں بیان کیا۔

”میں مغللہ کی شہرت کے معلق سن کر یہاں آیا ہوں۔ ایسے جانوروں کی میری سرکس کو ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ اگر آپ اسے میرے ہاتھوں فروخت کرنا چاہیں تو میں معقول معاوضہ دینے کے لئے تیار ہوں۔“ بنی بیکر مسکراتے ہوئے بولا۔

”سوئے کا انڈہ دینے والی مرغی کو میں یکمشت ذبح کرنے کو بے وقوفی قرار دیتا ہوں۔ آپ بھلا مجھے اس کی کیا قیمت دے جائیں گے۔ پچاس ہزار ڈالر..... یا پھر ایک لاکھ ڈالر..... کل نہیں تو پرسوں وہ ختم ہو جائیں گے۔ لیکن ایک مستقل رقم دینے والا جانور تمہارے پاس بحفاظت موجود رہے گا۔ اور تم تمام زندگی فائدہ حاصل کرتے رہو گے۔ میں گھائے کا سودا کرنے کو تیار نہیں ہوں۔“ میری جوتن اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”مجھے فائدہ یا نقصان کی پرواہ نہیں ہے۔ میں صرف اپنے سرکس کو چھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری نگاہ میں اگر کوئی اور سودا جہنم لے رہا ہے۔ تو بلا جھجک مجھے بتا سکتے ہو۔ میں سودے پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔“

”یہ بات ہوئی ناں.....“ بنی بیکر پر جوش لہجے میں بولا۔ ”ہمارے باکسنگ کے ایکٹ کو تمام قصبوں میں سراہا جا رہا ہے۔ بلکہ کچھ عرصہ پیشہ نیویارک ٹی دی کا نمائندہ بھی ہوئی ناؤن آتا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ وہ باکسنگ کے اس مقابلے کوئی دی پر جگہ دینے کی پوری کوشش کرے گا۔ یہاں یہ بات بتانا چلوں کہ مقابلے کا اہتمام تمبر کے اوائل میں کیا جاتا ہے۔ یعنی آج سے تقریباً پانچ مہینے بعد..... میں نے اسے ہاں کہہ دی ہے۔ اس لئے تم مغللہ کی اہمیت کا اندازہ لگاسکتے ہو۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس میں افریقہ کے جنگوں کے سب سے بڑے دیوتا مہادیوتا کی روح حلول کر چکی ہے اور اب یہ ناقابلِ تسخیر ہے۔ میرے پاس باکسنگ سے

گئے۔ یعنی میں بے وقوف ہوں۔ اور تم عقلمند۔ مجھے بے وقت بھی دیکھنا تھا۔ اب فوراً سے خوشتر یہاں سے دھج ہو جاؤ اور جانے سے پہلے یہ بات یاد رکھنا کہ میں جو تمہاری نگاہوں میں بے وقوف ہوں۔ بے وقوف ہونے کے باوجود ایک اچھے اور مسز پیٹے کا کاروبار ہی ہوں۔ لیکن تم کیا ہو؟ ایک معمولی کنکرو کے مالک۔۔۔۔۔۔ سرکس میں ایکٹ کرنے والے جو کہ..... اگر عقلمند ہو۔ تو اپنی حیثیت کو درست کرو۔ پھر بات کرنا۔“ تو قیر صاحب نے بات مکمل کی۔ پھر پاؤں شیخ کر کھڑے ہوئے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

دوسرے دن صبح سویرے بلی بیکر اور جعفر نے لوئی ٹاؤن کو خیر باد کہہ دیا۔ ٹاؤن کے بڑے بوڑھوں کے علاوہ جعفر کے باپ اور بہنوں نے بھی اسے ایسا کرنے سے منع کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جعفر نے سنی ان سنی کر دی۔ اسٹیشن پر مثلاً کوئی مال گاڑی کے ڈبے میں بند کرنے کے بعد جعفر نے باپ کے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا۔ ”میں جلد از جلد پیٹے بھوانے کی کوشش کروں گا۔ آپ اپنا اور میری بہنوں کا خیال رکھئے گا۔ آمدن زیادہ ہونے کے فوراً بعد میں آپ کو مجبور کروں گا کہ آپ کھیتوں میں کام کرنا چھوڑ دیں۔ آپ کی عمر اب اس قابل نہیں کہ کھیتوں کی سختیاں جھیل سکیں۔ لیکن بہر حال ابھی تک میرے اختیار میں اس سے زیادہ نہیں کہ ایک سے حاصل ہونے والی زیادہ تر رقم آپ کو بھجوا سکوں۔“ باپ نے اسے اپنے سے جدا کرتے ہوئے جواب دیا۔

”زمیندار اور زمین کا تعلق ایسا نہیں ہوتا۔ جسے چھوڑا جاسکے۔ اس تعلق کے درمیان عمر بھی حائل نہیں ہو پاتی۔ میں مرے دم تک زمین پر چلا تارہوں گا۔ چاہے تمہاری آمدنی اتنی زیادہ ہو جائے جب میں تمام لوئی ٹاؤن کی زمینیں ہی کیوں تاخیر دیوں۔ لیکن رہوں گا میں تب بھی زمیندار ہی۔“ جعفر نے مجبور ہو کر باپ کی جانب دیکھا۔ وہ عزم و استقلال کی ایسی برچھائی دکھائی دیا۔ جو ناقابل شکست تھی۔ ٹرین نے روانگی کی

وسل دی۔ بلی بیکر کنکرو کو چوک بار اور کیلے کھلانے کے بعد دونوں کے پاس اکٹرا ہوا تھا۔ جعفر نے باپ کے ساتھ بغل گیر ہو کر آنکھوں میں آتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا۔ پھر محبت بھرے لہجے میں بولا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن کوشش کروں گا کہ تمام نہ سہی..... لوئی ٹاؤن میں واقع اپنی زمینوں کو خریدنے کی جن پر آپ کام کرتے ہیں۔ اور جو زمیندار کی ملکیت ہیں۔“ باپ نے مسکراتے ہوئے جعفر کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ٹرین نے دوبارہ وسل دی اور دونوں پھرتی کے ساتھ اپنے ڈبے پر چڑھتے چلے گئے۔ ٹرین نے پلیٹ فارم کو چھوڑنا شروع کر دیا۔ جعفر کے باپ نے آنکھوں میں آتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا اور اسٹیشن سے باہر کی جانب چل دیا۔ اس مختصر وقت کے دوران وہ بڑھاپے کی ان منزلوں کو محسوس کر پایا تھا۔ جس سے اب تک نا آشنا تھا۔ اس کا جوان سالہ خون اپنی ذمہ داریوں سے دلبرداشتہ ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر چکا تھا۔ کہاں زمینوں کی آمدن۔ اور کہاں سرکس میں معمولی ایکٹ کی آمدن۔ وہ اپنے لڑکے کے فیصلے میں مطمئن نہیں تھا۔

دوسری جانب جعفر کو یہ فکر لاحق تھی۔ کہ اس کا بوڑھا باپ زمینوں کی سختیوں کو بھلا کیونکر جھیل پائے گا۔ اس کی آرام کرنے کی عمر بھی۔ زمینوں پر کام کرنا۔ اس کی بیماری کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ لیکن جعفر کو مکمل یقین تھا کہ ایکٹ سے حاصل ہونے والی آمدن اتنی تو ضرور ہوگی۔ جس سے اس کے علاوہ گھر کا خرچہ بھی چل سکے۔ تب یقیناً اس کا باپ زمینوں پر کام کرنے سے اجتناب کرے گا۔ بہت سی سوجھ بچھیں تھیں۔ لیکن اس لمحے اس کے پاس ان کا حل موجود نہیں تھا۔ اس لئے اس نے سوچوں کو دماغ سے پرے جھٹک کر زمین کی کھڑکی سے باہر گزرتے کھیتوں کی جانب دیکھنا شروع کر دیا۔

دوسرے دن دوپہر تین بجے تینوں نیو یارک ریلوے اسٹیشن پر اتر گئے۔ جون میری سرکس کا ٹرک اسٹیشن کے باہر موجود تھا۔ کنکرو کو ٹرک کے پچھلے حصے

میں منتقل کرنے کے بعد بیکر اور جعفر ڈرائیور کے ساتھ ایک سیٹ پر بیٹھ گئے۔ یوں یہ مختصر قافلہ شہر سے باہر پہنچا۔ جون میری سرکس تک جا پہنچا۔ یہاں خیموں اور ڈھروں میں بندھے جانوروں کا شہر آباد تھا۔ جون نے جعفر اور بیکر کا پر جوش استقبال کیا اور دونوں کو ان کے خیموں کی جانب بھیجنے کے بعد ملٹاؤ کو قریبی پنجرے میں بند کر دیا۔

یہاں سے کہانی کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ کچھ ہی دنوں میں بائسنگ کنکرو کا یہ ایکٹ نہایت مقبول ہونے لگا۔ ایکٹ کی مقبولیت کے ساتھ بیکر اور جعفر کے معاوضے میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ تقریباً ایک سال کے مختصر عرصے کے دوران جعفر نے گاؤں میں واقع کافی حد تک زمینیں خرید لیں۔ اب وہ مطمئن تھا۔ اس کا باپ بے یار و مددگار نہیں تھا۔ بلکہ اس کے کہنے کے مطابق اب اس نے زمینوں پر کام کرنے کے لئے چند ٹرک بھی رکھ لئے تھے۔ اس ایک سال کے دوران اسے ماریا کی جانب سے صرف ایک خط موصول ہوا۔ جس میں اس نے اپنی شادی کی اطلاع دی۔ اس کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔

جون میری سرکس کا دائرہ کار نیو یارک کے تمام چھوٹے بڑے شہروں اور ارد گرد کے مشہر قصبوں تک محدود تھا۔ ایسے ہی ایک چھوٹے سے ٹاؤن میں سرکس کے دوران ایک ایسا ناقابل فراموش واقعہ پیش آیا۔ جس نے اخباروں کی دنیا میں تھلک مچا کر رکھ دیا۔ ہوا کچھ یوں۔ کہ اس دن موسم ابر آلود تھا اور ہوا میں خشکی کا مناسب بتدریج بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس حوالے سے سرکس میں تماشائیوں کی تعداد کچھ کم ہی تھی۔ بہر حال قافلہ ایکٹ گزرنے کے بعد جب بائسنگ کنکرو کے ایکٹ کی ابتدا ہوئی۔ تب ہال میں موجود مختصر تماشائیوں نے تقریباً سانس روک لئے۔ بیکر ہاتھ میں ایکٹ تھا۔ رنگ میں داخل ہوا۔ پھر تماشائیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”آپ یقیناً باکسر کنکرو کو دیکھنے کے لئے بے

چین ہوں گے۔ میں آپ کی بے چینیوں میں مزید اضافے کا باعث نہیں بننا چاہتا۔ اس لئے مقابلے کا افتتاح کرنے سے پہلے حسب معمول اعلان کرتا ہوں کہ اگر رنگ میں سے کوئی تماشائی میرے سدھائے ہوئے کنکرو سے بائسنگ کا مقابلہ کرنا چاہے تب میں پانچ سو ڈالر جیتنے والے کو دینے کا اعلان کرتا ہوں۔ یاد رہے مقابلہ راؤنڈ پر مشتمل نہیں ہوگا بلکہ ناک آؤٹ کرنے والے کو رنگ کا جیمپن قرار دیا جائے گا۔“

رنگ کے مختصر تماشائیوں میں خاموشی چھا گئی۔ زیادہ تر تماشائی کنکرو کو لڑتے دیکھ چکے تھے اور وہ جانتے تھے کہ کنکرو بائسنگ کے مقابلے میں تقریباً ناقابل خیر تھا۔ اس وقت حال کے مختصر تماشائیوں کے درمیان نیو یارک کے سب سے بڑے اخبار نیو یارک ٹائمز کے اسپورٹس سیکشن کا ایڈیٹر جس کی بھی موجود تھا۔ وہ کنکرو کے بائسنگ ایکٹ کی شہرت کے متعلق سن کر یہاں آیا تھا۔ اس کے فوٹو اس کے مختصر انٹرویو کے لئے۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ اس کے قریب ہی بائسنگ کی دنیا کا بے تاج بادشاہ ایک ایسا شخص بھی موجود تھا۔ جس کے ساتھ اس کی رقابت کا ایسا سلسلہ چلتا تھا۔ جو کبھی بھی ختم نہیں ہونے والا تھا۔ مختصر اعلان کی صورت حال کے بعد وہ شخص اڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور چلائے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارے کنکرو کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہوں۔“ جس کو فوراً احساس ہو گیا کہ وہ اس وقت شراب کے نشے میں دھت تھا۔ بلی بیکر کی آواز نایک میں سنائی دی۔

”تب پھر آپ رنگ میں آجائیے، تاکہ مقابلے کی باقاعدہ شروعات کی جاسکے۔“ جس نے اپنی سیٹ کو چھوڑنے کی کوشش کی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر واپس بیٹھ گیا۔ وہ ایسے سنہرے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ صبح کے اخبار کی بڑی سرفی اپنے ذہن میں ترتیب دے چکا تھا۔ ”عالمی ڈل ویٹ جیمپن کا اعزاز رکھنے والا ہارڈی ڈوم“ گزشتہ روز ایک معمولی جانور کے ساتھ نبرد آزما۔۔۔۔۔۔ سرفی کے نیچے رنگین

تصویریں کی بھرمار جن میں ہارڈی ڈوم کو نگر دے مار کھاتے دکھانا جیسے تجربہ کار رپورٹر کے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ لیکن اسے ننگرو کے متعلق سوچ کر انفس محسوس ہو رہا تھا۔ اب سے کچھ دیر بعد اس کا جو حال ہونے والا تھا۔ اس کے متعلق اگر جانور کو پتا چل جاتا۔ تو وہ فوراً رنگ کو چھوڑ کر جنگلوں کی جانب بھاگ جاتا۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی تھی۔ ہارڈی ڈوم تقریباً نشتے میں دھت تھا۔ ہو سکتا ہے کہ سرکس کی دنیا میں دھوم مچانے والا سدھایا ہوا ننگرو اپنی موت آپ مرنے سے بچ جاتا۔ اگر ایسا ہو جاتا۔ تب ہارڈی ڈوم کے لئے تقریباً ڈوب مرنے کا مقام ہوتا۔ ایک جانور سے شکست کھانے کے بعد اسے یقیناً ہانگنگ کی دنیا کو چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ اسے مزید یاد آ کہ موجودہ ٹاؤن ہارڈی ڈوم کی جائے پیدائش کا درجہ رکھتا تھا۔ یقیناً وہ یہاں گرمیوں کی چٹیاں نگرانے کی نیت سے آیا ہوگا۔ موسم ابر آلود ہونے کی بدولت ہال میں اندھیرے اور روشنی کا ملا جلا تناسب پایا جاتا تھا۔ اس لئے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے ہارڈی ڈوم کو پہچانا نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ موجود اس کے ٹاؤن کے دوست اس بات سے بخوبی آگاہی رکھتے تھے کہ جانور کا مقابلہ عالمی ٹڈل دیٹ چیمپئن کا اعزاز رکھنے والے ہارڈی ڈوم سے ہونے والا تھا۔ جب ہارڈی ڈوم نے لڑکھڑاتے ہوئے رنگ کے اندر قدم رکھا۔ تب بیلی نے اسے خوش آمدید کہتے ہوئے رنگ کے ایک سائیڈ میں کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ پھر ایک جانب موجود گلوز اٹھا کر اسے تھما دیے۔ اور مائیک اٹھاتے ہوئے بولا۔

”میرے خیال کے مطابق کپڑے بدلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ننگرو کو اس بات سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اس کے مقابلے نے پینٹ اور شرٹ پہن رکھی ہے یا بھیر نیکر۔۔۔۔۔۔ لیکن میں پہلے بتا دوں کہ تمہاری ٹوٹ پھوٹ کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہوگی۔ اب بھی دقت ہے۔ اگر واپس سیٹ کی جانب جانا چاہو تو بخوشی جاسکتے ہو۔“

ہارڈی نے زیر لب کوئی گندی گالی دی۔ پھر گورو پہننے لگا۔ سرکس کے اندر کی جانب موجود دروازے کے آگے لگے ہوئے پردے کا کچھ حصہ چاک ہوا۔ اور معلوم ہوا کہ ہاتھوں میں گلوز پہنے نمودار ہوا۔ ہال میں موجود تماشاویوں نے شور مچا کر اس کا استقبال کیا۔ رنگ کے قریب پہنچ کر اس نے چھلانگ لگائی اور حسب معمول رسیوں کو پھلانگ کر رنگ کے درمیان میں آکھڑا ہوا۔ بیلی نیکر نے دونوں کے گلوز چیک کئے اور پیچھے ہٹ کر راؤنڈ شروع ہونے کی دہلی بجا دی۔

ہارڈی نے اسٹل بیچوں پر اچھلنے کی کوشش کی۔ لیکن زیادتی شراب نوشی کی بدولت لڑکھڑا کر گرتے گرتے بھا۔ اس نے اپنے آپ کو فوراً استیصال لیا اور آگے بڑھ کر پانچا ملا مللڈا کے چہرے پر بارنے کی کوشش کی۔ نکتے میں شدت نہیں تھی۔ اس کے باوجود مللڈا نے چہرہ ایک جانب کرتے ہوئے دارخانی جانے دیا اور لیفٹ کپ ہارڈی کی دہائی پسلیوں پر رسید کر دیا۔ نکتے کی شدت کی بدولت ہارڈی کو اپنا شراب سے بھرا معدہ الٹا محسوس ہوا۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن مقصد میں ناکام رہا۔ اور فوارے کی صورت میں شراب منہ سے باہر نکل کر رنگ کو بھگونے لگی۔ ہارڈی کے پاؤں میں نروزش پد ا ہوئی۔ اور وہ رنگ کے درمیان گرتا چلا گیا۔ تماشاویوں کے شور سے سرکس کا ماحول گونج اٹھا۔ بیکر نے کتنی گنتی شروع کی۔ لیکن کتنی ابھی پانچ تک نہیں پہنچی تھی کہ ہارڈی سر جھٹک کر دو بارہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جسم پر موجود شرٹ آدھی سے زیادہ گیلی ہو گئی تھی۔ معدہ کی حد تک خالی ہونے کی بدولت اسے اپنے اسوان بحال ہوتے محسوس ہونے لگے۔ اس نے ایک دفعہ پھر اپنے سر کو جھٹکا اور آگے بڑھ کر تابلو زکوں کی بارش کر دی۔ مللڈا ”اوک اوک“ کی آواز نکالتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی کمر رسیوں کے ساتھ جا لکرائی۔ ہارڈی نے آگے بڑھ کر سیدھے ہاتھ کا پنا خلا شخ اس کے چہرے پر مارنے کی کوشش کی۔ لیکن مللڈا بے

ظاہر ہارڈی کے ساتھ لپٹ گیا۔ وہ ایسا کر کے اس کے تلوں سے مہو غل رہنا چاہتا تھا۔ ہارڈی نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کر دینے کی کوشش کی۔ لیکن مللڈا کی گرفت مضبوط تھی۔ اور ہارڈی کسی حد تک نفع میں دھت تھا۔ مللڈا نے اپنا کھمبہ کی شدت سے مطلوب ہو کر اس کے چہرے کو چومنا شروع کر دیا۔ ہال میں موجود لوگوں نے زور دار قہقہہ لگایا۔ اور مللڈا کی کتنی میں منہ لگانے لگے۔

ہارڈی نے جھنجھلا کر اپنے آپ کو مللڈا کی گرفت سے آزاد کیا اور غصے کی حالت میں اندھا دھند لوگوں کی بوجھناؤ کر دی۔ مللڈا اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو اس کے حملوں سے بچاتا رہا۔ پھر اس نے سیدھے ہاتھ کا ایک مکا پوری طاقت کے ساتھ ہارڈی کے چہرے پر رسید کر دیا۔ ہارڈی چاروں شانے جیتے زمین پر گرتا چلا گیا۔ بیلی نیکر نے کتنی شروع کی۔ لیکن ہارڈی کا جسم بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس مختصر لڑائی کے دوران نیکر اس بات سے بخوبی آگاہ ہو گیا تھا کہ مللڈا کا زہیم کوئی عام انسان نہیں تھا بلکہ ایک نچھٹا ہوا باکسر تھا۔ جس کا رنگ کی دنیا سے رشتہ کافی غریب سے تھا۔ رپورٹر جس نے اس لڑائی کی تصاویر مختلف زاویوں سے اتاری تھیں۔ ہارڈی کو زمین پر گرتے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے علاوہ مسرت کے تاثرات ابھرنے لگے۔ اور اس کے علاوہ ایک ایسے منصوبے کا تانا بانا بھی۔۔۔۔۔۔ جس نے بعد ازاں ننگرو کو عالمی ٹڈل دیٹ چیمپئن کی صف میں لاکھڑا کیا۔

دوسرے دن نیویارک ٹائمز اخبار کے اسپورٹس ایڈیٹر کی صف اول کی سرخیوں میں پہلی سرخی موجود تھی۔ اس نے اسپورٹس کی دنیا والوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

جائونر نے عالمی ٹڈل دیٹ چیمپئن شپ کا اعزاز حاصل کر لیا۔

نیچے تفصیل موجود تھی۔

گزشتہ روز جیری ٹاؤن میں سرکس کے معمولی

ایک کرتے والے جانور نے عالمی ٹڈل دیٹ چیمپئن کا اعزاز رکھنے والے ہارڈی ڈوم کو پچاس کے قریب افراد کے سامنے ہرا دیا۔ نیویارک ٹائمز کا اسپورٹس ایڈیٹر بذات خود وہاں موجود تھا۔ مقام پہلے راؤنڈ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ بائیس سے متعلق رکھنے والے ننگرو نے پہلے راؤنڈ کے دوران ہارڈی کو ناک آؤٹ کر دیا۔ نیچے مقابلے کی باقاعدہ تفصیل موجود تھی۔ جس میں اس بات سے مکمل طور پر پروہ پوشی کی گئی تھی کہ ہارڈی مقابلے کے دوران نشتے میں دھت تھا۔ تفصیل کے ساتھ صورت حال کو رنگین تصویروں کے ساتھ مزین کیا گیا تھا۔ جیسے ہی نیویارک ٹائمز کا اسپورٹس ایڈیٹر ریلیز ہوا۔ اس کے کچھ دیر بعد ہی ہارڈی کے علاوہ اس کے منبر اور نیویارک ٹائمز کے اخبار کے فون کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔۔۔۔۔۔ لوگ خبر کی تصدیق کے لئے فون کر رہے تھے۔ وہ مللڈا ٹائی ننگرو سے ملنا چاہتے تھے۔ جس نے ٹڈل دیٹ چیمپئن کو ایک ہی راؤنڈ کے دوران ہرا کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ کچھ لوگ ہارڈی کو ختم بھی یعنی جیری ٹاؤن کی جانب کھڑے ہوئے جہاں جون میری سرکس کے بڑے بچھرے میں مللڈا ابند تھا۔ لوگوں نے اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اسے کھانے کے لئے کیلے اور چوک بار چاکلیٹیں دیں۔ مللڈا نے خوش ہو کر ان کے ہاتھ پر بیاہر دیا۔ دوسری جانب نیویارک ٹائمز کے اسپورٹس ایڈیٹر کے لیے چوڑے آفس کے درمیان کرسیوں پر اس وقت تین افراد کے درمیان دنیا کا سب سے عجیب و غریب معاہدہ طے پا رہا تھا۔ ایڈیٹر ٹیمس بیلی نیکر اور جعفر۔۔۔۔۔۔ ایڈیٹر ٹیمس ہیکم تھا۔

”تم دونوں کو یہاں بلانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں نے جیری ٹاؤن کی مختصر فائٹ کے دوران یہ بات بخوبی محسوس کر لی تھی کہ مللڈا کے اندر خدا واد صلاحیتیں موجود ہیں۔ تم دونوں اس بات سے نیکر ناواقف ہو کہ اس وقت فائٹ کے دوران جس انسان کو شکست دی ہے۔ وہ کوئی عام انسان نہیں تھا بلکہ ٹڈل دیٹ چیمپئن شپ کا درجہ رکھنے والا ہارڈی ڈوم تھا۔“ نیکر

اور جعفر کی آنکھیں حیرت کی بدولت چمکنے لگیں۔ جس مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہارڈی ڈوم فائٹ کے دوران مکمل طور پر نشے میں دھت تھا۔ اس لئے ملڈا کو شاید زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی۔ لیکن میرے اندازے کے مطابق اگر وہ جدوجہد کرے۔ تب ہارڈی کو باقاعدہ رنگ کے درمیان ہرا سکتا ہے۔ سوچو اگر ایسا ہو جائے۔ تب میرے علاوہ تم دونوں بھی دنیا کے امیر ترین انسان بن جاؤ گے۔ کیا خیال ہے؟“ جس خاموش ہو گیا۔ بیکر بولا۔

”لیکن جناب ایسا بھلا کیونکر ہو سکتا ہے۔ میں باکسنگ کے شعبے سے تقریباً تیس سال منسلک رہا ہوں اور اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ باکسنگ کے مقابلے کے لئے وزیر اسپورٹس کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس اجازت کے لئے کسی جیتے جاتے انسان کا سامنے ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جانور کو وزیر اسپورٹس بھلا کیوں اجازت دینے لگا۔“

”یہ سب میرا کام ہے۔“ جس درمیان میں بات کاٹ کر بولا۔ ”کرل بیوش کے ساتھ میرے تعلقات اچھے ہیں۔ اس کے علاوہ عوام کے دلوں میں ہمدردی کے جذبات ابھارنے کے لئے ہمیں کچھ مختصر اقدامات کرنے ہوں گے۔ جن میں سرفہرست قدم میڈیا کی مدد سے ملحق ہے اور میڈیا کے سرکردہ افراد میرے حاضری ہیں۔“ بیکر نے جس بھرے لہجے میں پوچھا۔

”لیکن آپ یہ سب کیوں چاہتے ہیں۔ کیا صرف پیسے کے لئے۔۔۔ یا پھر شہرت کے لئے۔۔۔؟ یہ سب کچھ تو آپ کے پاس اس وقت بھی موجود ہیں۔“ جس بولا۔

”شہرت کے لئے۔۔۔ اور کچھ پیسے کے علاوہ میں ہارڈی کو ہارتے ہوئے بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ کہ وہ اس ٹھیل کے لئے تامل ہونے کے باوجود ایک ایسے اعزاز کو ہتھیائے

ہوئے بیٹھا ہے۔ جس کا حق دار وہ نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ تمہیں یا پھر نیو یارک کی کروڑوں پرستش خواہ کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ ہارڈی کی پشت پناہی انڈیا اور ملڈا کی سب سے بڑی تنظیم مافیا کر رہی ہے۔ اس کے سربراہ کا اصل نام کوئی نہیں جانتا۔ فرضی نام انکل ٹونو ہے۔

وہ ہر سال کروڑوں روپے کے جوئے کا اہتمام کرتا ہے۔ باکسنگ کے موجودہ ٹھیل پر۔۔۔ نیو یارک میں باکسنگ کے ٹھیل کے شائقین کی تعداد کو شمار کرنا ناممکن ہے۔ تم خواہ اندازہ کر سکتے ہو۔ کہ جوئے کی اہمیت ان دنوں کتنی بڑھ جاتی ہوگی۔ لیکن اس جوئے میں جیت انکل ٹونو کے منظور نظر کی ہوتی ہے۔ اگر آج ہارڈی ڈوم ہے۔ تو کل سونی مارے بھی ہو سکتا ہے۔ اور کل اگر سونی مارے ہے۔ تو پرسوں کوئی بھی لپا لنگ ہو سکتا ہے۔ نیز نے خیال کے مطابق اسپورٹس جیسے صاف شفاف شعبے کو گندہ کرنے والی جیستی صرف اور صرف انکل ٹونو کی ہے۔ میں اسے تباہ ہوتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے دماغ میں سوال ابھرے گا۔۔۔ بھلا کیسے۔۔۔؟ تو پوچھتے بغیر بتائے دیتا ہوں۔ انکل ٹونو جیسی چالاک اور صاحب حیثیت شخصیت کسی بھی جانور پر پیہر لگانے سے گریز کرے گی۔ ظاہر ہے وہ ملڈا کے مد مقابل پر پیہر لگانے کا۔ لیکن اس دفعہ ملڈا کے مد مقابل کی بار ہوگی اور یوں اسے ہارتے ہوئے دیکھ کر مجھے دلی سکون محسوس ہوگا۔ وہی بات مقابلے کے اہتمام کی۔۔۔ تو اہتمام کرنا میرے لئے مشکل نہیں ہے۔ لیکن جیسے میں پہلے بتا چکا ہوں۔ اس سے پہلے کچھ مراحل سے گزرتا ہوگا۔ ویسے بھی ہمارے پاس ابھی کافی وقت پڑا ہے۔ باکسنگ کے بڑے مقابلے میں تقریباً ایک سال باقی ہے۔“

”ہم دونوں تیار ہیں۔“ بیکر اور جعفر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر اب میری ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اس معاملے کو مکمل طور پر رازداری کے ساتھ سرانجام دینا ہے۔ اپنے معمولات زندگی میں فرق نہیں آنے

کے۔ میں جو ایکٹ کر رہا ہوں۔ وہ کچھ دنوں تک لڑتے رہو۔ لیکن جب بھی میں بلاؤں گا تب تمام کام چھوڑ کر چلے آنا۔ سب سے پہلے ہمیں لاسٹنس کے اصول کی کوشش کرنی ہوگی۔ یہ معمولی مرحلہ ہے۔ میں کوئی کرل بیوش کو اس بات پر آمادہ کر لوں گا کہ وہ ہمیں جانور سے متعلق لاسٹنس دے دے۔ بصورت دیگر جانور رنگ کے اندر لانا ممکن نہیں ہوگا۔“ جعفر اور بیکر نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کر کمرے سے باہر کی جانب چل دیے۔

وہ تمام رات جعفر اور بیکر نے منصوبے کے تحت پہلوؤں پر سوچتے ہوئے گزار دی۔ جعفر کا کہنا تھا کہ منصوبہ بے کار ہے۔ ایک جانور کسی ٹڈل ویٹ چمپئن شپ کا اعزاز رکھنے والے انسان سے کیونکر لڑ سکتا ہے۔ وہ تو سرکس میں ایکٹ کرنے والا معصوم جانور ہے۔ اگر خدا داد صلاحیتوں کا حامل ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کسی تربیت یافتہ انسان کو ہرا کر ٹڈل ویٹ چمپئن شپ کا اعزاز چمپئن سکے۔ کچھ ایسی ہی سوچ بیکر کی بھی تھی۔ وہ تیس سال تک باکسنگ کے شعبے سے منسلک رہ چکا تھا۔ تیس سال میں سے پندرہ سال چمپئن شپ کا اعزاز اس کے ہمراہ رہا تھا اور وہ باہر تھا اس کے لئے اسے کتنی سخت جدوجہد کرنا پڑنی تھی۔ کیا ایک جانور ایسی جدوجہد کا تحمل ہو سکتا ہے۔ ناممکن۔۔۔؟ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ وہ یہ جو اکیلے کر دیکھنا چاہتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ جس کی واقفیت کچھ اور رنگ لا دکھائی۔ اس لئے بیکر نے آنکھیں موٹی لیں۔

دوسرے دن جعفر کو گھر والوں کی جانب سے خط موصول ہوا۔ جس میں دل دہلا دینے والی خبر موجود تھی۔ اریانے خودکشی کر لی تھی۔ جعفر نے بیکر کے ہمراہ لوئی ٹاؤن کا رخ کیا۔ لوئی ٹاؤن کے بچے بچے کی زبان پر جو کہانی رقص کر رہی تھی۔ اس کہانی کا سین جعفر تھا۔ تمام لوئی ٹاؤن ان دونوں کی محبت سے آشنا تھا۔ اور وہ ماریا کی خودکشی کو جعفر کے ساتھ منسلک کر رہے تھے۔ کچھ

ایسی ہی بہر کیف جب جعفر تعزیت کے لئے آیا کہ گھر گیا۔ تب اسے باتوں کے درمیان ایک عجیب بات معلوم ہوئی۔ ماریانے خودکشی کرنے سے پہلے خطوں کا مختصر پلندہ جعفر کے نام چھوڑا تھا۔ جولاک کے ذریعے بند کیا گیا تھا۔ جعفر کا تانا اپنی لڑکی کی موت کے بعد اب اپنے کپے پر شرمندہ تھا۔ اور لڑکی کی آخری خواہش کو اہمیت دینے کے لئے تیار تھا۔ یہ خط انہیں ڈاک کے ذریعے موصول ہوئے تھے۔ جعفر نے خطوں کا پلندہ اٹھایا۔ اور اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے بے تابی کے ساتھ پارسل کو کھولا۔ اور خطوں کو نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ تقریباً پندرہ کے قریب خطوں میں اس کے علاوہ اور کوئی بات لکھی نہیں دکھائی دی کہ اس کے اپنے شوہر کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہیں۔ اور وہ اس پر بے تحاشا تشدد کر رہا ہے۔ لیکن سولہویں خط میں ایک ایسی بات موجود تھی۔ جس نے جعفر جو چونکا کر رکھ دیا۔ وہ انکل ٹونو کا نام تھا۔ جعفر نے خط علیحدہ کیا۔ اور باقی خطوں کو احتیاط کے ساتھ پارسل میں رکھنے کے بعد خط کا مطالعہ شروع کیا۔ لکھا تھا۔

میرے محبوب: آج کا خط شاید میرا آخری خط ہوگا۔ یہ تمام خط تمہیں ارسال کرنا ممکن نہیں ہیں۔ کسی نہ کسی طور تمہیں پہنچانے کی کوشش کروں گی۔ جنید کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا اصرار ہے کہ میں غلط قسم کے لوگوں سے تعلقات استوار کرنا سیکھوں۔ مختصر کپڑے، شراب نوشی اور عیارانہ طبیعت۔۔۔ یہ سب کچھ میرے اختیار سے باہر ہے۔ روزانہ کے لڑائی جھگڑوں سے میں تنگ آ چکی ہوں۔ لیکن ابو کے غلط فیصلے کا کوئی بھی حل میرے دماغ میں موجود نہیں ہے اور مسئلہ کو بھٹکانا میرے اختیار سے باہر ہے۔ شاید مجھے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ کچھ دنوں سے جنید میرے ساتھ نرم سلوک روا رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے اس کے رویے میں سازش کی بو آتی محسوس ہو رہی ہے۔ اس کا رویہ مشکوک ہے۔ وہ گتھوں کسی پر اسرار شخص کے ساتھ

فون پر بات چیت کرتا رہتا ہے۔ میں نے سننے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ زیادہ نہ سمجھ پائی۔ سوائے اس کے کہ وہ فون پر موجود شخص کو پاس کہہ کر پکارا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے ایک دفعہ انگل فون کہہ کر بھی مخاطب کیا تھا۔ نہ جانے یہ انگل فون کون ہے؟ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میری زندگی کا خوشوار ترین لمحہ رات کا وہ پہر ہوتا ہے۔ جس میں..... میں تمہیں خط لکھتی ہوں۔ اس کے علاوہ تمام دن بچ کر رہتا ہوتا ہے۔

یہاں تک پہنچ کر خط بند ہو گیا۔ پھر جب دوبارہ شروع کیا گیا۔ تب لکھا تھا۔ رات گیارہ بجے جب جنید کمرے میں داخل ہوا۔ تب مکمل طور پر شراب کے نشے میں دھت تھا۔ اس کے ہمراہ ایک لمبے چوڑے قد و قامت کا شخص بھی موجود تھا۔ جس کے چہرے پر خباثت ثبت تھی۔ جنید نے اس کا تعارف انگل فون کے نام سے کر دیا۔ انگل فون نے ہوس بھری نگاہوں سے میرے سر اپنے کا جائزہ لیا۔ اور جنید کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ میں کچھ کچھ معالے کی تہہ تک پہنچ چکی تھی۔ اس لئے میں نے بھی جنید کے ہمراہ کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن جنید نے دھکا دے کر مجھے کمرے کے درمیان میں انگل فون کی جانب دھکیل کر دروازے کو جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا۔ میں جیتنی چلائی دوبارہ دروازے کی جانب لپکی۔ لیکن انگل فون نے باز کی مانند جھپٹ کر مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ تمام رات مجھ پر کیے گزری۔ میں بتا نہیں سکتی۔ لیکن گھر پہنچنے ہی میں نے پہلا کام تمہیں خط لکھ کر پورا کیا۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا کروں گی۔ شاید زندگی کا خاتمہ..... زندہ رہ کر اب میں نے کرنا بھی کیا ہے۔ لیکن اتنی دعا ضرور کرتی ہوں کہ خدا تمہیں خیر و عافیت کے ساتھ رکھے۔ اور اگر مجھے دوبارہ زندگی نصیب ہو..... تب خدا مجھے تمہارے ساتھ نصیب کرے۔

خط ختم ہو گیا۔ جعفر کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑا۔ وہ عینے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ ماریا پر گزرنے والے حالات وہ یکسر

ناواقف رہا تھا۔ انگل فون کی گھٹاؤنی سازش اس سے مارخ پر گہرے تاثر چھوڑتی جا رہی تھی۔ اسے اس کی شخصیت سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اور غصے کی شدت سے اس کے ہاتھوں کی منھنیاں چمکی چلی گئیں۔ پھر اسے نیکر کا خیال آیا۔ وہ یقیناً باہر اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ جعفر اچھل کر بستر سے نیچے اتر آیا اور ہاتھ روم کی جانب چل دیا۔

دوسرے دن وہ دونوں دوبارہ جون میری سرکس پہنچ گئے۔ ان دونوں کی غیر موجودگی کے دوران پاکستاننگ کے ایکٹ کو قوتی طور پر بند کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ نیکر کی عدم موجودگی کے دوران مغلڈا پاکستاننگ کرنے سے صاف انکار کر دیتا تھا۔ نیکر اس کا استاد تھا۔ اور معصوم جانور اپنے استاد کے اشاروں پر ناچ کر گھر محسوس کرتا تھا۔ بہر حال شام کو نیکر اور جعفر کو پچیس کا فون موصول ہوا۔ اس نے دوسرے دن جعفر اور نیکر کو اپنے آفس میں آنے کی دعوت دی۔ اور خوشخبری بھی سنائی کہ دونوں کی غیر حاضری کے دوران اس نے وزیر اسپورٹس سے بتلی نیکر کے لئے لائسنس حاصل کر لیا ہے۔ اب صرف لائسنس پر نیکر کے دستخط بقایا رہ گئے تھے۔ دوسرے دن نیکر اور جعفر نے اس کے آفس کا رخ کیا۔ لائسنس پر دستخط کئے۔ اور استنبہا میرے نگاہوں سے جیس کی جانب دیکھنے لگے۔

”ابھی تک بہت سے مراحل باقی ہیں۔“ وہ بولا۔ ”تمہیں قانونی طور پر لائسنس دلوانا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ تمہارا حق تھا۔ لیکن جانور کو لائسنس دلوانا نہایت مشکل عمل ثابت ہوگا۔ بہر حال جانور کی مقبولیت کے لئے میں نے ذمہ داری کی ہے۔ پچوں کی مختصر ٹیلی فلم کے لئے اس نے ٹکڑو کو سانس کرنے کی حای بھری ہے۔ اب تم دونوں کے لئے پیسوں کی ریل چل شروع ہونے والی ہے۔ لیکن اس بات کو بھول نہیں جانا کہ ہمارا مقصد ہارڈی کو شکست دینا ہے۔ اور ہارڈی کے سربراہ کا نام انگل فون ہے۔“ جعفر کی آنکھیں غصے کی بدولت سرخ

پڑنے لگیں۔ وہ پھینکارتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”انگل فون تو مجھے کہاں مل سکتا ہے۔ میرا اور اس کا معاملہ ذاتی حدود کو تقریباً پھیلا گ چکا ہے۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے مارنا چاہتا ہوں۔“ جیس نے حیرت بھری نگاہوں سے جعفر کی جانب دیکھا۔ پھر بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اس نے تمہارے گھرانے کی کسی لڑکی کے ساتھ زیادتی کی ہوگی۔ وہ لڑکیوں کا رسیا ہے۔ میری اور اس کی دشمنی بھی اس حد تک محدود ہے کہ اس نے میری ہونے والی بیوی کو بیچ شہر سے انوا کر لیا۔ دوسرے دن اس کی لاش کوڑے کے ذم سے اس طرح ملی کہ اس کے تمام جسم کو سگریٹوں کے ساتھ داغا گیا تھا۔ بعد ازاں عزت لوٹنے کے بعد کوڑے کے ذم میں پھینک دیا گیا۔ اگر بات ایسی ہی ہے تو تم فکر نہیں کرو۔ میں ہر لحاظ سے تمہارے ساتھ ہوں۔ اب ہم تینوں کا مقصد اسے کیفر کر داری تک پہنچانا ہوگا۔“ جعفر نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ماریا کی داستان بیان کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال کے تاثرات ابھرنے لگے۔ چہرہ خون کی گردش کی بدولت سرخ ہونے لگا۔ اور ہاتھوں کی منھنیاں پھٹ گئیں۔ اس کی کہانی سننے کے بعد جیس نے اسے دلاسا دیا۔ پھر بولا۔

”میرے اعزازے کے مطابق جنید یقیناً انگل فون کے پوشیدہ وجود سے واقفیت رکھتا ہوگا۔ لیکن ہمیں اسے چھیڑنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ ہم پہلے ہارڈی کو شکست دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ جو بھی ٹڈل دیٹ جیمپن کا اعزاز حاصل کرے گا۔ انگل فون اسے خریدنے کی پوری کوشش کرے گا۔ چاہے وہ جانور ہی کیوں نہ ہو۔ ہم تھوڑی سی شد و مد کے بعد مغلڈا کو اس کے ہاتھوں فروخت کر دیں گے۔ بعد ازاں چھپا کر کے اس کے ٹھکانے کا پتا لگانے کی کوشش کریں گے۔“ جیس خاموش ہو گیا۔

تب نیکر بولا۔ ”اور ذمہ داری کی ٹیلی فلم کی کیا کہانی ہے؟“

ہے۔ میں نے اپنے مختصر تیلی فلم کی وہ کہانی سنائی۔ جو کچھ عرصہ قبل میں نے لکھنی شروع کی تھی۔ یہاں یہ بھی بتانا چلوں کہ میں کافی طویل عرصے سے ذمہ داری کے لئے لکھتا چلا آ رہا ہوں۔ لیکن بچوں کے لئے پہلی دفع لکھ رہا ہوں۔ وجہ صرف مغلڈا کو مقبولیت دلوانا ہے۔ ہارڈی کے ساتھ مقابلے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے عوام میں..... خاص کر بچوں میں کچھ نہ کچھ مقبولیت حاصل ہو۔ میں بچوں کی ٹیلی فلم پر کام کر رہا ہوں۔ ایک ہفتے کے بعد شوٹنگ متوقع ہوگی اور امید کرتا ہوں کہ تقریباً دو مہینے کے بعد ٹیلی فلم ریلیز کر دی جائے گی۔“ بتلی نیکر اور جعفر نے اثبات میں سر ہلایا۔

ایک ہفتے کے بعد جیس نے بتلی نیکر اور جعفر کے ہمراہ اسپورٹس کے وزیر کرنل جیوش سے ملاقات ہوئی۔ مدعا سننے کے بعد کرنل انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں..... میں تم لوگوں کے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ کاش میں تمہارے کسی کام آ سکتا۔ لیکن اس سلسلے میں میرا جواب صرف نہیں ہوگا۔“

”معتقول بات ہے۔“ جیس سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تم ہمیں انکار کی وجہ بتاؤ گے اگر وجہ معتقول ہوگی تو ہم اصرار نہیں کریں گے۔“

کرنل بری طرح چونکا۔ ”وجہ..... کیا مطلب.....؟“

جیس طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”تاکہ میں نیویارک ٹائمز کے پچیس لاکھ قارئین کے سامنے اس فائنٹ کے سلسلے میں تمہارا نقطہ نظر پیش کر سکوں۔ میرے قارئین مفت خوراک فٹڈ کے معاملے میں بہت حساس ہیں۔ اور میں اپنے خصوصی ایڈیشن میں اس فائنٹ کے سلسلے میں تمہارا نقطہ نظر پیش کر کے انہیں تمہارے خلاف کروں گا۔“

”وجہ..... وجہ.....“ کرنل بوڑھایا۔ پھر چونک کر بولا۔ ”ہاں پاکستان کے قوانین و ضوابط.....“

”میں بھی جانتا ہوں کہ ریاست نیویارک میں قوانین کے قوانین و ضوابط کیا ہیں؟“ جیس بولا۔ ”بلکہ

جعفر اسے تلاش کرو۔ ”ورنہ سب کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔“

دوسری جانب بیلی بیکر کے اغوا کا منصوبہ اس خوبصورتی سے بنایا گیا کہ وہ خود بھی اسے بے اختیار نہ رہ سکا۔ وہ ایک زبردستان کے قریب سے گزرا۔ کار کے پاس دو مرد اور پرکشش لڑکی گھنگو میں مصروف تھے۔ بیکر کو دیکھتے ہی وہ تینوں اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

”ہیلو جیک.....“ ایک مرد نے اسے مخاطب کیا۔ ”تم یہاں کب آئے؟“

”اوہ جیک ڈارلنگ.....“ لڑکی بے حد خوش ہو کر چینی اور بیکر سے لپٹ گئی۔ بیکر کا خیال تھا کہ وہ لوگ کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ کچھ کہنے والا تھا کہ کسی نے اس کی ہپ پاکٹ سے ہسٹول نکال کر اس کی کمر سے لگا دیا۔

”مسکراتے رہو دوست.....“ اس کے کانوں میں آواز سنائی دی۔ ”صرف ہم ہی تمہیں دیکھ کر خوش نہیں ہوئے ہیں۔ تم بھی خوش ہوئے ہو۔ لہذا تمہیں بھی اظہار مسرت کرنا چاہئے۔ خاموشی کے ساتھ کار میں بیٹھ جاؤ۔ ہم تمہیں یہاں کے قابل دید مقامات کی سیر کروائیں گے۔“ بیکر نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسے اغوا کیا جا رہا ہے۔ سڑک پر ٹریفک کی ریل جلی تھی۔ فٹ پاتھ پر لوگ کثرت سے آ جا رہے تھے۔ قریب ہی ایک ٹریفک کانٹیلن کھڑا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس کو کوشش کو با آسانی ناکام بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن پیچھے کھڑے شخص نے یہ بات بھانپ لی۔

”تمہیں دوست..... ایسا نہ کرنا۔ ورنہ سیدھے مردہ خانے پہنچ جاؤ گے۔“ زندگی بیلی بیکر کو بھی بہت عزیز تھی۔ چنانچہ وہ کار میں بیٹھ گیا۔ راپور والا اس کے ہمراہ اگلی سیٹ پر بیٹھا۔ لڑکی ڈرائیور کے ساتھ تھی۔ کار آگے بڑھی۔ لیکن رفتار بہت کم تھی۔ جیسے انہیں کوئی جلدی نہ ہو۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ لوگ تفریح کی غرض سے نکلے ہوں۔ پولیس افسر کے قریب سے کار گزری تو لڑکی

نے اس کی جانب ایک مسکراہٹ اچھال دی۔ اور ہاتھ لہرانے لگی۔ بیکر کو یقین ہو گیا کہ وہ لوگ اسے ٹھکانے لگانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔

”تم لوگ چاہتے کیا ہو؟“

”صرف تمہاری رقابت میرے دوست..... اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے.....“ ہسٹول والے نے جواب دیا۔

”اور اگر میں مدد کے لئے چیتا..... تو تم کیا کرتے۔“

”تمہیں گولی مار کر مردہ خانے پہنچا دیں۔“ جواب ملا۔ بیکر خاموش ہو گیا۔ وہ یقیناً ایسا کر سکتے تھے۔ اسے زیادہ ٹریفک میں ان کی کار کا پتا بھی نہیں چلتا۔ کار سیکنڈ بلاک تک ہائی دے پر چلتی رہی۔ پھر انہوں نے ایک سائیڈ اسٹریٹ میں موڑ کر گاڑی روک دی۔ کھڑکیوں کے شیشے چڑھا دیے گئے۔ کافی دیر تک خاموشی رہی۔ ٹھیک گیارہ بجے لڑکی نے ریڈیو آن کروایا۔ ریڈیو پر مردانہ آواز ابھری۔ لہجے میں سنسنی تھی۔

”ہاں وہ آرہے ہیں۔ مغلڈا جھوٹی جھوٹی جتھیں لگا کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ جعفر اور جیس بھی ہیں۔ لیکن بیکر نظر نہیں آ رہا۔ شاید وہ پیچھے رہ گیا ہے۔ زولو پہلے ہی رنگ میں موجود تھا۔ وہ تھوک رہا ہے۔ ارے..... یہ کیا..... یقیناً کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ مغلڈا آگے بڑھنے کے لئے تیار نہیں..... جعفر اس کی زنجیر کھینچ رہا ہے۔ لیکن مغلڈا الجھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہے۔ اسے شاید کسی کی تلاش ہے۔“

”اوہ..... وہ بے چارا مجھے تلاش کر رہا ہے۔“ بیکر دھکی لہجے میں بولا۔

”ٹھیک سمجھ۔“ ڈرائیور بولا۔

جانب دیکھ رہا ہے۔ اس کے دونوں ساتھی اسے دستانے پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن انہیں دشواری پیش آ رہی ہے۔ وہ اسے سمجھتا رہے ہیں۔ چکارہ ہے ہیں۔ لیکن مغلڈا بری طرح جھل رہا ہے۔ شاید بیکر کے نہ ہونے کی وجہ سے..... ایک منٹ..... میں ذرا دیکھ لوں..... جی ہاں جعفر کا کہنا ہے کہ مغلڈا ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔ بیکر بیمار ہو گیا ہے۔“

”بیمار ہو گیا ہے۔ لغت ہو تم پر.....“ بیکر غرایا۔

”وہ میرے بغیر نہیں لڑے گا۔“

”ہمارا بھی یہی خیال تھا۔“ ہسٹول والے نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

اناؤنسر کی آواز سنائی دی۔ ”مغلڈا کو دستانے پہنا دیے گئے ہیں۔ ریفری دونوں پاکسروں کو آخری ہدایات دینے کے لئے رنگ کے درمیان میں بلا رہا ہے۔ کمال ہے مغلڈا وہاں جانے پر آمادہ نہیں ہے۔ اسے مجبور کیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر وہ ہمیشہ اپنے حریف کو کس کرتا ہے۔ لیکن آج اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ پریشان ہے۔ آرزو ہے.....“

”تم پر اہت ہو۔ مجھے جانے دو۔“ بیکر گڑبڑا۔

”شٹ اپ“ لڑکی نے ڈانٹا۔ اور ریڈیو کی آواز بڑھا دی۔

”وہ اپنے کارز میں واپس آ چکے ہیں۔ لہجے گھنٹی بجی۔ زولو رنگ کے درمیان میں آ گیا ہے۔ لیکن مغلڈا اپنے کارز میں کھڑا ہے۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہا ہے۔ شاید بیکر کو تلاش کر رہا ہے۔ زولو اس کی جانب بڑھا۔ مغلڈا کے ہاتھ جھکے ہوئے ہیں۔ وہ لڑنا نہیں چاہتا ہے۔ ممکن ہے مغلڈا نے گھنٹی کی آواز نہ سنی ہو۔“

بیکر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں جانتا تھا یہی ہوگا۔“

اناؤنسر بولا۔ ”ریفری نے زولو کو اشارہ کیا۔ کہ وہ مغلڈا پر گھونے برائے۔ لیکن مغلڈا اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ رسیوں پر ہیں۔ وہ اچھل

اچھل کر چاروں جانب دیکھ رہا ہے۔ یقیناً وہ بیکر کے لئے بے تاب ہے۔ زولو کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کہ وہ کیا کرے۔ مغلڈا اسے نظر انداز کر رہا ہے۔ زولو ایکشن میں آگے بڑھا۔ لیکن مغلڈا اچھے ہٹ کر اس سے دور ہو گیا ہے۔ تماشائیوں میں بے چینی کی لہر دوڑنے لگی ہے۔ آپ شور مچ رہے ہیں۔ مغلڈا کے کارز کی جانب سے جیس اور جعفر اسے اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ لڑے۔ لیکن مغلڈا انہیں نظر انداز کر رہا ہے۔ اب مغلڈا ہاتھوں اور پیروں پر بیٹھ گیا ہے۔ اور تماشائیوں کے درمیان جھانک رہا ہے۔

”میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔“ بیکر روہانسا ہو کر بولا۔ اور دونوں ہاتھوں سے کانوں کو بند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”تمہیں دوست۔ بس تھوڑی دیر اور برداشت کرو۔“ ہسٹول والے نے سرد لہجے میں تنبیہ کی۔

اناؤنسر کی آواز آ رہی تھی۔

”کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ چار پاؤں پر بیٹھا ہوا مغلڈا ایک حقیر کنگرو دکھائی دے رہا ہے۔ گھنٹی کا سوال ہی نہیں..... کیونکہ زولو ابھی تک اسے ہاتھ نہیں لگا پایا۔ تماشائی احتجاج کر رہے ہیں۔ اب ہونٹ شروع ہوئی ہے۔ ریفری دوبارہ مغلڈا کی جانب بڑھ رہا ہے۔ میرا خیال ہے وہ مغلڈا کو نا اہل قرار دینے والا ہے۔ جی ہاں..... وہ اعلان کرنے والا ہے۔ اوہ..... اوہ.....“

”اچانک اناؤنسر کی بیجان سے بھری آواز ابھری۔“ ارے..... زولو..... پیچھے گر گیا۔ مغلڈا دوسری جانب جا رہا تھا کہ زولو اچانک درمیان میں آ گیا۔ مغلڈا نے اس کی جانب دیکھے بغیر ہاتھ گھمایا۔ جی ہاں..... وہ یقیناً رائٹ کپ تھا۔ جو زولو کے چہرے پر لگا۔ اور زولو پیچھے گر گیا۔ سٹیں..... تماشائی چیخ رہے ہیں..... داوے رہے ہیں۔ ریفری گھنٹی مچ رہا ہے۔ لیکن زولو ساکت ہے۔ آٹھ..... نو..... دس اور زپ..... میرا خیال ہے کہ مغلڈا اداکاری کر رہا تھا۔ اسے بیکر کی تلاش نہیں تھی۔ وہ صرف مناسب اوپننگ کی

تلاش میں تھا۔ زولو جال میں آ گیا۔ اور وہ پرفیکٹ راسٹ تھا۔ زولو اب بھی ساکت بیڑا ہے۔ تالیوں کی آواز آپ بن رہے ہوں گے۔" داعی وہاں تالیوں کی آواز کے علاوہ اب اور کوئی آواز نہیں سنی۔

بیکر خوشی سے جیچ اٹھا۔ "وہ یقیناً راستے میں آیا ہوگا۔ مغلڈا کا موڈ خراب ہو۔ تو وہ یقیناً ایسا ہی خوفناک ہو جاتا ہے۔"

اناؤنسر بول رہا تھا۔ "مغلڈا جانور نہیں بلکہ مانوق الفطرت ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس میں ڈومبا ویوتا کی روح حلول کر چکی ہے۔ اور اب وہ ناقابل تسخیر ہو چکا ہے۔"

لڑکی نے ریڈیو کا بٹن بند کر دیا۔ پھر اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولی۔ "گاڑی کا دروازہ کھولو۔ اور اسے باہر وکیل دو۔ اسکیم ناکام ہو گئی ہے۔" پستول والے نے سر اثبات میں ہلایا اور دروازہ کھول کر بیکر کو باہر دھکیل دیا۔ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی کارور جا چکی تھی۔ وہ جیسمن ہال سے تقریباً تمام چار بلاک دور تھا۔ اس سرک سے اٹھنے ہی ہال کی جانب دوڑ لگا دی۔

لوگ مغلڈا کی نئی سکت عملی اور بد قسمت زولو کے عجیب و غریب ناک آؤٹ ہونے پر تھمرے کر رہے تھے۔ جعفر، جیس اور مغلڈا ابھی تک رنگ میں موجود تھے۔ بیکر ہانپتا ہوا رنگ میں داخل ہوا۔ تب ایک دلگداز منظور کھینچے میں آیا۔ مغلڈا نے بیکر کو بے تابانہ انداز میں اپنی باتوں میں جکڑ لیا۔ اور پیار کرنے لگا۔ اس کے حلق سے "اوک اوک" کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ محبت کا وہ عجیب و غریب اور پراثر مظاہرہ دیکھ کر بیشتر تماشاویوں کی آنکھیں پلمک گئیں۔ اس بار بریس نے اس خبر کو نمایاں جگہ دی۔ لیکن اندر کہانی صرف جیس کے کالم میں چھپی۔

جعفر نے اسے فون پر بیکر کے اغوا کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ واردات میں ملوث دونوں افراد پکڑے نہیں جاسکے۔ زرو سیڈن اپوری کی ثابت ہوئی۔ جیس کا کہنا تھا کہ اس واردات کے پیچھے یقیناً اگلے نوٹو کا ہاتھ موجود رہا ہوگا۔ لیکن بات عقل سے بالا تھی کہ کچھ دن پہلے

اس نے مغلڈا کو بائنگ لڑنے کا لائسنس دلوانے کی کوشش میں مدد کی۔ لیکن اب اس مقابلے کے دوران اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ مزید اور بہت صرف ہارڈی ڈومس۔ جسے مقابلہ روکنے میں دلچسپی ہو سکتی تھی۔ مکمل ثبوت نہ ہونے کی بدولت کچھ کہتا ممکن نہیں تھا۔ بہر کیف مغلڈا اچلی سیرجی بیکر دھو بیڑا چھ گیا تھا۔ اب صرف دو مزید سیرجیاں باقی تھیں۔ پھر وہ یقیناً عالمی چیمپیئن شپ جیت لیتا۔ لیکن دوسرے دن جب بیکر اور جعفر نے اس وسیع و عریض مصلیٰ کا رخ کیا۔ جہاں مغلڈا رہائش پذیر تھا۔ تب انہیں اپنے ہاتھوں کے طوطے اڑتے محسوس ہوئے۔ مصلیٰ خالی تھا۔ مغلڈا وہاں موجود نہیں تھا۔ رات کے کسی پہر اسے اغوا کر لیا گیا تھا۔ جعفر اور بیکر نے جیس کو فون کیا۔ جیس نے دونوں کو اپنے دفتر آنے کا حکم دیا۔ دونوں نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ ہی دیر میں دفتر پہنچ گئے۔ ان کے چہرہ پر ہوا نیاں اڑ رہی تھیں اور شکل پر پریشانی کے تاثرات ثبت تھے۔ جیس نے انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر پانی کا گلاس ان کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"مکمل رکھو۔ کچھ نہیں ہوگا۔ پریشان ہونے سے معاملہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ پانی پیو اور مجھے تفصیل سے آگاہ کرو۔" دونوں نے ایک ہی کھونٹ میں پانی پی لیا۔ پھر بیکر بولا۔

"وہ مصلیٰ میں موجود نہیں ہے۔ کل رات کو تھا۔ لیکن آج صبح جب ہم نے مصلیٰ کا دروازہ کھولا۔ تب وہ اندر نہیں تھا۔ مصلیٰ کا دروازہ لاک نہیں تھا کیونکہ باہر چوکیدار موجود رہتا ہے۔" جیس نے بات درمیان میں کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"اور چوکیدار اس وقت کہاں ہے؟"

"معلوم نہیں۔" بیکر نے نفی میں سر ہلایا۔

"لیکن مصلیٰ سے باہر نہیں تھا۔ ہمیشہ باہر ہی ہوتا ہے۔"

"مصلیٰ کا نام بتاؤ۔"

"ریانسز کا مصلیٰ۔" بیکر نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔" جیس بولا۔ "آؤ ذرا ریانسز کے مصلیٰ کا چکر لگا آئیں۔ دیکھیں چوکیدار کیا کہتا ہے۔" بیکر اور جعفر نے اثبات میں سر ہلایا اور کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ریانسز کے مصلیٰ کے باہر چوکیدار موجود نہیں تھا۔ لیکن اب دروازہ اندر سے بند تھا۔ ٹھٹھکانے پر مصلیٰ کے مالک ریانسز نے دروازہ کھولا۔ بیکر اور جعفر کو دیکھتے ہی وہ پریشان لہجے میں بولا۔

"تم دونوں کہاں تھے؟ مصلیٰ میں مغلڈا موجود نہیں ہے۔ چوکیدار بھی غائب ہے۔ لیکن ابھی کچھ دیر پہلے تم دونوں کے نام یہ خط موصول ہوا ہے۔ یہی دینے کے لئے جب میں نے مصلیٰ کا رخ کیا۔ تب میں نے مغلڈا کو غائب پایا۔ جیس نے آگے بڑھ کر خط کا لٹاف اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ پھر سرد لہجے میں بولا۔

"لٹافے پر ڈاک کا ٹکٹ موجود نہیں ہے۔ یہ جہنم کیسے موصول ہوا۔" مصلیٰ کا مالک گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"جناب۔۔۔۔۔۔ مصلیٰ سے ملحق میرا آفس ہے۔ صبح جب میں نے آفس کھولنے کے لئے سیرجیوں کا رخ کیا۔ تب یہ سیرجیوں کے پاس پڑا تھا۔ اوپر ان دونوں کا نام لکھا تھا۔ اس لئے میں نے انہیں دینے کے لئے۔۔۔۔۔۔" جیس نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ پھر لٹافے کا معائنہ کرنا شروع کر دیا۔ اوپر بیکر اور جعفر کا نام لکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے اوپر اور کسی قسم کی تحریر موجود نہیں تھی۔ جیس نے لٹافے کو چاک کیا۔ اور اندر موجود کاغذ کے ٹکڑے کو باہر نکال لیا۔ اس پر پھر تحریر موجود تھی۔ لکھا تھا۔

"مغلڈا ہمارے قفسے میں ہے۔ جانور کی دستیابی کے لئے آپ کو دس لاکھ ڈالر کی رقم کا انتظام کرنا ہوگا۔ یہ رقم تحویل میں ڈال کر آج رات بارہ بجے سوئی لائن میں بننے والے کٹر لائن میں رکھ دیتا۔ ہم وہاں سے وصول کر لیں گے۔ آپ یقیناً جان گئے ہوں گے کہ اس کنز

خان میں داخل ہونے اور باہر نکلنے کے راستے بے تحاشا ہیں۔ اس لئے ہمیں ٹرپ کرنے کی کوشش نہیں کیجئے گا۔۔۔۔۔۔ بصورت دیگر جانور ٹکڑوں کی صورت میں آپ کو وصول ہوگا۔"

خط ختم ہو گیا۔ جیس نے خط کو تہہ کرنے جب کے اندر رکھا۔ پھر ریانسز سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ "مصلیٰ کے چوکیدار کا ایڈریس بتاؤ۔ اور کاہ۔ اعتباری آدی تھا۔۔۔۔۔۔ یا نہیں۔۔۔۔۔۔" ریانسز بولا۔

"اسے یہاں کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ شاید دو مہینے یا پھر تین۔۔۔۔۔۔ مجھے صحیح طرح یاد نہیں ہے۔ میں ایڈریس بتائے دیتا ہوں۔" اس نے مصلیٰ سے کچھ فاصلے پر واقع رہائشی آبادی کا ایڈریس بتا دیا۔ "جیس نے اثبات میں سر ہلایا اور چوکیدار کے گھر کی جانب چل دیا۔ بیکر اور جعفر اس کے ہمراہ تھے۔ مصلیٰ سے باہر نکلنے کے بعد جعفر پریشان لہجے میں بولا۔ "اگر ہم مغلڈا تک نہ پہنچ پائے۔ تب نتیجہ کیا نکلے گا۔" جیس مسکراتے ہوئے بولا۔

"مغلڈا کی دوسری لڑائی کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ اگر فائٹ کے دوران مغلڈا دستیاب نہیں ہو سکا۔ تب عوام ہمارے سر بچاؤ دے گی۔ ہماری کنزوریوں کو سامنے رکھ کر مجرم نے منصوبہ بنایا ہے۔ اب اگر ہم مغلڈا تک نہ پہنچ پائے تب ہمیں دس لاکھ روپے کی رقم مجرم کے حوالے کرنا ہوگی۔ تاکہ مغلڈا کو رنگ تک لایا جاسکے۔" بیکر بات کاٹ کر بولا۔

"لیکن کل فائٹ کا اہتمام ہے۔ کیا ایک دن کے اندر ہم مغلڈا کو تلاش کر پائیں گے؟"

"کوشش کر سکتے ہیں۔" ورنہ فائٹ ملتوی کروانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن ایسی صورت میں مغلڈا کے نمبر کم ہو جائیں گے۔"

چوکیدار کا فلیٹ رہائشی علاقے کے درمیان میں واقع تھا۔ فلیٹ کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ لیکن تالا معمولی نوعیت کا تھا۔ جیس کی نیب میں لوہے کی مڑی ہوئی تار موجود تھی۔ اس نے جب میں سے تار باہر

نکالی۔ اور تالے کے سوراخ میں ڈال کر گھمانے لگا۔ کچھ ہی دیر میں تالا کھل گیا۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور فلیٹ کے اندر داخل ہو گئے۔ فلیٹ چھوٹا لیکن نہایت گندا اور بدبودار تھا۔ تمام سامان اور ہم پر دم بڑا تھا۔ بدبو کے علاوہ فلیٹ میں کچھ اور مخصوص بو بھی موجود تھی۔ جس نے انہیں ٹرے کو چیک کیا۔ پھر کمراتے ہوئے بولا۔ ”شاید میں مجرم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اب ہمیں کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں رقم کا بندوبست کرتا ہوں۔ تم دونوں رقم سے بھرے بیک کو کٹر لائن میں رکھ آنا۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔“ بیک اور جعفر نے حیرت بھری نگاہوں سے جیس کی جانب دیکھا۔ پھر بیک بولا۔ ”تو کیا ہم دس لاکھ ڈالر جیسی خطیر رقم یوں آسانی سے مجرم کے ہاتھوں میں تھما دیں گے۔ یہ کچھ عقلمندانہ فیصلہ نہیں ہوگا۔“

”اتھے اور برے میں تمیز کرنا مجھے آتا ہے۔ تم دونوں بس وہی کچھ کرتے جاؤ۔ جو میں کہتا ہوں۔“ بیک اور جعفر نے اثبات میں سر ہلادیا۔

رات بارہ بجے وہ دونوں سوئی لائن میں نوٹیر شدہ کٹر لائن کے وسیع و عریض جال کے سامنے موجود تھے۔ یہ تمام کٹر لائن انڈر گراؤنڈ کافی وسیع و عریض ہونے کے علاوہ جدید بھی۔ کٹر لائن کے اندر چھوٹی موٹی گلیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ بیک کو اٹھانے کے لئے مجرم کس راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ سوچنا ناممکن تھا۔ کٹر لائن نمبر پندرہ کے کھلے ہوئے مین ہول کے سامنے پہنچ کر بیک نے جیب میں سے نارچ باہر نکالی۔ اور جعفر کو بیک ہاتھوں میں تھا کر اندر اترنے کا حکم دیا۔ جعفر نے احتیاط کے ساتھ بیک کو گلے میں لٹکایا۔ اور دوسرے ہاتھ میں نارچ تھا۔ کٹر کے اندر موجود میڑھی کے ذریعے نیچے اترنے لگا۔ نیچے گھب اندھیرا تھا۔ چونکہ کنسرکشن ابھی جاری تھی۔ اس لئے کٹر میں پانی موجود نہیں تھا۔ جعفر نے نارچ کی روشنی ارد گرد ڈالنے ہوئے ماحول کا جائزہ لیا۔ کٹر لائن نمبر پندرہ کا حدود اور لمبہ کسی وسیع و عریض چوک سے کم نہیں تھا۔ یہاں مختصر گلیوں کے

سروں کا اختتام اور آغاز ہوتا تھا۔ جعفر نے دیوار کے ساتھ بیک کو رکھا اور پھرتی کے ساتھ میڑھیاں چڑھتا ہوا کٹر سے باہر نکل آیا۔ بیک اس کا منتظر تھا۔ جعفر نے نارچ اسے تھمائی اور حالات نامعلوم ہونے کا اشارہ کر کے دونوں شہر کی جانب چل دیے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر انہوں نے کپڑے تبدیل کئے۔ اور بستروں میں کس گئے۔ جیس کی ہدایات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ صبح سے پہلے اس کے ساتھ رابطہ نہ کیا جائے۔

صبح منہ اندھیرے اٹھنے کے فوراً بعد انہوں نے جیس کے آفس کا رخ کیا۔ جیس خلاف توقع آفس میں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نقش کر رہی تھی۔ جعفر اور بیک کو دیکھتے ہی وہ بولا۔

”مجھے امید ہے کہ تم دونوں کی رات اچھی گزری ہوگی۔ اگر نہیں..... تو یقیناً آج کا دن تو اچھا ہی گزرے گا۔ رات کو میسر بھلا دو۔“

”جناب آج فاسٹ کا دن ہے۔“ بیک بے چین لہجے میں بولا۔ ”کیا گزشتہ رات ملٹا دستیاب ہو پایا..... یا نہیں..... اگر ایسا ہوا ہے۔ تو ہمیں فوراً فائننگ کی تیاریاں شروع کر دینی چاہئیں۔ بصورت دیگر فائننگ کو ملتوی کر کے ملٹا کی دستیابی کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔“ بیک کے خاموش ہوتے ہی جیس ہنستے ہوئے بولا۔

”کری پر تو بیٹھ جاؤ۔ اتنی جلدی ابھی نہیں ہوتی۔ پہلے ناشتہ کرو۔ اس کے بعد گزشتہ رات کے واقعات کے متعلق تفصیل بتاؤں گا۔“ کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور چڑا اسی ناشتے کی ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ میز کے گرد بڑوں کو تر تیب دینے لگا۔ بیک اور جعفر نے ناچاہتے ہوئے بھی ناشتہ کا آغاز کر دیا۔ جیس مطمئن انداز میں ناشتہ کر رہا تھا۔ اس لئے تقریباً آدھا گھنٹہ ناشتے میں لگ گیا۔ صبح کے نو بجنے والے تھے۔ گیارہ بجے فائننگ کا آغاز ہونا تھا۔ وقت کم تھا۔ لیکن جیس کو پرواہ نہیں تھی۔ ناشتے کے بعد اس نے سگریٹ سلگایا۔ اور دھواں کمرے میں پھینک کر بولا۔

”مجھے شروع ہی سے اصطبل کے مالک ریانسز پر شک تھا۔ لیکن ثبوت کی عدم موجودگی کے باعث اسے گرفتار کرنا ناممکن نہیں تھا۔ جب میں نے تم دونوں کے ہمراہ ریانسز سے ملاقات کی۔ تب اس کے ہاتھوں میں بہت بگے برائڈ کا سگریٹ سلگنا دیکھا۔ یہ ہنگامہ ہونے کے علاوہ نایاب بھی ہے۔ ریانسز سے ملاقات کے بعد جب ہم نے چوکیدار کے فلیٹ کا رخ کیا۔ تب مختصر تلاشی کے دوران مجھے فلیٹ میں موجود انش ٹرے میں اسی برائڈ کے سگریٹ کے ٹکڑے دستیاب ہوئے۔ چوکیدار اتنا ہنگامہ اور کم یاب سگریٹ بننے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اور ریانسز ایسا کم یاب سگریٹ اسے تحفے میں بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ریانسز کا چوکیدار کے فلیٹ میں آتا جاتا تھا۔ اب تم دونوں خود سوچ سکتے ہو کہ اگر اصطبل کا مالک اصطبل کے چوکیدار کے ساتھ تعلقات قائم رکھنا چاہتا ہے۔ تو اس کے پیچھے اس کے کچھ مقاصد بھی کارفرما ہو سکتے ہیں اور ان مقاصد کا اندازہ آپ اس وقت بخوبی لگا سکتے ہیں۔ جب چوکیدار چوری میں ملوث ہو۔ ثبوت کو پختہ کرنے کے لئے میں نے تم رقم دونوں کے ہاتھوں میں تھمائی اور خود ریانسز کی نگرانی کرنے لگا۔ رات ساڑھے گیارہ بجے اس نے تم دونوں کا پیچھا کیا۔ اور میرے اندازے کے مطابق اس نے رقم سوئی لائن کی کٹر میں سے ہتھیلی۔ تب میں نے اسے گرفتار کر کے ملٹا کے متعلق پوچھ کچھ کیا۔ وہ بتانے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ لیکن کچھ تشدد کے بعد تیار ہو گیا۔ منصوبہ اس کا تیار کردہ تھا اور ملٹا ریانسز اصطبل سے کچھ دور واقع دوسرے اصطبل میں مقید تھا۔ جو اس کا ہائر کردہ تھا۔“ جیس خاموش ہو گیا۔

”لیکن اگر تمہارا اندازہ غلط ہو جاتا۔ اور مجرم ریانسز کے علاوہ کوئی اور ہوتا۔ تب تم ہاتھوں سے نکل جاتی۔“ بیک نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

”ہاں اگلے ایسا ہو سکتا تھا۔ لیکن میں رقم کے بیک میں اتنی کثیر رقم رکھنے کے لئے شروع ہی سے آمادہ نہیں تھا۔ اس لئے بیک کو خالی کاغذوں سے بھر کر تمہارے

ہاتھوں میں تھما دیا۔ کیوں کیا خیال ہے؟“ دونوں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اور اٹھ کر مقابلے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ جہاز بران کی سٹیش مخصوص تھیں۔ اور اب ملٹا کا مقابلہ واشنگٹن کے بیٹنگر کے ساتھ ہونا تھا۔

واشنگٹن کا بی بال ہال تماشاویوں سے کھینچ کھینچا ہوا تھا۔ مقابلہ شروع ہونے میں تقریباً پونچھ گھنٹہ باقی تھا کہ کراچیاک جیس کی نگاہ ایک ایسے آدمی پر پڑی۔ جسے وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا نام میکس تھا۔ وہ بیٹا ناز کے علاوہ ٹیلی ویشن پر بھی مہارت رکھتا تھا۔ باسٹنگ کے حلقے میں اس کی شہرت اچھے الفاظ میں نہیں ہوتی تھی۔ اس کا پیشہ پیسے لے کر پیشہ ور باکسر کو زپ کرنا تھا۔ یہاں بی بال ہال میں اس کی موجودگی خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔ حالاں کہ ہال میں سیکورٹی کا انتظام جدید ترین اور سخت تھا۔ لیکن میکس کو واردات کرنے کیلئے کسی قسم کے ہتھیار کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں سے تیرنگوار کا کام لیتا تھا۔ جیس نے پریشان نگاہوں سے تیرنگوار کی جانب دیکھا۔ وہ ہال کمرے سے غسٹک چھوٹے کمرے میں موجود تھا۔ جیس تیز قدموں کے ساتھ ان دونوں کی جانب چل دیا۔ بیک اور جعفر نے بھی نگاہوں سے جیس کی جانب دیکھا۔ تب جیس بولا۔

”جب تک میں واپس نہیں آتا ہوں۔ تب تک ملٹا اکو باہر نہیں نکلتا چاہئے۔ وہاں اس کے وجود کو خطرہ ہے۔ میں جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔“ جعفر اور بیک نے حیرت بھری نگاہوں سے جیس کی جانب دیکھا۔ لیکن پوچھا کچھ نہیں۔ جیس ہال کمرے سے ہوتا ہوا دروازے سے باہر نکلا۔ اور ٹیکسی پکڑ کر سترہ بی ایسٹ اسٹریٹ کی جانب چل دیا۔ یہاں ایک پیشہ ور مجرم چلو کی رہائش موجود ہے۔ جیس کی ہدایت پر ایک دفعہ اسے حوالات ہو چکی تھی۔ پھر جیس کے کہنے پر ہی اسے دوبارہ رہا کر دیا گیا تھا۔ اب وہ جیس کا مرید تھا۔ اسے مختلف اور عجیب و غریب کاموں میں مہارت حاصل تھی۔ ان میں سے ایک کام دانوں کے ذریعے

مختصر چھرا بھیگنا تھا۔ وہ اتنی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ ننھے چہرے کو سامنے کی جانب اچھالتا تھا۔ کہ انجان بندہ یقین نہیں کر پاتا تھا۔ وہ چہرہ سامنے موجود لکڑی کے دروازے میں سوراخ کر دیتا تھا۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ چہرے کو ہندوق کے ذریعے سے پھینکا گیا ہے۔ سترہ بی ایسٹ اسٹریٹ میں بنے مختصر گھروں کے درمیان چلو کا گھر موجود تھا۔ دروازہ ٹھکانے پر اس نے دروازہ کھولا۔ وہ دہلا پٹلا پنجنی شخص تھا۔ بال پتلے اور لمبے تھے۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ موجود تھا۔ اور ہونٹ مضبوطی کے ساتھ سمجھے ہونے کے باعث ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بہت تکلیف میں ہو۔ جیسے کو دیکھتے ہی اس نے گھبرا کر تمام دروازہ کھول دیا۔ اور پریشان نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

چلو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری یہاں آمد تمہارے لئے خطرے کا باعث نہیں بنتی۔ بلکہ مجھے ایک کام کے سلسلے میں تمہاری مدد درکار ہے۔ چلو نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولا۔

”اعتراف جانیے۔ ہم بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں“ تنکلفات کی ضرورت نہیں ہے۔ معاملہ بہت سمجھ میر ہے۔ تمہیں فوراً میرے ہمراہ چلنا ہوگا۔ میں گاڑی میں تمہیں حالات سے آگاہ کر دوں گا۔“ چلو نے اثبات میں سر ہلایا اور گھر کو لاک کر کے جیس کے ہمراہ سامنے موجود عیسیٰ میں بیٹھ گیا۔ عیسیٰ تیز رفتاری کے ساتھ بی بال ہال کی جانب روانہ ہو گئی۔ تب جیس سمجھ لےج میں بولا۔

”تم جانتے ہو گے کہ آج بی بال ہال میں ہنگر اور مللڈا کے درمیان مقابلہ ہونے والا ہے۔ نیویارک ٹائمز سے منسلک ہونے کی وجہ سے تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ اس مقابلے کے پیچھے میرا بھی کچھ نہ کچھ ہاتھ پایا جاتا ہے۔“ چلو نے اثبات میں سر ہلایا۔ تب جیس دوبارہ بولا۔ ”اور انڈر ورلڈ کے ساتھ وقت گزاری کی بدولت تم عیس سے بھی واقفیت رکھتے ہو گے۔“ چلو چونک کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔

”میکس بہت خطرناک اور سنگدل انسان ہے۔ میں معاملے کے متعلق کچھ کچھ اندازہ لگا چکا ہوں۔ لیکن اگر آپ روشنی ڈال دیں۔ تو بہتر ہوگا۔“ ”وہ اس وقت بی بال ہال میں موجود ہے۔“ جیس بولا۔ ”میرے دوست مللڈا کی حمایت کے لئے۔۔۔۔۔۔ وہ مللڈا کو چپنا تازیانی پٹنٹی کے ذریعے ناک آؤٹ کرنا چاہتا ہے۔ اور میں ایسا نہیں چاہتا۔ اس لئے تمہارے پاس آیا ہوں۔“ چلو نے مسکراتے ہوئے جیس کی جانب دیکھا۔ پھر جیب میں سے مٹی بھر چہرے باہر نکال کر منہ میں ڈال لئے۔ کچھ دیر انہیں ہلکے ہلکے چباتا رہا۔ پھر اس نے تھک کے چٹکے کی مانند چہرے کو باہر اگل دیا۔ ایسا اس نے اپنے اگلے دانتوں کی مانند کیا تھا۔ عیسی ٹریفک کی سرخ تلی کی بدولت رکی ہوئی تھی۔ چہرا کوئی کی مانند چلو کے منہ سے باہر نکلا۔ اور سامنے موجود سائن بورڈ پر گلی لڑکی کی تصویر کی آنکھ میں جا لگا۔ جیس نے تقریبی نگاہوں سے چلو کی جانب دیکھا اور مطمئن انداز میں سرسٹ کے ساتھ لگا کر آنکھیں موند لیں۔

جب وہ دونوں بی بال ہال میں داخل ہوئے۔ تب مقابلہ شروع ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ ہنگر رنگ کے درمیان میں موجود تھا۔ لیکن جعفر اور ہنگر مللڈا کے ہمراہ ہال سے منسلک کمرے میں بیٹھے تھے۔ میکس ہال کی سب سے اگلی سیٹوں کے درمیان میں براہمان تھا۔ جیس نے چلو کو اشارے کے ذریعے میکس کے وجود سے آگاہ کیا۔ اور خود ہال سے منسلک چھوٹے کمرے کی جانب چل دیا۔ جعفر اور ہنگر اس کے منتظر تھے۔ جیس نے انہیں باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اور خود بھی رنگ کی جانب چل دیا۔ باہر انانوسر مللڈا کا نام لپکار رہا تھا۔ مللڈا کو ہال میں داخل ہوتے دیکھ کر بچوں اور عورتوں نے خوشی سے مغلوب ہو کر چرچنا چلنا شروع کر دیا۔ مللڈا نے رنگ کے پاس پہنچ کر چھلانگ لگا لی۔ اور تقریباً اڑنا ہوارنگ کے درمیان میں آکھڑا ہوا۔ جیس نے چورنگاہوں سے میکس کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھوں میں سیاہ چشمہ لگائے ہوئے اٹھی رہ

کے درمیان بیٹھا مکمل انہماک کے ساتھ مللڈا کی جانب دیکھے جا رہا تھا۔ چلو کا وجود لوگوں کے جھوم میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آج کی فائٹ کو کور کرنے کے لئے ٹی وی کے کمرہ میں۔۔۔۔۔۔ اخبار کے رپورٹروں کے علاوہ فلم سے تعلق رکھنے والے اداکار بھی ہال میں موجود تھے۔ ریفری نے دونوں باکسروں کی تلاشی لینے کے بعد فائٹ شروع کرنے کی سٹی بجادی۔

ہنگر تیر کی مانند اسٹول سے کھڑا ہوا۔ اور بازی مانند مللڈا پر چھوٹا۔ مللڈا نے اس سے پہنچنے کے لئے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ پھر بالکل اچانک ہی اپرکٹ اس کی دماغی پسلیوں پر رسید کیا۔ ہنگر کا منہ خون کی شدت کی بدولت سرخ ہونے لگا۔ اسے اپنا سامنے سینے میں اٹکتا مجسوں ہوا۔ مکے کی شدت اس کی تو جبات سے زیادہ تھی۔ لیکن اس نے سر کو جھٹک کر اس احساس کو زائل کیا۔ ہنگر کے ساتھی چیخ رہے تھے۔ ”جو ہنگر۔۔۔۔۔۔ یہ آسان حریف ثابت نہیں ہوگا۔“

لیکن توہین کے احساس اور بے پناہ غصے نے ہنگر کو دیوانہ بنا دیا اور اس کے دونوں ہاتھ مشتیں انداز میں حرکت کرنے لگے۔ لیفٹ۔۔۔۔۔۔ رائٹ۔۔۔۔۔۔ سوئنگ۔۔۔۔۔۔ جیب۔۔۔۔۔۔ اپرکٹ۔۔۔۔۔۔ مجمع اس بری طرح چیخ رہا تھا کہ زمین لرزتی محسوس ہوزی تھی۔ جیس کی نگاہیں میکس پر مرکوز تھیں۔ وہ آنکھوں سے ٹیک اتار چکا تھا۔ اور اب اس کوشش میں تھا کہ کب مللڈا کی نگاہیں ہنگر سے ہٹ کر رنگ سے باہر تماشا بنیں گی جانب رخ کرتی ہیں۔

جیس پریشان ہو گیا۔ اسے میکس کی آنکھوں کی قوت پر یقین تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مللڈا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تو کوئی عام شخص بھی اسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ جانور ایسے موقع پر عموماً آنکھیں چرا لیتے ہیں۔ پھر اچانک ہی وہ سب کچھ ہو گیا۔ میکس نے پچھلی کی مانند تپ کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔ اور شدت درد کی بدولت چیخنے چلانے لگا، ہائے میری آنکھ۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔۔۔۔۔۔ مجھے شوٹ کیا گیا ہے۔“

رپورٹر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ لیکن وہ اس کا ہاتھ چہرے سے نہیں ہٹا سکتے تھے۔ ”میں اندھا ہو گیا ہوں۔ مجھے اسپتال لے چلو۔“ وہ چیخے جا رہا تھا۔ اسپتال پولیس والے حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے ارد گرد کے لوگوں کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ لیکن وہاں کسی کے پاس ہتھیار موجود نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر میں بی بال ہال کا ڈاکٹر وہاں آ گیا۔ اور میکس کو اسٹریچر پر ڈال کر باہر لے جایا گیا۔ سب لوگ اس ہنگامے میں اس قدر رنجو تھے کہ ان میں سے اکثر نے لکڑی چٹنے کی آوازیں نہیں سنی۔ اس کے بعد کلنگ کی آواز سنائی دی۔ جیسے تناور درخت زمین پر گرنا ہو۔ لوگ رنگ کی جانب متوجہ ہوئے۔ تو انہوں نے دیکھا کہ مللڈا اپنے ہاتھ فضا میں بلند کئے فتح کا اعلان کر رہا ہے۔ ریفری گنتی کن رہا تھا۔ اور ہنگر زمین پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ گنتی کے چند تماشائی تھے۔ جنہوں نے ناک آؤٹ ہونے کا وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ چلا چلا کر لوگوں کو بتا رہے تھے۔ وہ مللڈا کا شارٹ ریٹ چوہ تھا۔ جس نے ہنگر کے ہوش و حواس چھین لئے تھے۔ اس وقت پہلا راؤنڈ شروع ہوئے صرف ایک منٹ اور اٹھارہ سیکنڈ ہوئے تھے۔ ہال میں اب پیمان برپا تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ مللڈا کو کوئی نہیں ہرا سکتا تھا۔ پھر ڈاکٹر آیا اور اس نے اعلان کیا کہ میکس کو چہرے والی ہندوق سے ہٹ کیا گیا ہے۔ اس نے چہرے بھی دکھائے۔ پھر چیف آف پولیس نے اعلان کیا کہ کوئی بھی شخص اپنی جگہ سے نہ اٹھے۔ ہر شخص کی تلاشی لی جائے گی۔ لیکن تلاشی کا نتیجہ منفی نکلا۔ کسی شخص کے پاس کوئی ہتھیار نہیں پایا گیا۔ جیس ہنگر سے مخاطب تھا۔

”لڑائی کا کیا ہوا؟“ ہنگر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”پٹ پر لیفٹ اور چہرے پر رائٹ۔۔۔۔۔۔“ میکس کے چلانے پر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا کہ اس پر قامت ٹوٹ پڑی۔ باکسر کو ہر وقت اپنے حریف پر نظر رکھنی چاہئے۔ تصور اس کا اپنا تھا۔ درندہ کچھ دیر اور مقابلہ کر لیتا۔ لیکن بہر حال جیت مللڈا کے

نصیب میں لکھی ہوئی تھی۔“

”مجھے یہ سب کچھ غیر حقیقی دکھائی دیتا ہے۔ اب تک جتنے بھی باکسر منظر عام پر آئے ہیں۔ وہ مغلڈا کو ہاتھ لگائے بغیر ناک آؤٹ ہوتے چلے گئے ہیں۔ پہلے راؤنڈ سے آگے کوئی نہیں بڑھ سکا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے۔ کیا کوئی جانور ناقص الفطرت ہو سکتا ہے؟ ناممکن۔۔۔ بات کچھ اور ہے۔ لیکن سامنے نہیں آ رہی۔“ جیس بڑا دے ہوتے بولا۔

دوسرے دن کے اخبارات رنگین تصویروں کے ساتھ مغلڈا کی تصویروں سے بھرے پڑے تھے۔ بیکر اور جعفر کی تصویروں کے علاوہ ان دونوں کے تفصیلی انٹرویو شائع کئے گئے۔ سوالات تقریباً ایک جیسے تھے۔ مغلڈا کیا کھاتا ہے۔ وہ کہاں پیدا ہوا؟ آپ دونوں کو کیسے دستیاب ہوا؟ کتنے عرصے سے باسکٹ بالر ہے، اس کی عمر کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ کیا وہ بارڈی ڈوم جیسے کھلاڑی کو زپ کر سکے گا۔ مغلڈا کی تیاریوں کی تفصیل کیا ہے؟ میکس والا معاملہ کیا تھا۔ کیا میکس مغلڈا کو چٹا بنا کر کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ ایسا کر لیتا تب کیا ہوتا۔ اور کیا جانوروں میں چٹا بنا کر اثرات داخل ہو سکتے ہیں۔ میکس کی آنکھوں کو نقصان پہنچانے میں آپ کا کتنا عمل دخل ہے۔ بیکر اور جعفر نے انہیں وہی جوابات دیے۔ جن کے متعلق جیس انہیں پہلے ہی بتا چکا تھا اور نیو یارک ٹائمز نے جو رپورٹ مرتب کی وہ یوں تھی۔

انسان بمقابلہ جانور۔

گزشتہ کچھ دنوں کے دوران جانور نے دنیا کے مقبول ترین باکسرں زولو اور ہنگر کو شکست دی۔ اب نیو یارک کے سب سے بڑا ہال۔ ہڈن ہال میں دنیا کے عجیب و غریب مقابلے کا اہتمام کیا جا چکا ہے۔ کروڑوں پر مشتمل شائقین بلیک میں ٹکٹ فروخت کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن ہڈن ہال کا ٹکٹ دستیاب نہیں ہو رہا۔ گزشتہ کچھ دنوں کی چیپٹلش کیا رنگ لائی ہے۔ اس کے نتیجے کے لئے صرف ایک دن باقی رہ گیا ہے۔ کیا جانور انسان کو ہرا کر چیمپئن شپ کا اعزاز

حاصل کر پائے گا۔ شاید ایسا ہو جائے۔ اور اگر ایسا ہو گیا۔ تب اشرف المخلوقات کہلانے والے انسان یا جانور سبقت حاصل کر لے گا۔

یاد رہے۔ گزشتہ کچھ ایام کے دوران یہ جانور لگاتار انسانوں پر سبقت حاصل کرتا چلا آیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کل چیمپئن شپ کا اعزاز رکھنے والے بارڈی ڈوم کو ہرا پاتا ہے۔۔۔ یا نہیں۔ لیکن گزشتہ روز شائع ہونے والے انٹرویو میں بارڈی ڈوم کچھ نروں دکھائی دیتا تھا۔ انٹرویو کے دوران متحدہ باراس کی زبان نڈکھرائی اور وہ جانور کے تذکرے پر جھنجھلا اٹھتا تھا۔ نیو یارک کی عوام جانور کو ناقص الفطرت قرار دے رہی ہے بلکہ ایک افریقی نے تو یہاں تک کہہ ڈالا ہے کہ جانور میں ڈومبا دیوتا کی روح کھس گئی۔ اور اب انسانوں کو فنی شکست سے ہٹا کر دے گی۔ بہر کیف کل کے مقابلے سے پہلے مزید کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن مقابلہ یقیناً سنسنی خیز ثابت ہوگا۔ ہڈن ہال والوں کا کہنا ہے کہ آج سے پہلے بھی اتنی زیادہ تعداد میں کسی بھی مقابلے کے ٹکٹ فروخت نہیں ہوئے۔ یہ ریکارڈ سیل ہے اس لئے مقابلے کا اہتمام بھی معیار کے مطابق ہوگا۔

نیو یارک 1970ء

مقابلے کا افتتاح

3 جولائی 1970ء کی رات۔۔۔ تاروں بھرا آسمان تھا۔ دن بھر شدید گرمی رہی تھی۔ اور اب بھی گرمی تھی۔ لیکن قابل برداشت۔۔۔ ہڈن ہال میں ایک لاکھ دس ہزار تماشاخیوں کا جھوم تھا۔ فائٹ دیکھنے والے جھوم کا انداز بہت خوفناک ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی کو ڈنچی ہونے دیکھنے کی امید میں آتے ہیں۔ وہ تشدد کے رسیا ہوتے ہیں۔ فائٹ شروع ہونے سے پہلے ہی ان کے اعصاب کشیدہ ہوتے ہیں۔ ہر شخص نامعلوم سی تشویش میں مبتلا ہوتا ہے۔ ابتدائی مقابلے ہو چکے تھے۔ تماشاخی اب تک اچھی خاصی خوریزی دیکھ چکے تھے۔ لیکن دوسری جانب وہ بے چینی کے ساتھ

اصل مقابلے کا انتظار بھی کر رہے تھے۔ عطیہ سیکشن میں بڑے بڑے لوگ موجود تھے۔ ان میں اداکار تھے۔ فلم پروڈیوسر تھے۔ کروڑ پتی تاجر تھے۔ اور کنگسنگم بھی تھے۔ اس سیکشن میں نشست حاصل کرنا کسی عام آدمی کی استطاعت سے باہر تھا۔ رنگ کے اطراف میں چار اسٹبل کے پلیٹ فام ٹاورز تھے۔ وہاں کیمرو مین مناسب ترین زاویوں کی تلاش میں مصروف تھے۔ اور کیمروے مسلسل حرکت میں تھے۔ کچھ فوٹو گرافر عطیہ سیکشن میں بیٹھے افراد کی تصویریں کھینچ رہے تھے، اداکارا کین خاص طور پر ان کی توجہ کا مرکز تھیں۔ پیچھے ہوں کا جھوم تھا۔ گٹار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ سبھی بھی کوئی سر پھر گانے گانے لگا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے سامنے بھی آواز ملانے لگتے تھے۔ جیس اس وقت کئی حیثیتوں میں مصروف عمل تھا۔ وہ اس فلیٹ کا پروڈیوسر تھا۔ مفت خوراک فنڈ کا چیئرمین تھا۔ اور نیو یارک ٹائمز کا اسپورٹس ایڈیٹر اور کالم نویس تھا۔ وہ ادھر ادھر گھوم کر مختلف سیکشنوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ رنگ سائیڈ میں انواہیں گردش کر رہی تھیں۔ جو ہر فائٹ میں دہرائی جاتی ہیں۔ اسٹل لوگو نے ریفری کو خرید لیا ہے۔ بارڈی ڈوم جان بوجھ کر ہار جائے گا۔ جج کو خائف پارٹی خرید چکی ہے۔ مغلڈا کے کھانے میں زہریلی دوا ملائی جا چکی ہے۔ تربیت کے دوران بارڈی کا بایاں ہاتھ مجروح ہوا ہے۔ لیکن اس بات کو اب تک چھپایا گیا ہے۔ سب سے زور دار افواہ یہی تھی کہ مغلڈا کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ بلکہ ایک چالاک باکسر ہے۔ جس نے ٹکرو کی کھال پہن رکھی ہے۔ پھر ریفری رنگ میں داخل ہوا۔ اور جیس نے سکون کا سانس لیا۔ ریفری فلیپس چندہ سال سے اس شعبے سے منسلک رہ چکا تھا۔ وہ دیانت دار فلیپس کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں تھا۔ آج تک اسے کوئی خرید نہیں پایا تھا۔ اس کی موجودگی اس بات کی ضمانت تھی کہ مقابلہ صاف ستھرا ہوگا۔ جیس اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ تماشاخی دم سادھے ہوئے تھے۔ پھر چاک اسٹیڈیم تالیوں سے گونج اٹھا۔

بارڈی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہال میں داخل ہوا۔ وہ لوگ رنگ میں داخل ہوئے اور اپنے کارز کی جانب بڑھ گئے۔ تماشاخی حلق پھاڑ کر چیمپئن کو داد دے رہے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ بارڈی کبھی بھی مقبول اور ہر دلعزیز نہیں رہا تھا۔ لیکن آج پہلی بار اس کی مقبولیت سامنے آ رہی تھی۔ ہر سیکشن میں ہر شخص کھڑے ہو کر اس کا استقبال کر رہا تھا۔ بارڈی ہاتھ اٹھا کر داد چیمپئن کا جواب دے رہا تھا۔

پھر اسٹیڈیم کے دوسرے حصے سے ”اؤک۔۔۔ اؤک“ کی حیرت زدہ آوازیں ابھریں۔ کچھ خوف زدہ ہنس کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ مغلڈا کے قافلے کی آمد کا اعلان تھا۔ سب لوگ کھڑے ہو کر مغلڈا کو دیکھنے لگے۔ لیکن تالیاں کسی نے بھی نہیں بجائیں۔ بیکر نے مغلڈا کی زنجیر تھام رکھی تھی۔ اور مغلڈا اچھل اچھل کر آگے بڑھ رہا تھا۔ آخر کار وہ طلسم حیرت ٹوٹا۔ آسٹریلین تماشاخیوں کے سیکشن کی جانب سے مغلڈا کے حلق میں نعرے سنائی دیے۔ پیوں کے جھوم کی طرف سے موسیقی نے مغلڈا کا استقبال کیا۔ لیکن یہ سب کچھ عام تماشاخیوں کو متاثر نہیں کر سکا اور وہ تمام آوازیں دم توڑتی چلی گئیں۔ مغلڈا نے مخصوص انداز میں چلا گیا لگائی اور ہوا میں اڑتا ہوا رنگ میں داخل ہو گیا۔ جو کچھ نظروں کے سامنے تھا۔ وہ تماشاخیوں کے لئے نیا نہیں تھا۔ اب کارز میں ایک جانب انسان تھا۔ سیاہ آنکھوں، گھٹکھریا لے بالوں اور خوب صورت جسم والا انسان۔ دوسری جانب ایک جانور تھا۔ چوڑا سینہ۔ مضبوط شانے۔ مہوئی اور مہی دم۔ مختصر اور پتلے بازو۔ وہ ناپسند معلوم ہو رہا تھا۔ جیس کو اس لمحے وہ زمانہ قدم کا کوئی دیو پیکر پرندہ لگ رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک پچھتاوا سا ابھرا۔ کاش اس نے یہ سب کچھ نہ کیا ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی ایک مہما کے ساتھ اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ وہ سمجھ گیا کہ تماشاخیوں نے پہلی بار بارڈی کا اس قدر دالہانہ استقبال کیوں کیا ہے۔ پیوں اور آسٹریلیا سے آئے ہوئے لوگوں کے سوا مغلڈا کا استقبال کسی نے بھی نہیں

کیا۔ کیوں۔۔۔۔۔ شاید وہ خوفزدہ تھے۔ کم تر مخلوق نے اشرف المخلوق یعنی انسان کی برتری کو تسلیم کیا تھا۔ ممکن ہے ایک دن زمین پر انسانوں کی جگہ سنگردوں کی حکمرانی ہو۔ تماشاخیوں کا رد عمل مغلذ اسے ان کا کھنچاؤ اور ان کی خوفزدہ ہنسی۔۔۔۔۔ سب کچھ نسل پرستی کی علامت تھا۔ چھٹ سنگردان کے لئے انسانی تلکست کی علامت تھا۔ لاشور میں دبا ہوا خوف تلکست ابھرا آیا تھا۔ ہر شخص سہا ہوا تھا۔ کچھ لوگ سوچ رہے تھے کہ کاش وہ فائنٹ دیکھنے نہ آئے ہوتے۔ اب بیکر مغلذ اکو دستانے پہنار ہا تھا اور جیس اس غل کو بخور دیکھ رہا تھا۔ ہارڈی کے کارنر میں یہی کام اس کا اسٹنٹ سرانجام دے رہا تھا۔ تماشاخیوں میں ایسے بھی تھے۔ جو یہ یاد کر رہے تھے کہ بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں اس سے زیادہ کیا کیا عجیب واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ انسان نے چاند پر قدم رکھا ہے۔ نسل ارتقاء کا عمل ٹیٹ ٹیوٹ تک آ پہنچا۔ سائنس نے ہر فرسودہ تصور کو باہال کر دیا ہے۔ یہ تو شخص ایک تلکرو ہے۔ جس نے خود کو ایک باکسر ثابت کر دیا۔

گھنٹی بجنے والی تھی۔ کچھ باکسر رنگ میں اتر گئے۔ یہ وہ باکسر تھے۔ جو دونوں میں سے کسی ایک باکسر سے مستقبل میں لڑنے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے دونوں باکسروں سے ان کے کارنر میں جا کر ہاتھ ملایا۔ مغلذ انے ان میں سے دو کی خصوصی پذیرائی کی اور انہیں بوسہ محبت سے نوازا۔ پھر رکی تعارف ہوا۔

خواتین د حضرات، عالمی ڈل ویٹ جمپین ہارڈی ڈوم۔۔۔۔۔ اس نے ہارڈی کی جانب اشارہ کیا۔ جس کا تعلق افریقہ کے قبیلے کاموگا سے ہے۔ وزن ایک سو ساٹھ پونڈ۔۔۔۔۔ ہارڈی نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیئے۔ لار تھر کے لگا۔ مجھے نے چیخ کر اسٹیلڈیم سر پر اٹھالیا۔ یہ سب ہارڈی کے حق میں ہیں۔ جیس نے اپنے قریب بیٹھے جعفر سے کہا۔ ”اگر مغلذ اجیت گیا۔ تب ان کا رد عمل کیا ہوگا؟“

”دہی ہوگا۔۔۔۔۔ جو مغلذ اکے ہارنے پر ہوگا۔“

جعفر بولا۔ اناؤنسر کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ اور سامنے والے کارنر میں سٹائی آسٹریلیا کا بازی۔۔۔۔۔ پانچویں مغلذ۔۔۔۔۔ وزن 159 پونڈ۔۔۔۔۔ جواب میں دہی دہی سی تالیوں۔۔۔۔۔ اور خوفزدہ ہنسی ابھری۔ پھر اچانک بیٹوں کے سیکشن میں سے کسی نے بوسہ مرگ والا گیت گانا شروع کر دیا۔ جلد ہی تمام ہی ہم آواز ہو گئے۔ اب اسٹیلڈیم بوسہ مرگ کی لے پر گونج رہا تھا۔ بیکر نے مغلذ اکو اسٹول سے اٹھایا تاکہ وہ اس راو کے جواب میں ہاتھ بلند کرے۔ ایک لمحے کے لئے مغلذ نے جیس اور جعفر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اعتماد اور بھروسے کا تاثر تھا۔ جیسے وہ جانتا ہو کہ وہ دونوں اس کے دوست اور حامی ہیں۔

”اے خبیث جانور۔۔۔۔۔ اب اگر رنگ میں اترنا تو تیرا انجام اچھا نہیں ہوگا۔“ پریس سیکشن میں سے کسی نے زہریلے لہجے میں چیخ کر کہا۔ اس بار جیس کوچ معنوں میں اعزاز ہوا کہ مجمع مغلذ اکے لئے کس قدر معاندانہ جذبات رکھتا ہے۔ جیس سوچنے لگا۔ اگر مغلذ نے پہلے ہی بیچ میں ہارڈی کو ناک آؤٹ کر دیا تو کیا ہوگا؟ لوگوں نے تیس لاکھ ڈالر صرف چندہ سینڈ کے لئے تو نہیں دیئے۔ پھر اسے خیال آیا کہ لوگوں نے تیس لاکھ ڈالر یہاں اپنی موجودگی کے لئے ادا کئے تھے تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ سکیں۔ اور پھر لوگوں کو بتائیں کہ جس وقت مقابلہ ہوا۔ وہ اسٹیلڈیم میں موجود تھے۔ اناؤنسر رنگ سے باہر نکل گیا۔ ریفری نے دونوں باکسروں کو آخری ہدایات دینے کے لئے رنگ کے وسط میں بلایا۔ ہارڈی باوقار انداز میں آگے بڑھا۔ اس کی چال میں جیتے جیسے جیتی اور مستعدی تھی۔ مغلذ ایک ہی جست میں رنگ کے درمیان میں پہنچا۔ ہارڈی کے ساتھ اس کا اسٹنٹ چلتی تھا۔ جبکہ مغلذ اکے ساتھ بیکر۔ جعفر کارنر کے باہر رسیوں پر جھکا کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ جیس نے اعزازہ لگایا کہ وہ کچھ پریشان تھا۔ دونوں باکسروں نے ایک دوسرے کے دستانے چھوئے۔ اور اپنے کارنر میں چلے آئے۔ گھنٹی

بجنے والی تھی۔ ہارڈی کی پشت اپنے حریف کی طرف تھی۔ وہ اپنے کارنر میں بیگی کی ہدایات غور سے سن رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز سننے ہی وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور فائنٹ پوز میں رنگ کے وسط میں آ کھڑا ہوا۔ لیکن مغلذ پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ اس کا ٹیٹ ہارڈی کے کان پر پڑا۔ ساتھ ہی شارٹ رائٹ چوہ جڑے پر۔۔۔۔۔ ہارڈی کے گلہوں کے بل اس طرح گرا۔ کہ اس کی ایک ٹانگ کو لمبے کے نیچے دہی ہوئی تھی۔ مغلذ اچھے ہٹا اور رسیوں سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں اور تھوٹی کے تاثر کو اگر کوئی مفہوم دیا جاسکتا تھا تو وہ مایوسی کا تھا۔ ایسا لگتا تھا۔ گویا اس کی دانست میں اسے کزدور حریف سے لڑا کر ایک بہت بڑی خوشی سے محروم کر دیا گیا ہے۔ لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ٹائم کیپر ناک واذن کاؤنٹ میں مصروف تھا۔ جیس بھی بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”اوہ مائی گاڈ۔۔۔۔۔“ وہ پر جوش لہجے میں بولا۔ صرف دوسرا بیچ۔ پھر اچانک اسے خیال آیا۔ اور اس نے اپنے ٹکی گرافٹ سے چیخ کر کہا۔ ”ہارڈی دو بیچوں کے بعد نیچے گر گیا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے۔ اپنے ہوش و حواس ٹھو بیٹھا ہے۔ میرے خیال میں ٹھیکل ختم ہو چکا ہے۔ مغلذ انے ابتداء میں ہی اسے ڈھیر کر دیا ہے۔“ ریفری ہارڈی کی طرف بڑھا۔ اس نے نفی شروع کر دی۔ چار۔۔۔۔۔ پانچ۔۔۔۔۔ چھ۔۔۔۔۔ سات پر ہارڈی نے کسی نہ کسی طرح اپنی دہی ہوئی ٹانگ باہر نکالی۔ اور چاروں ہاتھوں پاؤں پر اٹھ آٹھ پر اس نے اپنے سر کزدور سے جھکا اور نوپراٹھ کھڑا ہوا۔ ریفری نے اسے چند سینڈ کی ردا بتی مہلت دی۔ اور ایک طرف ہٹ گیا۔ اس نے مغلذ اکو رنگ میں آنے کا اشارہ کیا۔ لیکن ہارڈی فوراً مغلذ اسے لپٹ گیا۔ نتیجے میں اسے کئی بوسے برداشت کرنے پڑے۔ ہارڈی لپٹا رہا اور بوسہ بازی پر مغلذ اکو برا بھلا کہتا رہا۔ لیکن مغلذ انے اسے سزا نہیں دی۔ شاید وہ اس مقابلے سے پوری طرح لطف اٹھانے کے موڈ میں تھا۔ پھر شاید مغلذ کی کھردری

زبان اور بھیگا ہوا بوسہ ہارڈی کو پوری طرح خوش و ہواس میں لے آیا۔ ریفری نے انہیں الگ کیا۔ ہارڈی بیچے ہٹا تو وہ خود پر بڑی حد تک قابو پا چکا تھا۔ اس کی خود اعتمادی بحال ہو چکی تھی۔ لوگ اس کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ اور وہ خود واحد ٹھنڈی کا کام کرتا رہا۔ وہ رنگ میں بھاگتا پھر رہا تھا۔ اس نے مغلذ پر کوئی حملہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ صرف جھکائیوں اور ہینٹرڈوں سے کام چلاتا رہا۔ لوگوں کے حوصلے افزا نعرے اسے ہمیز کر رہے تھے۔ ہر شخص چیخ رہا تھا۔ کہ وہ مغلذ اسے در رہے۔ وہ اپنی مہارت پھرتی اور جیلت سے پوری طرح کام لے رہا تھا۔ دیے بھی اس فائنٹ کے لئے اس نے واقعی بہت محنت کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی ٹانگیں پوری طرح اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ وہ مغلذ اسے بیچ کر بھاگتا رہا۔ جیس نے دل میں شکر ادا کیا کہ فائنٹ پہلے چندہ سینڈ میں ختم نہیں ہوئی۔ اپنی مرضی کے خلاف اس کے دل میں دوبارہ یہ خواہش ظاہر ہوئی۔ کہ کاش ہارڈی جیت جائے۔ اور وہ اپنی اس خواہش پر حیران ہوا۔ اس کی ہمدردیاں ہارڈی کے ساتھ تھیں۔ شاید انسانی رشتہ تمام نفرتوں کی دیواریں گرا کر ہادی آ گیا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ کہ اس بھرے ہوئے رخ نے مغلذ اکو نہ صرف الجھا دیا تھا بلکہ وہ مایوس بھی تھا۔ شاید مسئلہ اس کے لئے نیا تھا۔ اسے پہلی بار ایسا حریف ملا تھا۔ جو اس پر حملہ نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ اس سے بھاگ رہا تھا۔ وہ نیم دلی سے ہارڈی کا تعاقب کر رہا تھا۔ جیس نے اعزازہ لگایا کہ مغلذ اصورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے دوبارہ ہارڈی پر ہاتھ چلایا۔ لیکن ہارڈی کے متحرک ہونے کی وجہ سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا پایا۔ راؤنڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجی۔ تو ہارڈی اپنے کارنر کے قریب تھا۔ وہ اپنے اسٹول پر ڈھیر ہو گیا۔ کیونکہ اس کا سانس اکھڑ گیا تھا۔

اسٹیلڈیم تالیوں سے گونج رہا تھا۔ لوگ ہارڈی کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ ہارڈی کے کارنر میں بیگی اسے سمجھا رہا تھا۔ جبکہ راؤنڈ ختم ہونے کے بعد ہارڈی کا

سینکڑ اس کی ٹانگوں کی باش کر رہا تھا۔ ہارڈی کی آنکھوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ پہلے بھٹکے سے پوری طرح سنبھل چکا ہے۔ دوسری طرف مللڈا اپنے کارنر میں رسیوں پر ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ وہ بار بار سر ہلارہا تھا۔ اور جس کے خیال میں ہارڈی کو غصے سے گھور رہا تھا۔ شاید اس کے خیال میں ہارڈی صحیح معنوں میں ایک کھلاڑی کی طرح مقابلہ نہیں کر رہا تھا۔ بیکراس کی پیڑ پر ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں اس کا کان کھینچ کر اس میں ہدایات انڈیل رہا تھا۔

”ایزی بوائے ایزی۔۔۔ اس کا انتظار کرو۔ اگلی بار وہ بچ نہیں سکے گا۔ وہ ساری رات بھاگ نہیں سکتا اور رنگ میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہوتی۔ جہاں آدی منہ چھپا سکے۔“ جنس نے یہ بات محسوس کی کہ بیکر اور جعفر راز دارانہ انداز میں ایک دوسرے سے بات چیت کر رہے تھے۔ دوسرا راڈنڈ پہلے راڈنڈ جیسا ثابت ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار ہارڈی گرا نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ خود کو بیکر نفسیاتی برتری حاصل کرنا چاہ رہا ہے۔ اس کے منبر کو بھی فی الوقت صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ وہ ناک آؤٹ نہ ہو۔ اس نے ہارڈی کو بھی ہدایات دیں تھیں کہ بھاگتے رہو۔ پہلے راڈنڈ کے ناک ڈاؤن کے نتیجے میں تماشائیوں کو بھی صورت خال کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بے صبرے پن کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔ عام حالات میں تو وہ ہارڈی کو محض ہونٹک کے ذریعے ناک آؤٹ کر دیتے۔ چنانچہ ہارڈی اپنی پانچ میل یومیہ دوڑ کی مشق کو بروئے کار لا رہا تھا۔

مللڈا کی پیشانی پر ایک گہری ٹکیر نمودار ہو گئی تھی۔ جنس کے خیال میں بات صرف اتنی سی تھی کہ مللڈا کو جنگلی حکمت عملی کے ایک سنگین مسئلے کا سامنا تھا۔

بلکہ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہارڈی نے مللڈا کو اس کام سے محروم کر دیا تھا جو اسے بانگٹ میں ملتا تھا۔ لڑنے کے لئے دو کنگروں کا ہونا ضروری ہوتا ہے جبکہ یہاں ایک کنگرو کھیلنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ لیکن

ہارڈی کی طرح ایک تیز رفتار باکسر کے پیچھے بھاگنا ایک مختلف بات تھی۔ مللڈا کو بھاگنے کے بجائے جست لگانا ہوتی تھی اور ہارڈی اس دوران پلٹ کر دائیں بائیں جانب ہو جاتا تھا۔ مللڈا کی جست میں فٹ کی تھپی جبکہ رنگ میں مربع فٹ کا تھا۔ یعنی مللڈا کی چھلانگ کی سمت کا اندازہ لگاتا۔ اور مخالف سمت بھاگ لیتا۔ چنانچہ راڈنڈ کے پہلے سینکڑ میں یہ منظر دیکھنے میں آتا کہ رنگ کے ایک طرف مللڈا ہے دوسری طرف ہارڈی اور درمیان میں ریفری۔۔۔ اور اسٹیڈیم قہقہوں اور تالیوں سے گونج رہا ہے۔ اب ریفری ہارڈی کے کارنر کی طرف بڑھا وہ ہارڈی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن تماشائیوں کے شور میں سننا ممکن نہیں تھا۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ وہ ہارڈی کو خبردار کر رہا تھا کہ وہ مقابلہ کرے۔ ورنہ اسے تا اہل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ریفری اور ہنگی کے درمیان کچھ تند و تیز گفتگو ہوئی۔ مللڈا نے اس بار اسٹول پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ بیکر اب بھی اس کے کانوں میں ہدایات انڈیل رہا تھا۔ اور مللڈا بار بار سر جھٹک رہا تھا جیسے وہ سخت غصے میں ہو۔ وہ کچھ دیر بھی دکھائی دیتا تھا۔ جنس کے اسٹینٹ نے ٹیلی گرافسٹ کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ ”مللڈا اب پہلے کی طرح سرو مزاحیہ کا مظاہرہ نہیں کر رہا۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اور اس کا ارادہ کیا ہے۔“

”وہ کچھ نہیں سوچتا۔ جنس نے اسٹینٹ کو ٹوکا۔ وہ انسان نہیں کنگرو ہے۔ اگر ہارڈی اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ تو وہ یقیناً اسے زپ کر دے گا۔ لیکن اگر ہارڈی پندرہ راڈنڈ تک بھاگتا رہا۔ تو تمہیں اور مجھے شہر کو چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔“ پھر اس نے بیکر کو پکارا۔

”اسے سمجھاؤ۔۔۔ کہ اپنی جگہ کھڑا رہے۔ اس کا پیچھا کرنا بے کار ہے۔ اس صورت میں اگر ہارڈی خود اس کے قریب نہ آیا۔ تو ریفری اسے مجبور کرے گا۔“ بیکر تلخ لہجے میں بولا۔

”تم ہی سمجھاؤ۔۔۔ وہ انگریزی نہیں سمجھتا۔“ راڈنڈ کے آغاز کی گھنٹی بجی تو لوگوں نے چیخ چیخ کر

ہتھیہ ہم سر پر اٹھالیا۔ یہ تیسرا راڈنڈ تھا۔ اور اس سے پہلے مللڈا کی کوئی فائٹ تیسرے راڈنڈ میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ یہ ہارڈی کے لئے ایک علامتی فتح تھی اور تماشائی اس کا اظہار کر رہے تھے۔ اسے داد دے رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہارڈی چاہے نہ جیتے۔۔۔ لیکن آؤٹ نہ ہو۔ فکری انتشار نے جنس کو اندر سے ہلا دیا۔ وہ ہارڈی کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہارڈی اسی طرح اپنے پیروں پر کھڑا رہے۔ کہ تماشائیوں کو اپنے پیروں کا زیاں کا احساس نہ ہو سکے۔ لیکن دوسری طرف وہ مللڈا کو قریب قریب ہوتا بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر فائٹر مللڈا کے داغ نے مسئلے کا ایک حل سوچ لیا۔ اس مرتبہ گھنٹی بجتے ہی رنگ کے وسط کے بجائے اس نے اپنے حریف کے کارنر کی جانب چھلانگ لگائی۔ ہارڈی ابھی اسٹول سے اٹھ کر کھڑا ہی ہو رہا تھا۔ کہ مللڈا اس کے سر پر جا پھینچا۔ مللڈا نے شارٹ رائٹ پرکٹ مار کر اسے گرا دیا۔ اب کی دفعہ ہارڈی آٹھ تک گنتی کے بعد اٹھ سکا۔ اس دوران اس کا اسٹینٹ ہنگی ڈاؤن فاول چیخ رہا۔ لیکن ریفری نے اس احتجاج کو مسترد کر دیا۔ کیونکہ راڈنڈ شروع ہو چکا تھا اور اپنا دفاع کرنا ہارڈی کی اپنی ذمہ داری تھی۔ اٹھنے کے فوراً بعد ہارڈی نے مللڈا سے لپٹنے کی کوشش کی۔ لیکن مللڈا نے ٹین اسٹریٹ لیفٹ اور پیسلوں میں ایک رائٹ چوپ کے ذریعے اسے روک دیا۔ اب ہارڈی کو اپنی ٹانگیں رزتی محسوس ہو رہی تھیں۔

تماشائی ہارڈی سے چیخ چیخ کر التجائیں کر رہے تھے کہ وہ مللڈا سے دور رہے۔ لیکن ہارڈی کی ہاتھ کھانچا غار اور پھر مللڈا نے اسے گھیر بھی لیا تھا۔ اس لئے ہارڈی نے چہرہ ان کی کہنیوں کی اوٹ میں چھپا لیا۔ لیکن مللڈا نے جسم پر لیفٹ بک کے ذریعے اس کا دفاعی حصار توڑا اور شارٹ رائٹ چوپ کے ذریعے اسے گرا دیا۔ ہارڈی تو تک گنتی کے بعد بمشکل سنبھلا۔ لیکن اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ تاہم وہ اٹھ کر کھڑے ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر وہ دوبارہ مللڈا سے لپٹ گیا۔ اپنے

قدموں پر کھڑے رہنے کی اب یہی ایک صورت تھی۔ مللڈا ایک بار پھر کامیابی کے احساس سے سرشار تھا۔ اس لئے اس کا دل اس مختلف قسم کے کنگرو کی محبت سے لبریز ہو گیا۔ جس نے اس سے مقابلہ کر کے اسے لطف کی ساعتیں فراہم کی تھیں۔ اس نے ہارڈی کو یوسوں سے نہلا دیا۔ ریفری نے انہیں چھڑایا۔ لیکن ہارڈی پھر مللڈا سے لپٹ گیا۔ ہارڈی نے اس کے جسم پر دار کرنا چاہا۔ تو مللڈا نے اسے جکڑ کر بے بس کر دیا۔ ہر تماشائی اپنی سیٹ پر کھڑا ہو گیا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ ہارڈی اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہا ہے۔۔۔۔۔ ہاری ہوئی جنگ۔۔۔۔۔ ریفری نے ایک دفعہ پھر انہیں چھڑایا۔۔۔۔۔ ہارڈی نے الگ ہوتے ہی پیچھے ہٹنے کی کوشش کرنے کے بجائے بچ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مللڈا جھکا کر دے گیا۔ ہارڈی ایک دفعہ پھر ڈھیر ہو گیا۔ لیکن انداز سے پتا چلتا تھا کہ اس بار وہ اٹھنے والا نہیں ہے۔ لیکن گنتی سات تک پہنچی تھی کہ راڈنڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی۔ مللڈا صرف تین سینکڑ کے فرق سے عالمی ٹیڈل ویٹ چیمپئن بننے بننے رہ گیا۔

ہارڈی کا اسٹینٹ ہنگی اور اس کے دوسرے ساتھی رنگ میں اتر آئے۔ وہ اسے گھسیٹ کر کارنر تک لائے۔ انہوں نے سہارا دے کر ہارڈی کو اسٹول پر بٹھایا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے۔ یہ بات طے تھی کہ ہارڈی نے اس فائٹ کے لئے پھر پور محنت کی تھی۔ کیونکہ وہ امو نیا سو گھنٹے ہی بہت تیزی کے ساتھ ہوش میں آ گیا۔ ریفری اور ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے کی غرض سے آئے کہ وہ مقابلہ جاری رکھ سکتا ہے یا نہیں۔ اس مرحلے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر انہیں جانے کا اشارہ کیا۔ اور ہسٹریائی انداز میں مللڈا کو گالیاں دینے لگا۔ اب ہارڈی نہیں چل سکتا۔ جنس نے اپنے اسٹینٹ سے پرچوں لہجے میں مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”یہ بیچ میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ مللڈا نے سرکس میں اسی بیچ کے ذریعے ہارڈی کو ناک آؤٹ کیا تھا۔“

گھنٹی بجتے ہی ہارڈی اسٹول سے اٹھا اور کسی نہ کسی طرح مہلڈا کے جھپٹنے سے بچ نکلا۔ اس کے سامنے چیخ رہے تھے۔

”ہٹو ہارڈی..... بچو اس سے.....“ لیکن توہین کے احساس اور بے پناہ غصے نے ہارڈی کو دیوانہ کر دیا تھا۔ وہ مہلڈا پر حملہ آور ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھ مشینی انداز میں حرکت کرنے لگے۔ لیفٹ۔ رائٹ۔ اپرکٹ۔..... جیب۔ سونگ۔..... مجمع پر جوش انداز میں چھیننے لگا۔ ہر شخص کو احساس تھا کہ وہ ہارڈی کی بے جگری کے علاوہ مہلڈا کے دفاع کی ایک غیر معمولی اور بے نظیر مظاہرہ دیکھ رہے ہیں۔ اس کی بائسنگ اس کے پیٹرنے اور جھکائیاں غضب کی تھیں۔ پھر اس نے موج پا کر ہارڈی کی کٹیٹی بھی خستہ تباہی۔ پہلی بار اس کی تھوٹی پر آسودگی کا تاثر نظر آیا۔ آخر کار تھک ہارڈی ہارڈی اس سے لپٹ گیا۔ مہلڈا نے اسے آخری بار چومنا۔ وہ بوسہ مرگ تھا۔ کیونکہ تیکر کے حلق سے فاتحانہ چیخ نکلی۔

”تھکیل ختم۔۔۔۔۔۔ یہ بوسہ مرگ ہے۔“ نیکر دیوانہ وار چیخ رہا تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ریفری نے مہلڈا کے کانڈھے پر چھکی دیتے ہوئے بریک کہا۔ تو مہلڈا اصول کے مطابق پیچھے ہٹا۔ ہارڈی کے لئے یہی لمحہ ہوش مندی کا ثابت ہوا۔ اس کے کانوں پر اپنے کارنر کی طرف سے آنے والی آوازیں پڑیں۔

”ہارڈی بھاگو..... خدا گمے لئے اس سے دور بھاگو.....“ اور ہارڈی بھاگ اٹھا حالانکہ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ اس کے باوجود اس نے مہلڈا کو ایک بار پھر اپنا تعاقب کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس بار ٹیمپلٹن میں طاقت نہیں تھی۔ لیکن وہ پہلے سے زیادہ ہوش مند تھا۔ وہ رفتار کی ککا ازالہ اپنی پھرتی اور تیز مڑنے کی صلاحیت سے کر رہا تھا۔ اس نے بھاگ دوڑ میں شطرنج کے تمام مہروں کا انداز اپنایا۔ پیدل، فزریں، نکل، رخ اور سب سے عجیب چال گھوڑے کی چال۔..... کیونکہ وہ اچانک اپنی سمت تبدیل کر لیتا۔ اس راؤنڈ کے دو منٹ اسی آٹھ

بجوتی میں گزر گئے۔ ہارڈی کی کوشش تھی کہ کسی طرح مہلڈا کا توازن بگڑ جائے۔ پھر اسے موقع مل گیا۔ جھکائی کی وجہ سے مہلڈا کا توازن بگڑ گیا۔ وہ اس وقت دفاع کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ تھکے ہوئے انسان نے مہلڈا کے پیٹ میں دو بچ مارے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بچ میں جان نہیں ہے۔ اس لئے وہ پھرتی کے ساتھ پیچھے ہٹا۔ تاکہ بقاء کے دوڑ دوبارہ شروع کر سکے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ مہلڈا کو ہٹ کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ بچ بے جان بھی لیکن بہر حال ایک اعزاز سے کم نہیں تھے۔ پھر وہ سب کچھ اتنی سرعت کے ساتھ ہوا کہ کوئی بھی کچھ نہیں سمجھ سکا۔ صرف ماہرین ہی اس غیر معمولی نتیجے کا اندازہ لگا سکے۔ جیسے چند لمحے مہلڈا کو گھور تار پل۔ پھر اس نے اسٹنٹ سے کہا۔

”میرے خدا مہلڈا کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ مر رہا ہے۔“ مہلڈا اب پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اور رسیوں کے سہارے نکلا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر تھے اور آنکھوں میں حیرت کا واضح تاثر۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر تھوٹی پر ڈھلک گئے۔ جیسے کو ایسا لگا کہ مہلڈا کے چہرے کا تاثر اس بچے کے تاثر سے ملتا جلتا ہے۔ جیسے اس کے کسی بزرگ نے پہلی بار مارا ہو۔ وہ تاثر جسمانی تکلیف اور کسی کا بھرم ٹوٹنے کی اذیت سے عبارت تھا۔ جیسے کوئی خوش فہمی دور ہو گئی ہو۔ جیسے کوئی سپنا ٹوٹ گیا ہو۔ جیسے کوئی عزیز اور محبوب ہستی دعا دے گئی ہو۔ جیسے اس تاثر کے علاوہ بھی کچھ دیکھا۔ مہلڈا کے قدموں کے پاس فرش پر تیکر نے جلدی سے توالیہ پھینکا کیونکہ مہلڈا کا پیشاب خطا ہو گیا تھا۔

”میرے خدا وہی ہوا۔۔۔۔۔۔“ تیکر تقریباً رو دیا۔ ”آہ بے چارہ مہلڈا..... میرا کنکر مسئلہ ختم ہو گیا۔“ اس کی آواز میں درد تھا۔ لیجے میں کرب اور اذیت۔۔۔۔۔۔ ریفری نے مہلڈا اور ہارڈی کو دوبارہ لڑنے کا اشارہ کیا۔ لیکن مہلڈا اپنی جگہ سے ہلانہیں۔ وہ رسیوں سے ٹپک

پڑے کھڑا تھا۔ اور اب اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو پیر رہے تھے۔ اس کی تھوٹی جھجک گئی تھی۔ تماشائی کچھ بھی نہیں سمجھ پارہے تھے۔ ہر طرف دینی دینی سرگوشیاں گونج رہی تھیں پھر تیکر کی آواز فضا میں ابھری۔ اس کے لہجے میں درد بھری التجا تھی۔

”خدا کے لئے اب اسے ہاتھ نہ لگاؤ۔ یہ میرا عزیز زمین دوست ہے۔ میرے دکھوں کا ساتھی۔۔۔۔۔۔ برے بتوں کا۔۔۔۔۔۔ رفیق۔۔۔۔۔۔ خدا کے لئے۔“ اب وہ بری طرح سسک رہا تھا۔ ہارڈی کو ناقابل فہم سا احساس ہوا۔ کہ پانسہ لپٹ چکا ہے۔ وہ جنگجوؤں کے انداز میں مہلڈا کی جانب بڑھا۔ لیکن وہ اب بھی تھکا ہوا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں یہ بھی مہلڈا کی کوئی چال نہ ہو۔ مہلڈا کے ہاتھ اب بھی پیٹ پر تھے۔ اس نے اپنے دفاع کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ہارڈی نے اپنی پچی بگڑتوت جمع کرتے ہوئے اس کے دونوں پہلوؤں میں ایک ایک لیفٹ ایک رائٹ مارا۔ مہلڈا اچاروں ہیروں پر فرش پر بیٹھ گیا۔ اب وہ باکسر نہیں صرف ایک کنکر تھا۔ ایک چوپایہ۔۔۔۔۔۔

تماشا بینوں کے نفروں نے اسٹڈیم کو بلا کر رکھ دیا۔ ”میرے خدا۔۔۔۔۔۔“ جیسے کہا۔ ”یہ تو ڈھیر ہو گیا۔ اٹھو مہلڈا۔۔۔۔۔۔ مرو۔۔۔۔۔۔ تمہیں بالکل چوٹ نہیں آئی۔“

اب ہارڈی چیخ چلا رہا تھا۔ ”اٹھو ذلیل جانور۔۔۔۔۔۔ تاکہ میں تیری مزید ٹھکانی کر سکوں۔“ یہ وہ موقع ہوتا ہے جب لوگ بھڑک اٹھتے ہیں۔ مجمع فساد یوں کے گردہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا پھر اچانک پیوں کے سیشن میں ہونٹک شروع ہوئی۔ خود فریبی میں جٹلا لوگوں نے اپنے ہیرو کی خدمت شروع کر دی۔ ریفری بھی الجھ گیا۔ مہلڈا کے دستا نے رنگ کے فرش کو چھو رہے تھے۔ لیکن وہ جسمانی تکلیف میں نہ ہونے کے علاوہ زخمی بھی نہیں تھا۔ ہاں بہت زیادہ دھکی دکھائی دیتا تھا۔ بہر حال ریفری نے خود کو سنبھال اور ہارڈی کو کانڈھوں سے تھام کر دور ہٹا دیا۔ ڈرنری ڈاکٹر مظہر باندہ انداز میں ادھر ادھر گھومتے ہوئے

کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ٹائم کیپر کے حواس کسی نہ کسی طرح برقرار رہے تھے۔ اس نے ہارڈی کے بیٹے ہی ناک ڈاؤن کا خیال رکھا۔ چنانچہ ریفری نے کٹتی شروع کی اور دس پر ختم کر دی لیکن مہلڈا نے اپنی جگہ سے جھپٹ نہیں کی۔ اس بار تماشا بینوں کے شور میں کسی سمندری طوفان کی سی گھن گرج تھی۔ ہارڈی کے ساتھیوں نے اسے کانڈھوں پر اٹھالیا۔ اور رقص کرنے لگے۔

تیکر رنگ میں داخل ہوا۔ گھٹنوں کے بل مہلڈا کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ اسے تھپتھپا رہا تھا۔ پیار بھری سرگوشیاں کر رہا تھا۔ پھر وہ مہلڈا کو اس کے کارنر میں لے گیا۔ لیکن مہلڈا اب چار ہیروں پر چل رہا تھا۔ اناؤنسر نے اعلان کیا۔

”ٹائم دوست 29 سیکنڈ۔ چوتھا راؤنڈ، وزبائی اے ناک آؤٹ اینڈ اسٹیل ٹیمپلٹن ہارڈی ڈوم۔۔۔۔۔۔“ اب ہارڈی کے سامنے درجنوں مائیکروفون تھے اور اس سے سوالات کئے جا رہے تھے۔ ایک پولیس والا مہلڈا کے کارنر میں چلا آیا۔ پھر بولا۔ ”اسے یہاں سے لے جاؤ۔ ہم کوئی مشکل کھڑی نہیں کرنا چاہتے۔“ لیکن اسی وقت ڈرنری ڈاکٹر رنگ میں داخل ہوا۔ اور اس نے مہلڈا کا معائنہ شروع کر دیا۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ جیس نے ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ڈاکٹر چند لمحے مہلڈا کے پیٹ کو جگہ جگہ سے دبا تار پل۔ وہ جانتا تھا کہ تکلیف ہوگی۔ تو وہاںے کاروئل بھی ہوگا۔ پھر ڈاکٹر نے سر ہلاتے ہوئے اعلان کیا۔ ”یہ ٹھیک ٹھاک ہے۔“ اور مہلڈا اینڈ کمپنی رنگ سے باہر نکل آئی۔ کسی نے بھی ان کی جانب توجہ نہیں دی۔ وہ سب ہارڈی کی فتح یابی کی خوشی میں سرشار تھے۔ تیکر بری طرح دور رہا تھا۔ جیس اور جعفر پیچھے تھے۔

اگلی صبح جیس ناشے کی میز پر نیو مارک ٹائمز کا تازہ ایڈیشن دیکھ رہا تھا۔ پہلے صفحے پر کنکر کی وہ تصویر تھی۔ جس میں وہ ہارڈی ڈوم کے قدموں میں رینگ رہا تھا۔ جیس اس تصویر کو دیکھ کر گوارا نہ ہوا۔ اور بوڑھا

تھا۔ نیو یارک ٹائمز کے علاوہ بیشتر اخبارات نے شکست کے دہانے سے فتح یابی کی صورت میں ابھرنے والی جیمس کی تعریف کے بل باندھے تھے۔ انہوں نے ہارڈی دوم کے حوصلے اور اطمینان کو سراہتے ہوئے اسے عظیم ترین فائز قرار دیا۔ صرف نیو یارک ٹائمز کے تجربہ کار باسکٹ بالر جو نے کنکرو کے اچانک ڈمیر ہو جانے کو تعجب انگیز قرار دیا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس سلسلے میں اس وقت تک کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جب تک آدمی کنکرو کے اندرونی سسٹم اور اس کی ذہنی کیفیات اور رویوں سے واقف نہ ہو۔ بہر حال غریب بچوں کے مفت خوراک فنڈ میں تیس لاکھ ڈالر کا اضافہ جیمس کی بہت بڑی فتح تھی۔

جیمس ذہنی طور پر مطمئن نہیں تھا۔ کہیں کچھ گڑبڑ تھی۔ جعفر بے ضرر لڑا تھا۔ بیکر مللڈ کے ساتھ خلص تھا۔ پھر اچانک اسے انکل نوٹو کا خیال آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس معاملے میں انکل نوٹو نے کوئی گڑبڑ کی ہو۔ اس نے مللڈ کی غذا میں کوئی ملاوٹ کر دی ہے۔ اور اب بیٹھا ہنس رہا ہو۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ مللڈ رنگ میں داخل ہوا تھا۔ تو بالکل چاک و چوبند تھا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا۔ وہ بالکل اچانک ہوا تھا۔ دروازہ کھلا اور چڑ اسی نے اسے بتایا کہ باہر کچھ لوگ اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ جیمس نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے اسے بھیجے کا اشارہ کیا۔ اور کرسی کے ساتھ کھڑا کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔

”دروازہ بند کر دو۔“ جیمس سمجھیر لہجے میں بولا۔ بیکر نے دروازہ بند کر دیا۔ اور خاموشی کے ساتھ جعفر کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے کا باجول کشیدہ تھا۔ خاموشی تکلیف دہ ہوتی جا رہی تھی۔ جیمس نے جھپٹی ہوئی نگاہوں سے بیکر کو دیکھا۔ پھر بولا۔

”چلو اب شروع ہو جاؤ۔ کیا ہوا تھا؟“ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جیسے فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ کہ جواب کون دے گا۔ پھر بیکر گھاٹکھارتے ہوئے بولا۔

”آپ نے اخبار میں درست لکھا مسٹر جیمس۔۔۔۔۔ ہارڈی بار بار اٹھتا رہا۔ دوسری طرف مللڈ بے پروا ہو گیا۔ شاید اس کی وجہ شور و غل ہو۔ بہر حال ہارڈی کو موقع مل گیا۔ اور اس نے دو بج ایسے مارے ایسے بچ جو کسی کو بھی ناک آؤٹ کر سکتے ہیں۔ وہ بچ فاول لائن سے نیچے مارے گئے تھے۔ لیکن ریفری تو بہ نہ دے سکا۔ اس کے باوجود مللڈ اٹھ جاتا۔ لیکن ریفری نے کتنی بہت تیزی سے مٹی۔“

”بکواس مت کرو۔“ جیمس غرایا۔ دونوں فردوں دکھائی دینے لگے۔ ”تم ایک اسپورٹس ایڈیٹر کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ اصل بات اگلے دو۔ ورنہ پولیس میں رپورٹ کرو اگر تم دونوں کو حوالا دے دوں گا۔“ جعفر ہمت کر کے بولا۔

”جواب بات یہ ہے کہ یہ سب ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا ہے۔ آپ یقین کریں گے۔ کہ مللڈ اکو زندگی میں پہلی دفعہ کسی نے بچ مارا ہے۔“ جیمس سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”کیا مذاق کر رہے ہو؟“ وہ غرایا۔ ”تمہارا مطلب ہے۔ پانچ سال میں مللڈ نے کبھی بچ نہیں کھایا۔ یہ ناممکن ہے۔ تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔“ جعفر نے بیکر کی جانب دیکھا۔ پھر بولا۔

”جھوٹ بولنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ملے والا۔۔۔۔۔ بات یہ ہے جواب۔۔۔۔۔ کہ اس فائنٹ سے پہلے جو کچھ ہوتا رہا۔ وہ سب محض ایک ایک تھا۔ جیسا سرکس میں ہوتا ہے۔ کنکرو کی فطرت ہے۔ آپ سے ایک بار مارو بیٹھے۔ پھر وہ کبھی دوبارہ سر نہیں اٹھائے گا۔ کبھی مقابلہ نہیں کرے گا۔ وہ فطری طور پر بہت حساس جانور ہے۔“ بیکر بات درسیان میں کاٹ کر بولا۔

”مجھے مللڈ اسے پہلے اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ میں نے ایک کنکرو کو تین سال تربیت دی۔ ایک بار میں نے اس کی زنجیر سرکس کے ایک آدمی کے ہاتھ میں تھادی اور کو کسی کام میں مصروف ہو گیا۔ کنکرو مجھ سے مانوس تھا۔ اس لئے میری غیر موجودگی کو محسوس کر کے

وہیں ہو گیا۔ اس نے میرے ساتھی کو گھونسا مارا۔ جبلی طور پر میرے ساتھی کا ہاتھ بھی چل گیا۔ اس کے بعد کنکرو دوبارہ کبھی نہیں لڑا۔ اس نے کبھی دستا نہیں پیئے۔ میرے تین سال برباد ہو گئے۔ کنکرو اندر سے بہت بڑک جانور ہوتا ہے جناب۔۔۔۔۔“

جیمس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ مللڈ کے دکھ اور انسوؤں کا معرہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ لیکن تم نے کہا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے تنبیہ کی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اور فطری طور پر باکسر ہوتے ہیں۔“ جیمس نے اعتراض کیا۔

”یہ درست ہے جناب۔۔۔۔۔ وہ یا تو کسی مادہ کنکرو کے لئے لڑتے ہیں۔ یا سرداری کے لئے۔۔۔۔۔“ بیکر نے بتایا۔ ”اور جیسے ہی ان میں سے کسی ایک کو کوئی ٹیک ہٹا کر بچ لگتا ہے۔ وہ ہارن مان لیتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ آئندہ کے لئے کسی دم جنس سے نہیں لڑتا۔ منع ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ کے لئے۔۔۔۔۔ یہ ہے کنکرو کی فطرت۔۔۔۔۔ اسے لڑانا ہے۔ تو اس کا یہ بھرم رکھنا ہوگا۔ کہ وہ ناقابل تغیر ہے۔ جہاں یہ بھرم ٹوٹا۔ وہیں وہ ہمیشہ کے لئے سرگول ہوا۔ عام انسانوں کی بھی یہی فطرت ہے مسٹر جیمس۔۔۔۔۔؟“

جیمس کو اپنے ہاتھ پاؤں پھولنے محسوس ہوئے۔ پھر وہ گڑبڑا کر بولا۔ ”لیکن مللڈ اجام کنکروؤں سے مختلف تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کی مہارت دیکھی ہے۔“

”یہ درست ہے جناب۔۔۔۔۔ وہ واحد کنکرو ہے۔ جو کھلاڑی تھا۔ اور اس کھیل سے محبت کرتا تھا۔ لیکن جناب فطرت سے مبرا تو وہ بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ مجھے اس کے مقابلے میں دفاع کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ پیدائشی باکسر تھا۔ لیکن بہر حال کنکرو تھا۔ اب اس کی مہارت صرف ماضی کی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ اور ایک بات بتاؤں۔۔۔۔۔ اگر کاموگا میں ہارڈی اس کے مقابلے میں اپنے اصل نام سے آتا۔ تو میں کبھی بھی وہ مقابلہ نہ ہونے دیتا۔ میں

اسے پانچ سو ڈالر دے دیتا۔ پروٹیکٹو کا معاملہ تو آپ جانتے ہی ہیں جب تک ناک آؤٹ نہ ہو۔ کوئی باکسر کسی بھی وقت ہٹ کر سکتا ہے۔ دنیا میں کوئی باکسر ایسا نہیں گزرا۔ جس نے کبھی بچ نہ کھایا ہو۔ یقین کیجئے کہ جب میں نے آپ کے کالم میں پڑھا کہ وہ عالمی ٹیٹل ویٹ چیمپئن تھا۔ تو میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ میرے لئے مللڈ ابی سب کچھ تھا۔ وہی میری روزی تھا۔ اور میرے بڑھاپے کی ضمانت بھی۔۔۔۔۔ اگر ہارڈے نے اس دن اسے بچ نہ کر دیا ہوتا۔ تو میں تباہ ہو جاتا۔“ جیمس کے جسم میں پسینہ پھوٹ پڑا۔ پھر وہ جھنجھلائے لہجے میں بولا۔

”لیکن تم نے بعد میں اسے پروٹیکٹل باکسروں سے بھی لڑوایا۔“ اس دفعہ بیکر خاموش رہا۔ وہ دونوں پتھر کے جسے کی طرح گم سم بیٹھے تھے۔ اور جیمس سے نظریں چرا رہے تھے۔ جیمس پھر کیا۔

”بتاؤ نا۔۔۔۔۔ تم لوگوں نے کیا کیا۔“ آخر کار بیکر ہمت کر کے بولا۔

”کوئی خاص بات نہیں ہے۔ مسٹر جیمس۔۔۔۔۔ ہم تو ایک ایک ترتیب دے رہے تھے۔ مللڈ کا ہر مقابلہ ایک ایک تھا۔ بھلا ایک کنکرو عالمی ویٹ چیمپئن کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس نے معذرت کے انداز میں کہا۔ ”کیونکہ یہ بات چیمپئن کے لئے توہین آمیز تھی۔ آپ کے کالم نے ہمیں کامیابی کی راہ دکھائی۔ ہمارا مقصد صرف انکل نوٹو سے بدلہ لینا تھا۔ کیونکہ وہ جعفر کی محبوبہ کا قاتل تھا۔ میرا تعلق باسکٹ کے شعبے سے گہرا رہ چکا تھا۔ مجھے اس کے اسرار و رموز پر گہری تحقیق تھی۔ اور میں اس بات سے بخوبی واقفیت رکھتا تھا کہ باسکٹ میں بیسہ اہمیت رکھتا ہے۔ اکثر باکسر پیسے کی بدولت خریدے اور بیچے جاتے ہیں۔ ہم نے جیسے کامائے کے فوراً بعد باکسروں کو خریدنا شروع کر دیا تاکہ مللڈ اکو کوئی بھی نقصان نہ پہنچانے پائے۔“

”یعنی مللڈ اکا ہر فائنٹ طے شدہ تھی۔ تم دونوں لفٹکے۔ چور ڈلیل۔۔۔۔۔؟“

”سٹرچس آپ ہمیں برا بھلا نہیں کہہ سکتے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہارڈی ایسی ہی فائنس کے ذریعے جتنی بننا ہے۔ اس کی چودہ میں سے نو فائنٹ کو پرومٹ ہی کرنا چاہئے تھا۔ لیکن تم خود کو عقلمند ثابت کرنا چاہتے تھے۔ تم ہارڈی اور انکل نوٹو کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ معاف کرنا۔۔۔ اس فراڈ کا آغاز بھی تمہارے کام سے ہی ہوا تھا۔“

”لیکن تم لوگوں نے باکسروں کو اس بات پر رضامند کیسے کیا کہ وہ ملڈ اکوہٹ نہیں کریں گے۔ وہ تمہیں ڈبل کراس بھی کر سکتے تھے۔“ انسان بہت ہی لالچی ہوتا ہے۔۔۔ سٹرچس۔۔۔ آپ دولت سے ہر چیز خرید سکتے ہیں ہم انہیں منہ مالگی رقم دیتے تھے کیونکہ ہمارے عزائم بلند تھے۔ کہیں کہیں ہمیں ایسے انسانوں سے بھی واسطہ پڑا جنہیں ہم خرید نہیں سکے۔ جو انسانی وقار کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ایسے سوچ پر ہم نے اپنے تربیت یافتہ باکسروں کو استعمال کیا۔ لیکن فرض ناموں سے۔۔۔ تو سٹرچس جسے صرف ایک ایکٹ تھا۔ ہم نے کوئی بددیانتی نہیں کی۔ آپ ٹھیکر ڈرامہ دیکھتے ہیں۔ ایک اداکار دوسرے اداکار کو شوٹ کر دیتا ہے۔ شوٹ ہونے والا ظاہر کرتا ہے۔ کہ وہ مر گیا ہے۔ لیکن وہ مرنا نہیں ہے۔ تو یہ بددیانتی تو نہیں ہوئی نا۔۔۔؟“ اس نے پرامید نگاہوں سے جیس کی جانب دیکھتے ہوئے بتایا۔

”عجیب منطق ہے۔“ جیس نے محسوس کیا کہ اس غیر منطقی منطق کے سامنے اس کا فلسفہ اخلاقیات دھبے کا دھرا رہ گیا ہے۔

”گو یا تم متعدد جعلی ناک آؤٹ کے ذریعے فائنل فائنٹ تک پہنچے۔“

”نہیں سٹرچس۔۔۔ وہ ناک آؤٹس جعلی نہیں تھے۔“ بیکر نے احتجاج کیا۔ ”ہم نے ہر باکسر کو صرف اس بات پر مجبور کیا تھا کہ وہ ملڈ اکوہٹ نہیں کرے گا۔ انہیں اپنا دفاع کرنے کا حق تھا۔ لیکن وہ ملڈ کی مہارت کے سامنے ٹک نہیں سکے۔ ملڈ انے ان میں سے ہر ایک کو زپ کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ جیس اس دفعہ مسکرا کر بولا۔

”میں سمجھ گیا۔ اب اہم ترین سوال۔۔۔ ہارڈی اپنے ٹائٹل کا دفاع کدہا تھا۔ اس نے فائنٹ کے لئے منت بھی کی تھی۔ یہ بھی طے تھا کہ وہ ملڈ اکوہٹ کرے گا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم نے اسے بھی خریدنے کی کوشش کی۔“

دونوں خاموش ہو گئے اور نظریں چراتے لگے۔ جیس کو احساس ہوا کہ ابھی حقیقت پوری طرح سامنے نہیں آئی۔ پھر بیکر ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔

”کی تھی۔۔۔ لیکن ہارڈی نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا تھا کہ ”ملڈ اکوہٹ تھو جی کا نقشہ بگاڑ دے گا۔ اور اسے اپنے شیخ سے واپس آسٹریلیا پہنچا دے گا لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔“

جعفر فخریہ لہجے میں بولا۔ ”لیکن فائنٹ سے پہلے تم دونوں کے چہرے پر کچھ اور قسم کا اطمینان بھی پایا جاتا تھا۔ اس کے متعلق بھی کچھ بتاؤ۔“ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ تکلیف دہ اور شرمناک خاموشی۔۔۔ جیس میز پر ٹھونسنار تے ہوئے بولا۔

”حقیقت اگل دو۔ ورلڈ۔۔۔؟“

”حقیقت یہ ہے کہ جب ہارڈی نے انکار کیا۔ جب ہم نے انکل نوٹو کے ہاتھوں ملڈ اکوہٹ دیا۔“

جیس حیرت زدہ لہجہ میں چلایا۔ ”کیا تم نے۔۔۔؟ بھلا تم نے ایسا کیوں کیا۔“

”ہم جانتے تھے کہ اس فائنٹ کے بعد ملڈ اکوہٹ لڑائی کے قابل نہیں رہے گا۔ اسے صرف چڑیا گھروالے قبول کریں گے۔“ دوسری جانب انکل نوٹو جیسے لوگوں کو اپنی اتار بے حد اہم ہوتی ہے۔ وہ ہارنا گوار نہیں کرتے۔ اور نیکارڈ کے مطابق ملڈ اکوہٹ جیسے والا گھوڑا تھا۔ اس لئے اس نے ہمیں ملڈ اکوہٹ خریدنے کی آفر کی۔“ جیس بات درمیان میں کاٹ کر بولا۔

”اور قیمت کیا طے پائی؟“

”میں لاگھڈ الر۔۔۔“ بیکر بولا۔ ”لیکن ملڈ ابھی تک ہمارے پاس ہے۔ ہماری پانچک کچھ اور ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ جیس نے تابانہ لہجہ میں

”جعفر اپنی محبوبہ کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ ہمارا منصوبہ اسی مناسبت سے ہے۔ انکل نوٹو ملڈ اکوہٹ حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہے۔ ہم اس سے بالمشافہ بات بات کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کہنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے ہمیں گل ریس کورس اسٹیڈیم میں بلایا ہے۔ وہ ملڈ اکوہٹ چاہتا ہے۔ ظاہر ہے اپنے ورکرڈ پر اعتماد نہیں کرے گا۔ اس لئے خود آنا ہوگا۔ آسانا مانا ہونے کے بعد ہم اگلے اقدام کا تعین کریں گے۔“ جیس نے اثبات میں سر ہلایا اور خفیف آواز میں انہیں اگلی پیش قدمی کے متعلق ہدایات دینے لگا۔

ریس کورس اسٹیڈیم شہر سے باہر ویرانے میں واقع تھا۔ یہاں گھوڑوں کا بہت بڑا اسٹیبل ہونے کے علاوہ گھوڑوں کی سالانہ ریس کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ آبادی کا دور دور تک نام و نشان موجود نہیں تھا۔ شاید اسی لئے انکل نوٹو نے جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ بیکر، جعفر اور ملڈ اکوہٹ کے ہمراہ تقریباً بارہ بجے اسٹیڈیم پہنچ گیا۔ ملڈ اکوہٹ کے سر پر بہت بڑا ہیٹ موجود تھا۔ اس ہیٹ کو پلاسٹک کی ڈوری کے ذریعے گردن کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ ملڈ اکوہٹ پہنے بہت مشکل خیز دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اس سیاہ ہیٹ کے نیچے سیاہ رنگ کا رپو اور اس کا جیپ کے ذریعے چسپاں کیا گیا تھا۔ یہ رپو اور مکمل طور پر لوڈ تھا۔ علاوہ ان کے گولیوں کی مناسب مقدار تھیلے میں باندھ کر چسپاں کی گئی تھی۔ اسٹیم کے باہر انکل نوٹو کے گاڑ کا دستہ موجود تھا۔ انہوں نے جعفر اور بیکر کی تلاشی لی اور دونوں کو اسٹیڈیم میں جانے کی اجازت دے دی۔ اسٹیڈیم کے ہال کمرے کے درمیان میں انکل نوٹو اپنے تین عدد مسج آدمیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ اس نے اپنا چہرہ نقاب کے ذریعے چھپایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کا بریف کیس بھی موجود تھا۔ جس میں یقیناً رقم موجود تھی۔ جعفر اور بیکر کو دیکھتے ہی اس نے کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”خوش آمدید میرے دوستو۔۔۔ تم میں تینوں کی

دل سے قدر کرتا ہوں۔ تم نے وہ کام کر دکھایا۔ جو کوئی عام انسان نہیں کر سکتا۔ اور ملڈ اکوہٹ میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ یہ وہ جانور ہے جو عالیشان محل میں رکھنے کے قابل ہے۔ اگر یہ کچھ دیر اور اپنے آپ کو ہارڈی سے دور رکھ لیتا۔ تب یقیناً جیت اسی کی ہوتی۔ اس بریف کیس کے اندر تین لاکھ ڈالر موجود ہیں۔ جانور میرے ماتحت کے حوالے کر دو۔“ انکل نوٹو نے بریف کیس بیکر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

بیکر نے جعفر کو اشارہ کیا۔ اور خود آگے بڑھ کر بریف کیس کو تھام لیا۔ پھر مٹن دبا کر ڈھکنے کھولنے لگا۔ جوش کی بدولت اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ انکل نوٹو اور اس کے تینوں ماتحت دھچکی کے ساتھ اس کی حرکات کا معائنہ کر رہے تھے۔ اس مختصر وقت کے دوران جعفر ملڈ اکوہٹ کے سر سے ٹوپی اتار چکا تھا۔ اس نے پھرتی کے ساتھ گولیوں سے بھری ہوئی تھیلی اپنی جیب میں ڈالا اور رپو اور کو ہاتھ میں تھام لیا۔ اب جو اس نے بیکر کی جانب دیکھا۔

تب وہاں عجیب و غریب تماشا پایا جاتا تھا۔ کانپتے ہاتھوں کے ساتھ نوٹ چیک کرتے ہوئے بیکر نے تمام نوٹ اچانک ہی ہوا میں اچھال دیئے تھے۔ اب ہال کا تمام فرش نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور وہ نوٹوں کو سمیٹنے کے لئے ہانگوں کی طرح پاؤں چلا رہا تھا۔ انکل نوٹو اور اس کے ساتھی غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان تینوں کی توجہ کامرکز بیکر تھا۔ وہ جعفر کو بیکر فراموش کر چکے تھے۔

جعفر نے رپو اور کو سیدھا کیا اور انکل نوٹو کے سر کاٹنے لے کر فادر داغ دیا۔ اس کے تینوں ساتھیوں نے رپو اور سیدھے کرنے کی کوشش کی۔ بیکر نے ہاتھ میں موجود بریف کیس ان کی جانب اچھال دیا۔ بریف کیس پہلے آدی کے سینے پر لگا۔ اور اس کے ہاتھوں سے رپو اور دور دور جا گر۔ جعفر نے رپو اور کے تین کو تیزی کے ساتھ دبا نا شروع کر دیا۔ ہال زور دار نازنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔ تینوں آدمیوں کو رپو اور استعمال

انگل نو نو کی لاش کو چیک کرتے ہیں۔ اس نے آئے
بڑھ کر سٹھ شدہ چہرے پر سے نقاب اتار دیا۔

اس کے ساتھ ہی اس کے حلقے سے چیخ نکلتی
پچی: وہاں کرٹل..... کی لاش موجود تھی۔ اسپورٹس
کے وزیر کرٹل چیوش کی لاش..... سب کچھ غیر متعین تھا۔
لیکن انکار کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اس لئے لاش کو اٹھایا
گیا۔ اور ہال کو بند کر دیا گیا۔ آدھا دن کا غنڈی کا دروازی
کے دوران کڑا گیا۔

شام کو چیس کو فون موصول ہوا۔ چیس نے
ریسورٹ اٹھانے کے بعد پہلو کہا۔ تب دوسری جانب کسی کی
پھنسی پھنسی کی آواز سنائی دی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ
بولنے والا اپنی آواز بند کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”تم شاید اپنی کامیابی پر خوش ہو رہے ہو۔
لیکن تمہاری بھول ہے..... انڈر ورلڈ کے سربراہ کو ختم
کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ جسے مار کر خوش ہو رہے
ہو۔ وہ ایک ڈی تھا۔ اور ایسے بہت سے افراد یہاں
موجود ہیں جنہیں ہم وقتاً فوقتاً ڈی کے طور پر استعمال
کرتے رہتے ہیں۔ فون کو ٹریس کرنے کی کوشش نہیں
کرنا۔ یہ ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ کا نمبر ہے۔ کرٹل چیوش
سے ہم بھی نالاں تھے۔ وہ ایک عیاش فطرت انسان
تھا۔ جس نے نہ جانے کتنی عورتوں کی عزتیں لوٹ کر ان
کے پیچھے موجود لوگوں کو ہمارے پیچھے لگا دیا تھا۔ اس لئے
ہم نے پیچھا چھڑانے کے لئے اسے تمہارے سامنے
پیش کر دیا۔ تمہارے دونوں ساتھیوں کا قصہ یقیناً یہی
تھا۔ شاید تمہارا بھی..... بہر کیف ہمارا مقصد کسی کے
ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا نہیں ہے۔ اس لئے مطمئن رہو
آئندہ کم از کم ہمارے درمیان عورتوں کے مسئلے پر ہنگامہ
آرائی نہیں ہوگی۔“ فون اچانک ہی بند ہو گیا۔

چیس حیرت بھری نگاہوں سے ریسورٹ کی
جانب دیکھتا رہا۔ پھر اس نے طویل سانس لیتے ہوئے
ریسورٹ کو کریڈل پر رکھ دیا۔

کرنے کا موقع نہیں مل سکا اور تینوں تڑپتی پھیلیوں کی
مانند زمین پر گر کر سہکتا ہو گئے۔ بیکر نے اتارے پر آئے
ہوئے پسینے کو دونوں ہاتھوں سے پونچھا اور زمین پر
بکھرے ہوئے نوٹوں کو بریف کیس میں ڈالنے لگا۔

لیکن اچانک ہی اسٹینڈیم کے دروازے کی
جانب سے فائرنگ کی آواز سنائی دینے لگی۔ بیکر نے
جعفر سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہ ہال کمرے کے
دروازے کو اندر سے مضبوطی کے ساتھ بند کر دے۔
چیس پولیس والوں کے ہمراہ اسٹینڈیم میں پہنچ گیا ہے۔
اب شاید پولیس والوں اور انگل نو نو کے آدمیوں کے
درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔

انگل نو نو کے آدمی گھبراہٹ کے عالم میں ہال
کمرے کا رخ بھی کر سکتے تھے۔ کچھ نوٹ اکٹھے کرنے
کے بعد بیکر کو اندازہ ہو گیا کہ نوٹ جعلی ہیں۔ اس نے
جھنجھلا کر بریف کیس کو انگل نو نو کی لاش کے پاس پھینک
دیا۔ پھر جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”مرتے ہوئے بھی دھوکا دے گیا۔ خیر اس کی
موت کسی بہت بڑی کامیابی سے کم نہیں ہے۔“

پھر باہر فائرنگ بند ہو گئی اور کچھ دیر بعد ہال
کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا گیا اور چیس نے چیختے
ہوئے ان دونوں کی خیریت دریافت کی۔ بیکر نے
مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ چیس پولیس والوں
کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔ پھر بولا۔

”باہر حالات ہمارے قابو میں ہیں۔ اندر کے
مقتلقات بتاؤ۔“ بیکر مسکراتے ہوئے اسے حالات بتانے
لگا۔ پولیس والوں نے فرش پر پڑے ہوئے نوٹوں کو
چیک کیا۔ وہ واقعی نقلی تھے۔ چیس کے چہرے پر ابھرنے
کے تاثرات ثبت تھے۔ مسئلہ ایک جانب کھڑا حیرت
بھری نگاہوں سے تمام افراد کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔

چیس پریشان لہجے میں بولا۔ ”سب کچھ بہت
آسانی کے ساتھ ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ انڈر ورلڈ
مافیا کا بے تاج بادشاہ کتے کی موت مارا گیا۔ کیا ایسا ممکن
ہو سکتا ہے۔ بات حلق سے نیچے نہیں اترتی۔ بہر حال

